آگہی کا سفر

(تنقیدی مضامین)

پروفیسر افتخار اجمل شاہین

آگہی کا سفر

(تنقیدی مضامین)

↕

پروفیسر افتخار اجمل شاہین

انتساب:

محقق اعظم قاضی عبدالودود

اور

استادِ محترم ڈاکٹر عندلیبؔ شادانی کے نام

ترتیب

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

☆

پیش نامہ

اب تک میرے تین شعری مجموعے ''عقیدت کا سفر'' (۲۰۰۴ء)۔ ''شاعری کا سفر'' (۲۰۰۵ء) اور ''رنگ وبُو کا سفر'' (۲۰۰۶ء) شائع ہو چکے ہیں' میں نے بہت سے تنقیدی مضامین' جائزے اور تبصرے لکھے ہیں جو وقتاً فوقتاً پاک وہند کے مقتدر رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کی تعداد سو (۱۰۰) سے بھی تجاوز کر چکی ہے' میرے احباب نے بار بار اس طرف توجہ دلائی کہ میں اپنے مضامین کے مجموعہ کی طرف بھی توجہ دوں اور ان کو کتابی شکل میں شائع کروں کیوں کہ ان کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے مضامین بڑی تعداد میں لکھے ہیں اور وہ سب کے سب ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لئے میں نے ارادہ کر لیا کہ اب نثری مجموعے بھی شائع کئے جائیں۔ اس کام کا آغاز کر دیا ہے اور مضامین کا پہلا مجموعہ ''آ گہی کا سفر'' کے نام سے منظر عام پر لا رہا ہوں۔ اس کتاب میں بیشتر مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں بعض مضامین ادب اور زبان کے مسائل پر بھی ہیں۔ مثلاً ''اردو ذریعۂ تعلیم'' (مطبوعہ 'صریر' کراچی)۔ ''ادب کی اہمیت و افادیت'' (مطبوعہ صریر کراچی) ''ادب کا بنیادی مسئلہ'' (مطبوعہ قومی زبان کراچی) وغیرہ۔ مگر بیشتر مضامین ادب سے متعلق ہیں اور یہ مضامین بھی تنقید کے زمرے میں آتے ہیں۔ کچھ مضامین تنقیدی جائزے اور تنقیدی تبصرے کے ضمن میں بھی آئیں گے۔ میں ان مضامین کو کوئی تنقیدی کارنامہ نہیں کہتا یعنی کچھ مضامین میں اگر کسی شاعر یا ادیب کے فن کا جائزہ لیا ہے تو اس میں اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیا ہے اور مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف بھی کیا ہے' مثلاً ''ڈاکٹر شکیل الرحمٰن میر شناسی کے آئینے میں''۔ ''بابائے اردو مولوی عبدالحق تحقیق کے آئینے میں''۔ ''بابائے اردو کی خاکہ نگاری'' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور کہیں کہیں مصنف سے اختلاف بھی کیا ہے۔ میری نظر میں بھی اختلاف رائے کی بڑی اہمیت ہے۔ ہاں یہ اختلاف ادبی اختلاف ہو شخصی یا ذاتی اختلاف نہ ہو۔ میں

دوسروں کو بھی اختلاف رائے کا حق دیتا ہوں وہ میری رائے سے بھی اختلاف کر سکتے ہیں کیوں کہ کسی کی بھی تحریر یا رائے حتمی نہیں ہوتی ہے۔

اس کتاب میں میرے ۲۹ مضامین شامل ہیں اور سارے مضامین مطبوعہ ہیں۔ بعض مضامین تو کئی کئی رسالوں اور اخباروں میں چھپے ہیں۔ چند مضامین کا ذکر مذکورہ بالا سطور میں کر چکا ہوں۔ بقیہ کی تفصیل کچھ یوں ہے:۔

''آمد نامہ سے قادر نامہ تک'' (ماہنامہ صریر کراچی)۔ ''علامہ اقبال حمدیہ اور دعائیہ اشعار کے آئینے میں'' (ماہنامہ 'جہانِ حمد' کراچی)۔ ''علامہ اقبال بچوں کے شاعر کی حیثیت سے'' (روزنامہ جنگ کراچی)۔ ''پہلا عظیم عوامی شاعر'' (ماہنامہ اظہار کراچی)۔ ''محقق اعظم قاضی عبدالودود'' (روزنامہ جنگ کراچی اور مجلّہ کاوش' کراچی) ''کلیم الدین احمد پر ایک نظر'' (روزنامہ جنگ کراچی/ زبان و ادب/ ماہنامہ آ ہنگ [گیا])۔ ''حضرت عمر فاروقؓ کا شعری نظریہ'' (ماہنامہ دائرے اور 'جہانِ حمد')۔ ''اردو قصیدے کا ارتقاء'' (ماہنامہ نگار پاکستان۔ کراچی)۔ بعد میں ڈاکٹر ام ہانی اشرف نے اپنی کتاب ''اردو قصیدہ نگاری'' میں شامل کیا) ''اردو غزل پر ایک نظر'' (ماہنامہ قومی زبان کراچی)۔ 'شاد عظیم آبادی شعر کے آئینے میں'۔ (ماہنامہ 'جام نو')۔ ''علامہ جمیل مظہری شخصیت اور فن کے آئینے میں'' (ماہنامہ قومی زبان کراچی۔ ماہنامہ' کائنات' ہدایت گڑھ یوپی)۔ ''ڈاکٹر عندلیب شادانی'' (ماہنامہ' جام نو' کراچی/ زبان و ادب۔ پٹنہ)۔ ''بابائے اردو مولوی عبدالحق تحقیق کے آئینے میں'' + ''بابائے اردو کی خاکہ نگاری'' (ماہنامہ قومی زبان کراچی)۔ ''سراج الدین ظفر'' (روزنامہ جنگ کراچی اور ماہنامہ طلوع افکار کراچی)۔ ''عطا کاکوی بحیثیت محقق'' (مہر نیم روز اور پندار پٹنہ)۔ ''عطا کاکوی شعر کے آئینے میں'' (پندار۔ پٹنہ ماہنامہ نیم روز کراچی)۔ ''افسر ماہ پوری تازگی فکر کے شاعر'' (سہ ماہی 'فنون' لاہور)۔ ''ڈاکٹر حنیف فوق دیدہ وشنیدہ'' (سہ ماہی مژگاں۔ کولکتہ)۔ ''مشفق خواجہ ابیات کے آئینے میں'' (ماہنامہ قومی زبان کراچی)۔ ''مناظر عاشق اور بچوں کا ادب'' (ماہنامہ کندن کراچی)۔ ''کلیم الدین احمد پر ایک نظر'' (سہ ماہی فنون لاہور)'۔ ''ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی میر شناسی'' (محمد صدیق نقوی کی مرتب کردہ کتاب میں بھی شائع ہوا)۔ ''پروفیسر طرزی کا طرزِ خاص''۔ 'اصغر ویلوری ایک ممتاز رباعی نگار'' اور ابراہیم اشکؔ کے گیت' میں مختلف التنوع موضوعات'' یہ تینوں مضامین بھی کتابی صورت میں شائع ہونے

والی کتابوں میں شامل ہیں جن کے مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ہیں۔

ان شائع شدہ بعض مضامین پر میں نے نظرِ ثانی کی ہے۔ان میں ترمیم واضافہ بھی کیا۔مثلاً ’اردو غزل پر ایک نظر‘ اور ’اردو قصیدے کا ارتقاء‘ ایسے مضامین ہیں جن پر نظر ثانی کی اور ترمیم واضافہ کیا۔’اردو غزل پر ایک نظر‘ جو قومی زبان‘ میں شائع ہوا وہ چار (۴) صفحات پر مشتمل تھا مگر اس میں کافی اضافہ کیا۔اس طرح اس مضمون کی حیثیت ایک طویل مضمون کی ہوگئی بلکہ یہ مضمون ایک نئے مضمون کی صورت اختیار کر گیا۔

میرے اب بھی کافی مضامین‘ جائزے اور تبصرے (مطبوعہ) شکل میں موجود ہیں جن کو میں اپنی دیگر شائع ہونے والی کتابوں میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آئندہ ایسی چند کتابوں کے شائع کرنے کا اعلان بھی اپنے شائع ہونے والے شعری مجموعوں میں کر چکا ہوں۔مثلاً دبستانِ خاور (دو حصوں میں)‘ اردو افسانہ اور چند افسانہ نگار‘ تجزیئے اور تبصرے وغیرہ۔

میں ایسے مضامین کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں‘ بہت سے مضامین ضائع بھی ہوگئے ہیں مگر امید ہے کہ بیشتر مضامین دوستوں اور کتب خانوں کی مدد سے حاصل ہو جائیں گے۔اس کتاب کا سرورق پروین شیر نے بنایا ہے جو نہ صرف معروف شاعرہ ہیں بلکہ ایک اچھی اور بلند پایہ مصورہ بھی ہیں اور آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں۔انہوں نے کئی سرورق بنا کر بھیجے ہیں جن میں سے ایک کا انتخاب کیا۔ان کی اس کرم فرمائی پر میرے لئے اظہارِ ممنونیت واجب ہے۔

آخر میں قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی گراں قدر آراء اور مشوروں سے نوازیں۔

افتخار اجمل شاہین

صدر شعبۂ اردو۔سینٹ پیٹرکس کالج۔کراچی

☆

پتا:۔

G-09 صائمہ کلاسک۔گلشن اقبال کراچی

فون نمبر:۔4801615

ادب کی اہمیت اور افادیت

ادب سے متعلق اکثر یہ سوالات اٹھائے جاتے ہیں کہ ''ادب کیا ہے؟' ادب کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟ ادب کا کوئی افادی پہلو بھی ہے یا نہیں؟ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی؟ درسگاہوں اور جامعات میں ادب کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ اس سائنسی دور میں ادب کی کیا ضرورت ہے؟ میرا تعلق چونکہ تدریس کے پیشے سے ہے اور میں انٹر اور بی ایس سی کے طلبا و طالبات کو اردو ادب ایک عرصے سے پڑھا رہا ہوں اس لئے کبھی کبھی طلبا بھی اس قسم کا سوال کر بیٹھتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں بجائے ناقدین ادب کا حوالہ دینے کے ان کو سائنسدانوں' فلسفیوں' ڈاکٹروں اور انجینئروں کے حوالے دیتا ہوں۔ اور اکثر شاعر' ڈاکٹر اور سائنسدانوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں جو طب کے پیشے سے منسلک ہونے کے باوجود نہ صرف اچھا شعری ذوق رکھتے ہیں بلکہ اچھے شاعر بھی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ہمدم عظیم آبادی' ڈاکٹر ظفر حمیدی' ڈاکٹر طاہر سعید ہارون' ڈاکٹر ارمان نجمی' ڈاکٹر حنیف ترین' ڈاکٹر سعید اقبال سعدی وغیرہ۔ اور سائنسدانوں میں ڈارون' ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا بطور خاص ذکر کرتا ہوں۔

اس سلسلے میں مشہور سائنسدان ڈارون کی مثال اور ان کا ادب کے بارے میں جو خیال یا نظریہ ہے وہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈارون اپنی ابتدائی عمر میں شعر و شاعری میں بڑی دلچسپی لیتا تھا مگر بعد میں وہ سائنسی تحقیق اور تجربے میں ایسا الجھا اور اتنا مصروف ہو گیا کہ وہ شعر و ادب کی طرف توجہ نہ دے سکا اور اسے جب اپنے تحقیقی کاموں سے فرصت ملی تو اس نے جس حقیقت

کا اعتراف کیا وہ ہم سب کے لئے تازیانہ عبرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب اپنی سوانح عمری لکھی تو اس کو اپنے جذبات کے مردہ ہو جانے کا احساس شدت سے ہوا۔ جس کا اظہار اس نے نہایت متاسفانہ انداز میں کیا ہے اس بات کا پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی گراں قدر تصنیف "ہماری شاعری" میں بطور خاص کیا ہے۔ انہوں نے ڈارون کے خیالات کو اپنی کتاب میں اس طرح پیش کیا ہے:۔

"۳۰ برس کی عمر تک بلکہ اس کے بعد تک شاعری کی اکثر صنفوں میں مجھے بہت لذت ملتی تھی، جب میں مدرسے میں پڑھتا تھا اس وقت بھی شکسپیر کے کلام خاص کر اس کے تاریخی ڈراموں میں بہت لطف آتا تھا...... لیکن اب کئی سال سے ایک مصرع پڑھنا بھی میری قوت برداشت سے باہر ہے۔ ابھی حال ہی میں میں نے شکسپیر کا کلام پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے ایسا، وکھا پھیکا اور بدمزہ معلوم ہوا کہ میرا جی متلانے لگا۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق بھی گویا بالکل نہیں رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دماغ ایک مشین ہو کر رہ گیا ہے جس کا کام یہ ہے کہ حادثات اور واقعات کو جمع کر کے ان سے عام اصول اخذ کیا کرے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے دماغ کا وہ حصہ ہی کیوں بیکار ہو گیا ہے جس پر لطیف احساس کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر مجھے زندگی پھر سے مل جاتی تو کم سے کم ہفتے میں ایک دفعہ کچھ شعر پڑھ لینا کچھ موسیقی سن لینا اپنا معمول کر لیتا۔ اس تدبیر سے شاید میرے دماغ کے وہ حصے جو اب بیکار ہو گئے ہیں، استعمال میں رہنے کی وجہ سے مردہ نہیں ہوتے۔ ان دلچسپیوں کا مٹ جانا مسرت کا معدوم ہو جانا ہے۔

(ہماری شاعری۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی)

اور اس کے بعد ڈارون جو نتیجہ نکالتا ہے اور اپنے جس خیال کا اظہار کرتا ہے وہ اپنی جگہ

بہت اہم اور قابل غور ہے۔

"اور چونکہ اس سے ہمارے نفس کا وہ حصہ کمزور ہوجاتا ہے جس کا تعلق جذبات سے ہے لہذا یہ شاید ہمارے ذہن کے لئے اور غالباً ہمارے اخلاق کے لئے مضر ہے"

(ہماری شاعری۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی)

ڈارون کی اس تھیوری میں جو اس کی سوانح عمری سے ماخوذ ہے ہمیں تین باتیں خاص طور پر اہم اور نمایاں نظر آتی ہیں:۔

☆......ڈارون کو ابتدا میں شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔

☆......جب اس نے اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے شاعری کا مطالعہ نہیں کیا تو اس کا دماغ مشین ہو کر رہ گیا۔

☆......شعر کا مطالعہ اور موسیقی سے دلچسپی نہ رہنے کی وجہ سے اس کے دماغ کا وہ حصہ بیکار ہو گیا جس کا تعلق ذوقِ جمالیات Aesihetic Sense سے ہے اور جس کا کمزور ہونا بقول ڈارون اخلاق کا مخرب بھی بنتا ہے اور یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے ذوقِ جمالیات کے ختم ہوجانے پر صرف تاسف کا اظہار نہیں کرتا ہے بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس سے صرف انسان کے ذہن کو ہی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ ڈارون اس نقصان کو اخلاق کے لئے بھی مضر قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ ذوق شعری کا سلسلہ اخلاقیات سے بھی جوڑ دیتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر انسان کا ذوق جمال ختم ہوجائے تو وہ اخلاق سے بھی بڑی حد تک عاری ہوجاتا ہے اس طرح ادب کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ ذہنی تسکین ہوتی ہے بلکہ انسان کے اخلاقیات پر بھی ادب گہرا اثر ڈالتا ہے اس کے دو اسباب صاف طور پر نظر آتے ہیں ایک تو یہ کہ ادب میں اخلاقی عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے (نصاب سازی کے اصولوں میں بھی اخلاقی عنصر یعنی Ethical Value کو خاص اہمیت دی جاتی ہے) ادب میں خیر و شر کے عنصر کو نہایت موثر اور دلنشیں انداز

میں پیش کیا جاتا ہے نیز یہ کہ شعر و نغمہ انسان کے ذوق سلیم پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ شعر و موسیقی روح کی غذا ہے۔ ادب انسان کے ذہن اور اس کے دل پر ایسے اثرات مرتب کرتا ہے جس سے اس کے اندر نرمی، خلوص اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس طرح اچھا ادب انسان کے ذوق جمال کی نہ صرف تسکین کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ اس کے ذوق سلیم کی پرورش بھی کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ ڈارون کی مذکورہ بالا تحریر پڑھنے کے بعد امریکہ کا مشہور ماہر نفسیات پروفیسر جیمس لکھتا ہے کہ:۔

> ''ڈارون کے اس بیان سے لوگوں کو سبق لینا چاہیے اور ہر شخص کو کم سے کم دس منٹ روز شعر و شاعری کے لئے وقف کر دینا چاہئے تا کہ جذبات مردہ نہ ہونے پائیں''

یہ قول کسی شاعر کا نہیں بلکہ ایک ممتاز ماہر نفسیات اور فلسفی کا ہے جو اس نے ایک عظیم سائنس دان کے تجربات اور بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش کیا ہے۔ اس طرح سائنس دان، فلسفی اور ماہر نفسیات بھی شعر کی اہمیت اور اس کی افادیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ شاعری کی اہمیت اور اس کی افادیت کے قائل ہر دور میں مل جاتے ہیں اور ہر زمانے میں اس کی اہمیت اور افادیت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ لوک گیتوں سے لے کر دیگر اصناف سخن تک میں اعلیٰ اخلاق کے نمونے ملتے ہیں۔ لوک کہانی ہو یا داستان، افسانہ ہو یا ناول ان تمام اصناف ادب میں زندگی کی تفسیر اور تعبیر ملتی ہے۔ جن کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ ذہنی اور روحانی آسودگی ملتی ہے بلکہ اچھا ادب ہمارے ذہن، ہمارے دل اور دماغ کی جلا کر کے ہمیں ایک اچھا انسان بناتا ہے۔

حضرت عمرؓ نہ یہ کہ خود شعری ادب کا ذوق رکھتے تھے بلکہ شعر خوانی کی تلقین اور مطالعہ کا حکم صادر فرماتے ہیں، وہ کہتے ہیں'' لوگوں کو اشعار کو یاد کرنے کا حکم دو کیوں کہ وہ اخلاق کی بلند باتوں اور صحیح رائے اور انصاف کی طرف راستہ دکھاتے ہیں'' (احکام بنام گورنر) اس قول یا فرمان سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ ادب کی افادیت کے قائل تھے اور شعری ادب کو

اخلاق سنوارنے کا ایک بہترین اور موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا مطلب یہ ہے: "یہ جو کچھ تمھیں نظر آ رہا ہے اس میں کچھ بھی باقی نہیں رہے گا مال ہو یا اولاد سب فنا ہو جائیں گے' البتہ اللہ کی ذات کو بقائے دوام حاصل ہے"

ایک بار بشیر بن ربیعہ نے کچھ اشعار کہہ کر حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں ارسال کئے' ان اشعار میں اس نے جنگ قادسیہ میں اپنی شجاعت کے متعلق لکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ اشعار پڑھ کر حضرت سعد کو خط لکھا:۔

"بشیر بن ربیعہ کو بھی سورماؤں کی فہرست میں شامل کر لو' حضرت عمرؓ کبھی کبھی ترنم سے خود بھی شعر پڑھتے تھے مگر ترنم کی زیادتی یا عام روش کو پسند نہیں کرتے تھے" (۱)

رزم ہو یا بزم شعر و نغمہ کی جادوگری ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہے۔ پہلے بھی جنگوں میں سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لئے "رجز" پڑھے یا گائے جاتے تھے اور آج بھی اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ قومی گیت اور ملی نغموں کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔ قومی اور ملی جذبات کو زندہ کرنے یا ابھارنے میں سب سے اہم کردار شاعروں یا ان کی شاعری کا رہا ہے۔ شاعری سے مختلف وقتوں میں مختلف کام لئے جاتے رہے ہیں اس سے متعلق ایک واقعہ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنی گراں قدر تصنیف "چہار مقالہ" میں لکھا ہے اور اس سلسلے میں معروف شاعر رودکی کا حوالہ دیا ہے۔

نظامی عروضی "در ماہیت علم و شعر و صلاحیت شاعر" مقالہ دوم میں لکھتے ہیں

"ایک بار (بادشاہ) نصر بن احمد (آل سامان) سیر و شکار کی خاطر بخارا سے نکلا۔ اور سیر و تفریح اور خوبصورت وادیوں کے حسن کا ایسا اثر اس پر ہوا کہ اس نے چار سال گزار دیئے۔ بادشاہ کے تمام ساتھی اس طویل اقامت سے تنگ آ گئے۔ وہ لوگ رودکی کے پاس گئے اور کہا کہ بادشاہ کو کسی طرح واپسی پر آمادہ کرے۔ (۲)

(۱) "حضرت عمرؓ نے فرمایا" مطبوعہ فیروز سنز لاہور

(۲) ("ادب نامہ ایران" از مرزا مقبول بیگ بدخشانی سابق صدر شعبہ فارسی گورنمنٹ کالج لاہور۔ صفحہ ۹۲)

(پس سران لشکر دتہران ملك نزديك استاد ابوعبدالله الـرودكی رفتند ...... گفتند پنج ہزار دينار ترا خدمت كنيم اگر صنعتے بكنی كه بادشاه ازيں خاک حركت كند"

رودکی نے ان کی گزارش قبول کرلی۔

(قصيده بگفت و بوقتے كه امير صبوح كرده بود' درآمد وبجائے خويش بنسشت و چوں مطربان فرد وداشتند چنگ بر گرفت ...... ايں قصيده را آغاز كرد)

بادشاہ (نصر بن احمد) ابھی صبوحی سے فارغ ہی ہوا تھا کہ رودکی نے چنگ بجا کر 'عشاق راگ' الاپنا شروع کردیا۔

بوئے جوی مولیاں آید ھمی — یاد یار مہرباں آید ھمی
ریگ آموی و درشتی ہائی او — زیر پایم پرنیاں آید ھمی
آب جیحوں از نشاط روی دوست — جنگ ماراتا میاں آید ھمی
میر ماہ است و بخار آسماں — ماہ سوائے آسماں آید ھمی
ای بخارا شاد باش وشادزری — شاہ سویت مہماں آید ھمی

ان اشعار کا امیر پر ایسا اثر ہوا کہ وہ تخت سے اترا اور بخارا کی طرف روانہ ہوگیا۔

ہماری تاریخ اس طرح کے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے۔ شاعری شعرا کے معاشی مسئلوں کے حل میں بھی ان کی مدد ومعاون ثابت ہوئی۔ پہلے شعرا شاعری کے ذریعے امراء کا قرب حاصل کرتے تھے۔ قصیدے لکھ کر بادشاہوں اور امراء سے انعام واکرام حاصل کرتے تھے۔ فلموں میں نغمے لکھ کر بھی آسودہ حال ہوئے اور آج کل تو مشاعروں میں شرکت کرکے بہت سے شعراء معقول رقم حاصل کرتے ہیں بلکہ مشاعرے کے وسیلے سے یورپ اور امریکہ کی سیر بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح کہانی لکھنے والے فلموں کی کہانیاں لکھ کر معقول معاوضہ حاصل

کررہے ہیں۔اب تو مقررین اور سیاست دان بھی اشعار پڑھ کر اپنی تقریروں میں وزن پیدا کرتے ہیں۔

اصنافِ ادب میں شاعری کو یہ خصوصیت اور برتری حاصل ہے کہ اسے موقع بہ موقع حوالے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے شعری حوالہ انسان کی گفتگو کو موثر اور دلنشیں بناتا ہے اور اس میں حسن پیدا کرتا ہے۔اس وجہ سے اچھے اشعار ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں کبھی کبھی تو ایک مصرع وہ کام کر جاتا ہے جو ایک طویل گفتگو سے ممکن نہیں۔علم وحکمت اور دانائی کی باتیں جس طرح شعر کے وسیلے سے پیش کئے جاتے ہیں یا پیش کئے جاسکتے ہیں اتنا کسی اور وسیلے سے ممکن نہیں۔شعر کے ذریعے جو بات کہی جاتی ہے اس کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔اسی طرح کہانیوں' حکایتوں' داستانوں' ناولوں اور افسانوں کے ذریعے بھی ہمارے ادباء اپنی بات' اپنا نقطۂ نظر اپنا پیغام یا زندگی کی حقیقتوں کو موثر انداز میں پیش کردیتے ہیں اور اس طرح جب زندگی کے حقائق کو بیان کیا جاتا ہے تو پڑھنے والوں یا سننے والوں پر اس کا زیادہ اچھا اور خوشگوار اثر ہوتا ہے کیوں کہ:۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں ☆ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ادب بھی دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح زندگی کا ایک شعبہ ہے کیوں کہ یہ بھی انہیں کی طرح زندگی ہی کا خود ساختہ پرداختہ ہے۔ادب کا دائرہ اب محدود نہیں رہا ہے' یہ دنیا کے تمام علوم سے ہمارا رشتہ جوڑتا ہے۔اب ادب میں صرف مقامی مسائل ہی نہیں پیش کئے جاتے بلکہ تمام دنیا کے مسائل کا ذکر ہوتا ہے۔آج کا ادب قاری کا زمان اور مکان یعنی دونوں حدود سے رشتہ قائم کرتا ہے اور حال کے واسطے سے مستقبل سے رشتہ جوڑتا ہے۔تاریخ اور ادب کے حوالے سے ایک مفکر کا یہ قول اپنی جگہ درست ہے۔

''ادب اور تاریخ جڑواں بہنیں ہیں جنہیں الگ نہیں کیا جاسکتا''

(Topics and Opinions-Ed A-F Scolt Macilan & Co london p-14)

بہت سے تاریخی واقعات' تاریخی باتیں اور حقائق کا علم ہمیں ادب کے وسیلے سے ہو جاتا ہے۔

ادب ہمیں اخوت اور انسانیت کا سبق سکھاتا ہے۔ ادب ہمیں سب سے اور ساری دنیا سے پیار کرنے کا درس دیتا ہے ہمارے ذہن کو روشن کرتا ہے اور ہمارے دلوں میں کشادگی پیدا کرتا ہے۔ ادب زندگی کو روانی سے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک انسان اور ادیب کے فرائض اور مقاصد میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ آپ سائنس ہی کو لے لیں خود سائنس کا مقصد بھی یہی ہے یعنی کہ ہر انسان اور معاشرے کے ہر فرد کو ذہنی' جسمانی' روحانی نشو ونما اور ترقی کا موقع مل سکے۔ اس طرح ادیب انسان کی کج روی اور اس کے بے اعتدالی پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ وہ انسان پر خیر و شر کے پہلوؤں کو روشن اور واضح کرتا ہے۔ اس طرح ادب ہمیں اچھی اور صالح زندگی گزارنے کا طریقہ اور سلیقہ سکھاتا ہے۔ ادب انسان کی زندگی اور ہمارے معاشرے میں مسرت' خوشی' سکون اور خوشحالی لاتا ہے۔ اس طرح ادب زندگی کا مفسر ہی نہیں بلکہ یہ زندگی کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ ادب کو ایک مثالی استاد سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے جو ہمیں ان داستانوں' ناولوں' کہانیوں' ڈراموں' گیتوں اور نظموں کے ذریعے زندگی کے اسرار و رموز سے ہی واقف نہیں کراتا بلکہ زندگانی کے آداب بھی سکھاتا ہے۔ درحقیقت ادب کا مقصد بھی یہی ہے وہ انسانیت کا نقاد بن کر اور انسان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے اسے ترقی اور خوشحالی کی راہ دکھائے۔

بحیثیت مجموعی ادباء اور شعراء پر اس سلسلے میں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیوں کہ ان کی تخلیقات کا اثر معاشرے پر پڑتا ہے اور ان کی تحریریں قارئین کو اپنے اثر میں لیتی ہیں۔ ادیب نہ صرف ہماری ذہنی آسودگی کا سامان مہیا کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے رشحات قلم سے نئی نسل کی آبیاری بھی کرتے ہیں۔ اب شاعروں اور ادیبوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ادب کو زیادہ سے زیادہ معیاری' اعلیٰ اور افادی بنانے کی کوششیں کریں تا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ زندگی کی

حقیقت ہو اور وہ زندگی کے ترجمان اور نقاد بن کر زندگی کو ترقی' خوشحالی اور امن و آشتی کے راستے پر لے جائیں اور اس طرح ہمارا معاشرہ ایک خوشحال' ترقی یافتہ اور مثالی معاشرہ بن سکے۔

آخر میں' میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ کسی بھی سائنس یا علم و فن کی واقفیت اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے کس علم کا براہ راست مطالعہ ضروری ہے کیوں کہ ادب کسی دوسرے علم کا بدل نہیں بن سکتا اور یہی بات کسی دیگر علوم و فنون کے لئے کہی جا سکتی ہے یعنی جغرافیہ نہ تاریخ کا بدل ہو سکتا ہے نہ میڈیکل سائنس انجینئرنگ کا بدل بن سکتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ادب ایک اچھا سائنس دان' ایک اچھا ڈاکٹر یا ایک اچھا انجینئر بننے میں ممد و معاون ضرور ثابت ہو سکتا ہے کیوں کہ ادب انسان کے اندر انسانی اور اخلاقی قدروں کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ انسان کو مشین بننے سے روکتا ہے۔ یہ انسانی اقدار کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ انسان کی شخصیت میں حسن و نکھار پیدا کرتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے ماہرین نے انسان کے لئے شعر و ادب یا فنون لطیفہ کے مطالعہ کو ضروری قرار دیا ہے۔

☆---☆

ہمارے ادب کا بنیادی مسئلہ

یہ شکایت عام ہوتی جا رہی ہے کہ لوگوں کی ادب سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی ۔ ادب کے قاری ہیں بھی تو اس سے مخلص نہیں، وہ ادبی کتابوں کا بھرپور مطالعہ نہیں کرتے بلکہ اِدھر اُدھر سے جستہ جستہ پڑھ لیتے ہیں ۔ مجھے افسر ماہ پوری کا ایک شعر یاد آتا ہے ۔

یہ دور وہ ہے جو شعر و ادب نہیں پڑھتا
کہیں کہیں سے تو پڑھتا ہے سب نہیں پڑھتا

ایک زمانے میں فارسی تعلیم بھی اردو کے ساتھ دی جاتی تھی جس کا سلسلہ اب تقریباً بند ہو چکا ہے ۔ ڈپٹی نذیر احمد اور عبدالحلیم شررؔ کے ناولوں اور ادبی رسائل کی رسائی ہر گھر میں تھی ۔ ادب کا ابلاغ بھی ہوتا تھا مگر پھر یہ بھی ہوا کہ ادب کے نام پر مبہم اور نہ سمجھ میں آنے والی تحریریں بھی وجود میں آنے لگیں جن پر انگلیاں اٹھیں ۔ جواب آیا 'ہم اپنے لئے لکھتے ہیں' ۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ادب کا ایک بنیادی مسئلہ اس کی تفہیم اور اس کا ابلاغ بھی ہے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شعر نہ کہیں یا ایسی تحریر نہ لکھیں جو ایک معمہ بن جائے آپ جو بھی لکھیں اسے لوگ سمجھیں اور آپ کی تحریر سے متاثر ہوں اس سے حظ اٹھائیں اور اس سے مستفید بھی ہوں کیوں کہ ادب تفسیر حیات ہے ۔ ادب ہمیں انسانیت کا درس دیتا ہے اور ہمارے اخلاق کو درست بھی کرتا ہے ۔ یہ سیاسی' سماجی' اقتصادی' مذہبی' روحانی اور دیگر مسائل کو سمجھنے میں ہماری رہبری بھی کرتا ہے ۔ اچھا ادب ہمارے اندر صالح خیالات پیدا کرتا ہے اور

صالح عمل کی بھی تلقین کرتا ہے۔ یہ کام ادیب اپنی تحریروں کے ذریعے انجام دیتا ہے ادب کے بنیادی مقاصد میں ایک اچھے معاشرے کی تشکیل و تعمیر بھی شامل ہے۔ اچھا ادب لوگوں کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر کے اسے مثبت فکر کا حامل بنا دیتا ہے۔ مگر ایک اچھا ادیب اعلیٰ انسانی اقدار کو ایسے موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کرتا ہے کہ اس کی تحریر نصیحت کا پلندہ نہیں بلکہ اس کے ادب پارے کا جزو لاینفک کی صورت اختیار کر جائے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں یہ اعتراض خاص طور پر کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ناولوں یعنی کہانیوں میں جب نصیحت کرنے لگتے ہیں تو تبلیغ کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ قصے کہانیوں کے ذریعے اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے اس کے ذریعے موثر کردار سازی کی جا سکتی ہے مجھے اس سے بھی اتفاق ہے کہ بہت سی اخلاقی باتیں کہانی کی شکل میں یا شاعری کی شکل میں موثر انداز میں پیش کی جا سکتی ہیں اور پیش کی گئی ہیں:۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اگر بلا واسطہ یعنی سیدھے طور پر کوئی بات کہی جائے تو اس کا اثر سننے والے یا پڑھنے والے پر زیادہ نہیں ہوتا۔ یہ ادیب کا کام ہے کہ کون سی بات کس طرح' کس انداز اور اسلوب میں کہی جائے کہ وہ تحریر یا شعر اس حقیقت کی تصویر بن جائے کہ ''آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد'' میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادیب کے سامنے لکھنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے مگر وہ جو کچھ بھی اپنے احاطۂ تحریر میں لائے اسے ادب کے دائرے سے باہر نہ نکلنے دے۔ واضح رہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کی بیشتر افسانوی تحریروں پر اس تناظر میں تنقید کی گئی تھی کہ ادب میں ہر قسم کے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے اور ایسا کیا جا رہا ہے۔ سیاست' سائنس' تاریخ' عمرانیات' نفسیات' مذہب' حاضرہ اور اقتصادی مسائل پر بھی ادیب قلم اٹھاتے ہیں۔ لکھتے رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں بنیادی شرط وہی کہ ان کی تحریر ادب پارہ ہو نہ کہ تاریخ نامہ' سیاست نامہ یا سائنس نامہ بن

جائے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ History & litereture are twin sisters یعنی تاریخ اور ادب پر ایک دوسرے کی جڑواں بہنیں ہیں مگر ایک اچھا ادیب کسی تاریخی واقعے کو بھی پیش کرتا ہے تو اسے شعر و ادب کا حصہ بنا دیتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:۔

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

☆

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

☆

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

مگر سیاسی موضوع پر ایسا بھی شعر سننے میں آتا ہے 'لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو' اسے ہم ایسا سیاسی نعرہ کہہ سکتے ہیں جو صرف احتجاجی ادب کا حصہ ہے۔ سائنسی موضوع پر چکبست کا یہ شعر تو کمال کا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

بچوں کے ممتاز شاعر اسمٰعیل میرٹھی نے بھی اپنی ایک نظم 'آسمان اور تارے' میں سائنسی حقائق کو اس طرح پیش کیا ہے۔

یہ لعل و گہر ہیں جو بکھرے پڑے
زمیں سے بھی ان میں ہیں اکثر بڑے
نظر میں جو اتنے سے آتے ہیں
بہت دور چکر لگاتے ہیں یہ

یہ قائم ہیں تری ہی تقدیر سے
بندھے ہیں بہم سخت زنجیر سے
وہ زنجیر کیا ہے کشش باہمی
اس میں خلل ہے نہ بیشی کمی

ان مثالوں سے مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ موضوع کوئی بھی ہو ایک سچا فن کار اسے ایک عمدہ فن کی شکل عطا کر دیتا ہے۔ایک زمانے تک ادب برائے زندگی یا دب برائے ادب کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے۔ اس سلسلے میں سردست یہی کہہ سکتا ہوں کہ ادب پہلے ادب ہے پھر اس کے بعد آپ جو بھی چاہیں اُسے ادبی پیرائے میں پیش کر دیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ادب کا زندگی سے گہرا رشتہ ہے اور یہ رشتہ کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہتا ہے۔اس طرح ترقی پسند اور جدید ادب کا قضیہ چھڑا مگر یہاں بھی مختصراً یہی کہوں گا کہ اچھا ادب چاہے اسے ترقی پسندوں نے پیش کیا ہو یا جدید لکھنے والوں نے اسے لوگ پسند کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔آج بھی کچھ لوگ پریم چند کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتے ہیں ایک بار اسلامی ادب اور پاکستانی ادب کی بات آئی تو گوپی چند نارنگ نے یہ کہا کہ لکھنے والا اگر پاکستانی ہے تو اس کی تخلیقات میں پاکستانیت ہونی چاہیئے ۔ یہ ایک فطری بات ہے مگر اسے کلیہ نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ بہت سے ادیبوں پر ان کے مذہب کا اثر بھی لاشعوری طور پر ہوتا ہے اور اس کا اظہار ان کی تحریروں میں کہیں کہیں پیش کیا گیا اگر اس نے اپنی بات ادبی پیرائے میں خوش اسلوبی سے پیش کر دی ہے تو اس کی تحریر پڑھی جائے گی۔

ادیب بھی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے اور دوسرے افراد کے مقابلے میں زیادہ احساس ہوتا ہے اور یہ واقعات' حالات اور مسائل کے تجزیہ کرنے کا دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ شعور رکھتا ہے اور چونکہ اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے اس لئے وہ ان مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ان مسائل کی رپورٹنگ نہیں کرتا بلکہ ان کو فنکارانہ انداز میں دیکھتا اور دکھاتا

ہے۔ادیب معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں، ظلم، تشدد اور ناانصافیوں پر نہایت فنکارانہ اور ماہرانہ انداز میں قلم اٹھاتا ہے۔وہ واقعات وحالات پر ہماری توجہ مبذول کراکے آگے بڑھ جاتا ہے اب یہ کام ہمارا ہے کہ ہم ان اشارات کو سمجھیں اور ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں میں اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہمارا ادب حقیقی مسائل سے آنکھیں چرا رہا ہے اور ان قوتوں کا ساتھ دے رہا ہے جو ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں اس لئے وہ خود بھی بے معنی ہوگیا ہے۔

میں اس سلسلے میں یہی کہوں گا کہ ادب نہ صرف تفسیر حیات ہے بلکہ ادب زندگی کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ایسی تعمیر جس کی بنیاد زندہ اور مثبت قدروں پر قائم ہے۔لکھنے والوں کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں۔وہ واقعات وحالات اور مسائل کو دیکھ کر سرسری طور سے نہیں گزرتا بلکہ وہ ان کے اسباب وعوامل پر بھی غور کرتا ہے اور اپنے ضمیر کی عدالت میں ان مقدمات کو پیش کرتا ہے اور اس کا فیصلہ ادب کے واسطے سے ہمیں سناتا ہے۔ایک اچھا اور سچا ادیب وہی کچھ لکھتا ہے جو وہ معاشرے میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے وہ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتا۔اس کا قلم جرأت کے ساتھ حقائق کا اظہار کرتا چلا جاتا ہے۔اس کی تحریر سچائی اور جسارت کا شبہ پارہ بن جاتی ہے اور ایسا ہی ادب پڑھنے والوں میں مقبول ہوتا ہے۔حقیقت کی ترجمانی کرنے والا نہ صرف یہ کہ قلم کی حرمت کو پہچانتا ہے بلکہ وہ اپنا وقار اور بھرم بھی اپنی تحریروں کے ذریعے قائم رکھتا ہے:

لکھنا وہی جو ' حرف تقاضا ہے قلم کا
رکھنا تجھے کچھ اپنا بھرم ہے کہ نہیں ہے

☆......☆

ہمارا ذریعہ تعلیم

قیام پاکستان کو ۵۶ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے مگر اب تک ہم ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں شکوک وشبہات اور خدشات میں مبتلا ہیں۔ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ذریعہ تعلیم ہماری اپنی قومی زبان یعنی اردو ہوگی مگر بد قسمتی سے اس کا عملی طور پر نفاذ اب تک نہیں ہو سکا۔ شریف کمیشن نے دونوں زبانوں یعنی اردو اور بنگلہ (اس وقت تک بنگلہ دیش نہیں بنا تھا) کی موثر حیثیت کو پہلی مرتبہ عملی طور پر تسلیم کر لیا تھا مگر عملی طور پر اس کا نفاذ نہیں ہو سکا۔ ۱۹۶۹ء میں نور خان کمیشن کی رپورٹ بھی قومی زبان یعنی اردو کے حق میں تھی۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ (اردو ذریعہ تعلیم) نور خان کی متعلقہ سفارشات پاکستانی قومیت کی روح کے عین مطابق تھیں اور ان میں انگریزی کے مقابلے میں اردو کا پلڑا بھاری رکھا گیا تھا۔ نور خان کمیشن کی ایک سفارش کا حوالہ اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ

> ''تعلیم کی اعلیٰ سطح پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے میں حاکم اور محکوم کی تفریق کا تاثر پایا جاتا ہے جسے جاری رکھنا از حد نقصان دہ ہوگا اور یہ بھی کہ ۱۹۷۴ء تک دفتروں میں قومی زبان کو مکمل طور پر رائج ہونا چاہیے''

مگر ایسا نہ ہو سکا اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ جبکہ بنگلہ دیش میں بنگلہ کا نفاذ ۱۹۷۳ء میں ہو گیا۔ شیخ مجیب نے ڈھاکہ پہنچتے ہی بنگلہ زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ ڈھاکہ کا سیکریٹریٹ میں گئے اور وہاں ایک فائل پر

بجائے انگریزی کے بنگلہ میں لکھا ''دیکھلم'' دھنے باد(دیکھ لیا۔شکریہ SEEN THANKS)اس وقت افسر ماہ پوری کراچی نہیں آئے تھے اور سیکریٹریٹ میں ملازم تھے۔انہوں نے شیخ صاحب کی تحریر خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔پھر شیخ مجیب مدرسئہ عالیہ ڈھاکا پہنچے۔وہاں یہ پوچھا کہ کس زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔وہاں کے اساتذہ نے بتایا ہے کہ اردو میں شیخ صاحب نے کہا کیوں' بتایا گیا کہ بنگلہ میں مذہبی کتابیں نہیں کے برابر ہیں' سارا اسلامی ذخیرہ اردو' فارسی اور عربی میں ہے شیخ صاحب نے کہا کہ جلد از جلد ان کتابوں کا ترجمہ بنگلہ میں کیا جائے۔مقصد کہنے کا یہ ہے کہ قومی زبان کا نفاذ اس طرح ہوتا ہے یعنی صرف نفاذ کا فیصلہ ہی نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس کا فوری نفاذ عملی طور پر بھی کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مذکورہ مضمون (جواب انٹر کے اردو کی نصابی کتاب میں بھی شامل ہے)اس مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ:

''تمام دنیا میں قومیں اپنی قومی زبان سے پہچانی جاتی ہیں یہ نہیں ہوتا کہ اپنی قومی زبان کے لیے کسی کو اپنی ہی قوم سے لڑائی لڑنی پڑی ہو۔بدقسمتی کہ پاکستان میں یہ صورتحال درپیش ہے......خود اپنے ہی لوگ اردو کی تعلیم کو زبان بننے نہیں دیتے اسے دفتروں اور کاروباروں میں داخل نہیں ہونے دیتے۔''

غرض یہ کہ اس سلسلے میں ہم لوگ عجیب صورتحال سے دوچار ہیں۔اب تو حالات اور روز بروز بگڑتے ہی جارہے ہیں۔ہم انگریزی زبان کو اپنی قومی زبان پر ترجیح دینے لگے اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری ہر طرح کی ترقی کا دارومدار انگریزی زبان پر ہی ہے۔قوموں کی صحیح ترقی ان کی قومی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے کیوں کہ اپنی قومی زبان بلکہ علاقائی زبانوں کے پڑھنے اور سمجھنے والے لوگ زیادہ ہوتے ہیں ان کو اپنی زبان سیکھنے میں زیادہ وقت پیش نہیں آتی۔ان کے کان اپنی قومی زبان اور علاقائی زبانوں سے آشنا ہوتے ہیں۔میں نے دیکھا کہ انگریزی میڈیم کے اسکولوں کے طلبا ابتداء کے مدارج میں اسباق رٹتے ہیں۔رٹ کر امتحانات میں سوالات کے جوابات لکھتے ہیں۔اس سے بلاوجہ ان کا وقت برباد ہوتا ہے اور ان کے معصوم ذہنوں پر بوجھ پڑتا ہے۔کیونکہ وہ

ENGLISH ORIENTED نہ ہونے کی وجہ سے اسباق کے رٹنے پر گزارہ کرتے ہیں۔اس سے تعلیم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔LEARNING نہیں ہوتی بلکہ ان کے حافظے کا امتحان ہوتا ہے۔

تحصیل علم ہو نہ ہو مل تو گئی سند
طوطے کی طرح سارے ہم اسباق رٹ گئے

اردو میں یا دیگر علاقائی یا صوبائی زبانوں میں بچہ زیادہ آسانی سے سبق کو سمجھتا ہے اور اپنے طور پر ان کا جواب بھی دے سکتا ہے۔میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ انگریزی کو دیس نکالا کر دیا جائے۔انگریزی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائیں مگر ذریعۂ تعلیم قومی زبان ہو۔اور کوئی وجہ نہیں کہ جو بچہ میٹرک تک بلکہ انٹر تک انگریزی بحیثیت ایک مضمون پڑھے تو اس کو اتنی بھی انگریزی نہ آئے کہ وہ اگر بیرون ملک جائے یا کسی کتاب کا مطالعہ کرے جو انگریزی میں ہو تو اس کی سمجھ میں نہ آئے۔جب کہ صورت حال یہ ہے کہ ہر ملک میں انگریزی ذریعۂ تعلیم نہیں ہے' جرمنی' جاپان' روس' چین وغیرہ میں وہاں کی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ہمارے ملک سے جو طلبا ان ممالک میں جاتے ہیں تو ان کو روسی' جاپانی' چینی وغیرہ سیکھنا پڑتی ہے پہلے وہاں کی زبان سیکھتے ہیں۔پھر وہاں کی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:۔

> ''انگریزی اب صرف پچاس فیصد علم کا وسیلہ رہ گئی ہے۔باقی پچاس فیصد کے لیے اب انگریزی کے مقابلے میں روسی' جرمن' فرنچ' چینی اور جاپانی زبانیں بھی میدان میں آ گئی ہیں۔''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب دنیا میں انگریزی زبان کی اجارہ داری نہیں رہی۔اور پھر اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کر چکے ہیں۔سابقہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اس کا کامیاب تجربہ ہو چکا ہے۔نہ صرف ایم اے' ایم ایس سی بلکہ میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم بھی اردو کے ذریعہ ہی دی جاتی رہی ہے۔اب رہا سوال سائنس کی جدید کتابوں کا مسئلہ کیسے حل ہو۔کیونکہ دنیا میں سائنس کی

ترقی زوروں پر ہے اور کتابیں انگریزی' روسی' جاپانی اور جرمن زبانوں میں لکھی جا رہی ہیں۔ اس مسئلہ کا بھی بہت آسان حل ہے۔ یعنی ایک مرکزی ادارہ برائے ترجمہ اور تالیف بنا دیا جائے ایک زمانے میں اہل یورپ نے بھی اسی طرح فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ لوگ ہسپانیہ اور دوسرے مسلم ترقی یافتہ شہروں میں آتے تھے اور وہاں پر تعلیم حاصل کرتے تھے اور انہوں نے عربی کی بے شمار کتابوں کا اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور ان کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس سلسلے میں ایک اہم بات کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ

"بہر حال ہم انگریزی کے مخالفوں میں سے نہیں۔ ہم صرف کفش برداری سے روکتے ہیں کیونکہ انگریزی زبان کا اپنا تجربہ ہم سے یہی کہتا ہے۔ کہانی اس تجربے کی یہ ہے کہ کسی نورمن حملے اور نورمن قبضہ انگلستان کے بعد انگریز قوم ذلت و خود تحقیری کے اس گڑھے میں اس حد تک گر چکی تھی کہ وہ اپنی زبان کو نفرت سے دیکھتی تھی اور اس کا ہر فرد فرنچ بول چال نوشت و خواند یہاں تک کہ خورد و نوش اور عبادات میں ہر دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ ۱۱۵۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کا یہ زمانہ انگریزی کی بدبختی کا زمانہ تھا۔ لسانی غلامی کا شرمناک تجربہ انگریزوں کو بھی ہوا اور ہم اس تجربے سے اردو کے سلسلے میں یہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔۔۔۔ میرے خیال میں اس سے یہ سبق نکلتا ہے کہ غیور قومیں غیر زبانوں کی چکا چوند سے متاثر ہو بھی جائیں تو ہر حال میں اس سے نکلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دوم یہ کہ انگریزی جس کے سائنسی تفوق کا شہرہ ہے اس وقت تک سائنس کی زبان نہیں بن سکی جب تک وہاں کے لوگوں نے اپنی زبان سے سوچنا اور تجربہ کرنا شروع نہیں کیا۔"

یہاں پر اس بات کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے مگر ہمارے ہاں صوبائی اور علاقائی زبانیں بھی ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انگریزی کے مقابلے میں اردو زبان ہم سے بہت قریب ہے اور نہ صرف ہماری قومی زبان ہے بلکہ رابطے کی زبان بھی ہے۔ پاکستان

کی دیگر زبانوں سے قریب تر ہے۔ بلکہ رسم الخط بھی ایک جیسا ہے۔ عربی ہر مسلمان بچہ پڑھتا ہے عربی فارسی کے الفاظ نہ صرف اردو میں شامل ہیں بلکہ سندھی' بلوچی' پنجابی' پشتو' سرائیکی' ہندکو میں بھی بہت سے عربی وفارسی کے الفاظ شامل ہیں اور اردو نہ صرف ایک علاقے یا ایک مخصوص طبقے کی زبان ہے بلکہ سارے پاکستانیوں کی زبان ہے۔ اردو کی خدمت' پنجاب' سندھ' بلوچستان اور سرحد نے کی ہے۔ اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں۔ اردو کے اہم مصنف اور شاعران علاقوں میں پیدا ہوئے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اردو کے سوتے سندھ میں تلاش کرنے کی کوشش اور حافظ شیرانی نے پنجاب کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیا۔ سرحد اور بلوچستان میں بھی اردو کی نشوونما ہوئی۔ خود ڈاکٹر سید عبداللہ مردان کے رہنے والے تھے۔ اقبال اور فیض کا تعلق پنجاب سے تھا۔ احمد فراز اس دور کے مقبول شاعر ہیں ان کا تعلق پشاور سے ہے۔ اس طرح اردو ان کے لیے اجنبی نہیں بلکہ ان کی بھی اپنی زبان ہے۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے یا ہماری خوش قسمتی ہے کہ پاکستان کی تمام زبانوں کا رسم الخط ایک ہی ہے صرف چند حروف کی کمی یا اضافے کے ساتھ۔ پھر ہر پاکستانی عربی قاعدہ یا قرآن کریم بھی ضرور پڑھتا ہے۔ اس لیے اردو رسم الخط اس کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ مشرقی بنگال جب پاکستان کا حصہ تھا تو صرف یہاں کی زبانوں میں بنگلہ زبان ایسی زبان تھی جس کا رسم الخط دیوناگری سے ملتا جلتا تھا۔ ہاں ایک فرق اور تھا کہ وہ بائیں سے دائیں طرف لکھا جاتا تھا۔ اس فرق کو کچھ لوگ بائیں بازو اور دائیں بازو کا فرق بھی کہتے تھے مگر ایک زمانے میں بنگلہ میں پوتھی زبان کا بھی چرچا ہوا تھا جس میں اردو فارسی کے الفاظ زیادہ تھے۔ اس کا جواب کسی اور مضمون میں دوں گا سردست اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اب جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اس سلسلے میں پروفیسر فتح محمد ملک کے مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پنجاب آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ پنجاب نے اردو کی خدمت سب صوبوں سے بڑھ کر کی ہے بلکہ دیکھا جائے تو اہل پنجاب کی مادری زبان بھی اردو ہی ہے۔ فتح محمد ملک کے

جس مضمون کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ گراں قدر مقالہ جس کا عنوان ہی ہے "پنجاب کی مادری زبان اردو" ماہنامہ قومی زبان کراچی کے مارچ ۲۰۰۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے کھلے دل سے اظہار کیا ہے کہ حوالے اور سند کے طور پر پیسہ اخبار میں شائع اداریوں اور مضامین کا ذکر کیا ہے۔ اپنے تحقیقی مضمون میں فتح محمد ملک نے اردو کی موافقت میں مختلف لوگوں کی آراء اور خیالات کو موثر انداز میں پیش کیا ہے نیز اردو کے مقابلے میں پنجابی کو رائج کرنے کے خیالات کے حامل لوگوں مثلاً سر چیٹر جی کا حوالہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ۲۶ فروری ۱۹۰۹ء کے پیسہ اخبار میں شائع ہونے والے طویل اداریہ (بعنوان پنجابی بخلاف اردو) سے یہ حوالہ پیش کیا ہے جس سے ان کے موقف کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

''سررشتہ تعلیم پنجاب گورمکھی شاخیں کھولے جانے کی منظوری دے چکا ہے لیکن اب تک بہت کم گورمکھی مدارس اضلاع لاہور و امرتسر میں جاری ہوسکے ہیں جہاں گورمکھی برانچیں کھولی گئی ہیں وہاں ان میں کامیابی نہیں ہوئی اور ان برانچوں نے ترقی کے مطلق آثار ظاہر نہیں کئے یہ نہایت عجیب اور قابل غور امر ہے کہ گرونانک کے جنم استھان ننکانہ میں گورمکھی شاخ کے طلبا کے بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے بند کرنی پڑی۔ اس طرح سکھوں کے دوسرے مقدس مقامات امرتسر و ترن تارن کی گورمکھی برانچوں کی تعداد میں بھی تنزل ہوا ہے'' اس سلسلے میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فتح محمد ملک اخبار ہذا کے ۷ مارچ کے مقالہ افتتاحیہ کا بھی حوالہ دے کر اپنے موقف کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ اخبار کے مطابق یہ نظریہ پیش کر دیا گیا ہے کہ پنجابیوں کی مادری زبان اردو ہے چنانچہ مادری زبان میں تعلیم کے تمام فوائد اردو زبان میں تعلیم سے پورے ہو رہے ہیں۔ اردو کے مقبول عام زبان کے ثبوت پیش کرتے کرتے اداریہ نویس نے اپنی تان یہاں توڑی ہے:۔

> ''گورنمنٹ نے پن جاب (پنجاب) میں اردو رائج نہیں کی بلکہ مروجہ زبان اردو کو فارسی کی بجائے سہولت عامہ کے خیال سے دفاتر و عدالتوں میں داخل کیا جبکہ اردو پیدا ہی پنجاب میں ہوئی تو یہاں کس طرح اجنبی ہو سکتی ہے''

میں بھی اس سلسلے میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ پنجاب کے اس حصے سے جو سکھ اور ہندو ہندوستان گئے انہوں نے اردو زبان کو ہی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان میں بہت سے لوگ اردو کے ادیب او شاعر تھے۔ اب بھی ان میں سے بہت سے لوگ اردو میں شعر کہہ رہے ہیں اور افسانے ومضامین لکھ رہے ہیں۔ میں نے پٹنہ میں سکھوں کا ایک مذہبی جلوس ۱۹۵۸ء میں دیکھا (پٹنہ گرو گوبند سنگھ کا شہر ہے) ان میں سے کئی لوگ اردو کے شعر با آواز بلند پڑھتے جا رہے تھے۔ اردو کی نظمیں پڑھ رہے تھے جن میں اپنے مذہبی خیالات وجذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

پنجابی کے حوالے سے اب بھی اس طرح کی باتیں ہوتی رہتی ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ پاکستان آئے تھے پھر ہمارے پنجاب (پاکستان) کے وزیر اعلیٰ ہندوستان تشریف لے گئے۔ وہاں ہمارے پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے جس جسارت سے اور دوٹوک انداز میں بات کہی وہ قابل تعریف ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی نے پٹیالہ میں گفتگو کے دوران یہ بات کہی کہ

> '' پنجابی کی محبت اور مشترکہ ورثے کی بات کر کے سرحدیں ختم نہیں کی جا سکتیں مسئلہ کشمیر کے حل تک بھارت کو پسندیدہ ملک کا درجہ نہیں دے سکتے''
>
> (روزنامہ جنگ ۵ دسمبر ۲۰۰۴ء)

اس سلسلے میں مَیں اپنی طرف سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو نہ صرف ہماری قومی زبان ہے بلکہ یہ زبان پاکستان اور اس قوم کی ضرورت ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے بجا طور پر ڈھاکے میں فرمایا تھا کہ ''اردو زبان کا نہیں بلکہ ضرورت کا نام ہے''

اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اردو کو اردو کالج دہلی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں آزمایا جا چکا ہے۔ اس زبان میں ہر شعبے اور علوم کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ ایم اے۔ ایم ایس سی میڈیکل اور انجینئرنگ کا ذریعہ تعلیم اردو زبان رہی ہے۔ ارباب حل وعقد سے بس میں یہی کہوں گا کہ ''آزمودہ را آزمودن جہل است''

اردو زبان کے نفاذ کے لیے مقتدرہ کا قیام عمل میں آیا۔ کام آگے بڑھا پھر رک گیا اس لئے کہ جب نفاذ کا عمل رک جائے تو کام کیسے آگے بڑھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اس کے لیے کافی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستان ٹیلی ویژن پر اس سلسلے میں مذاکرہ ہوا تھا جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی' ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' ڈاکٹر شاہدہ قاضی (صدر شعبۂ صحافت جامعہ کراچی) اور فخر زمان نے شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر شاہدہ قاضی جن کی مادری زبان اردو نہیں بلکہ سندھی ہے نے بڑی معقول بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ صرف ایک آرڈیننس کی ضرورت ہے اس کا نفاذ فوری ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بھی اردو زبان کے حامیوں میں سے ہیں انہوں نے نیشنل لینگویج کے ترجمے پر اعتراض کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس کا صحیح ترجمہ رابطے کی زبان ہے۔ اس سلسلے میں میں ان سے اتفاق نہیں کرتا نیشنل کا تو ترجمہ قومی ہی ہوتا ہے مثلاً National Game' National Dress' National Flower' National Flag' National Anthem وغیرہ ان کا بالترتیب ترجمہ تو یہی ہوتا ہے قومی نغمہ' قومی پھول' قومی لباس' قومی پرچم' قومی کھیل' اب ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہیں کہ رابطے کا نغمہ' رابطے کا جھنڈا' رابطے کا پھول تو عجیب سی بات ہوگی۔ مطلب اور مقصد دونوں ہی پورا نہیں ہوں گے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اردو اگر ہماری قومی زبان ہے تو دوسری علاقائی یا صوبائی زبانیں ہمیں عزیز نہیں۔ دوسری زبانیں بھی معتبر' قابل قدر اور ہماری اپنی زبانیں ہیں۔ چنبیلی کا پھول ہمارا قومی پھول ہے تو کیا گلاب' جوہی' موگرا اور بیلے کا پھول ہمیں عزیز نہیں۔ ہاکی ہمارا قومی کھیل ہے تو کیا کرکٹ اور فٹبال ہم نہیں کھیلتے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ اردو قومی زبان ہی نہیں بلکہ رابطے کی زبان بھی ہے۔ مگر انگریزی تو ہمارے رابطے کی زبان نہیں۔ یہ سات سمندر پار کی زبان ہے۔ انگریزوں کو اس ملک پر حکومت کرنی تھی اس لیے انہوں نے زبردستی انگریزی کو نافذ و رائج کر دیا۔

ایلیٹ نے اپنی فکر انگیز کتاب Notes Towards The Defination Of Culture میں لکھا ہے کہ

دو عظیم برطانوی حکومت کی برکات تو جلد کھو جائیں گی لیکن مقامی ثقافت پر مرتب ہونے والے اس بدیسی کلچر کے منفی اثرات باقی رہیں گے۔''

ڈاکٹر تحسین فراقی اس سلسلے میں لکھتے ہیں (اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم مطبوعہ قومی زبان جنوری فروری ۲۰۱۳ء) انہیں منفی اثرات میں ایک دردناک بلکہ ہولناک اثر انگریزی زبان کی پرستش کے نتیجے میں مرتب ہو رہا ہے جسے ملک کی کل پڑھی لکھی آبادی' کے بہ مشکل ایک فیصد افراد انجام دے رہے ہیں۔ میکالے نے اپنے ۲ فروری ۱۸۳۵ء کے منٹس میں جو کچھ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مقامی زبانیں علمی اعتبار سے مفلس ہیں' مشرقی علوم ناقص اور جہالت پر مبنی ہیں۔ عربی اور سنسکرت بیکار ہیں..... حکومت سنسکرت اور عربی کے طلبا کے وظائف جاری کر کے پیسہ برباد کر رہی ہے۔
(حوالہ مذکورہ بالا مضمون تحسین فراقی)

اس لسانی استعمار کو محترمہ ٹوو سکٹ نیب کا ڈاس نے لسانی نسل کشی سے تعبیر کیا ہے۔ وہ Linguistic genocide In Education میں لکھتی ہیں (بحوالہ مضمون تحسین فراقی)۔

''اس کتاب کے پڑھنے والے کو یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ لوگوں کی زبانیں بشمول انگریزی سیکھنے کے مخالف نہیں۔ اضافی طور پر غالب زبانوں کا سیکھنا جن میں انگریزی بھی شامل ہے درست ہے مگر غالب زبانوں کے سیکھنے سکھانے کے اس تفریقی اور منافی رجحان کے نتیجے میں جہاں زبانوں مثلاً انگریزی وغیرہ کی ترویج مادری زبان کی قیمت پر کی جاتی ہے زبانوں کے قتل اور نسل کشی کا سانحہ ظہور میں آتا ہے۔''

اپنے اسی مضمون میں اپنے موقف کی حمایت میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک ہندو بنگالی فاضل کی رائے درج کی ہے جس نے بیسویں صدی کے پہلے دہے میں اردو کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا تھا۔ اس مشہور ہندو عالم یعنی شسی کانت چٹوپادھیا نے لکھا تھا کہ:

''دیسی زبانوں کی کوئی انتہا نہیں۔ حقیقت میں یہاں کثیر التعداد زبانیں تھیں اور ان

میں سے ہر ایک اپنی فضیلت کے لئے کوشاں تھی۔اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ یہاں ایک ایسی بھی زبان موجود نہیں جو اپنی قدیم تاریخ' اپنی لسانی کیفیات اور عملی صورت اور لوچ دار ہونے کی وجہ سے ان زبانوں کے مقابلے میں لینگوا فرینکا' اور نیز قومی زبان بننے کے قابل سمجھی جا سکے۔؟اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں پہلے ہی سے ایک زبان میدان میں موجود ہے اور اس کا نام اردو یا ہندوستانی ہے۔"

اس کے آگے وہ مزید لکھتے ہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مقتدر شہروں دہلی' آگرہ' لاہور ملتان' احمد آباد' حیدر آباد (دکن) اور بنگال کے ڈھاکہ اور مرشد آباد میں اردوئے معلی کا وجود تھا اور اب بھی ہے" (میرے خیال میں ان شہروں میں کلکتہ اور پٹنہ کو بھی شامل کرنا چاہیئے)

قومی زبان میں تعلیم دینے کی ایک عمدہ مثال دلی کالج بھی ہے۔اس کالج کی بڑی خصوصیت بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق یہ تھی کہ

"اس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔عربی و فارسی اور سنسکرت کی تعلیم خیر اردو میں ہوتی تھی لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو تھا۔یعنی ہیئت' ریاضیات اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو ہی میں دی جاتی تھی۔"

اس سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب کا درج ذیل رپورٹ کا حصہ بھی قابل غور ہے۔

"۱۸۵۲ء کی رپورٹ میں درج ہے کہ عربی فارسی کی جماعتوں کے علاوہ سائنس کی جماعتیں بھی تھیں جن میں احتیاط سے مغربی سائنسی زبان اردو کے ذریعہ کامل طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ماسٹر رام چندر ور دیگر اساتذہ کی قابلانہ تدریس سے طلبا ایسے ہوشیار ہو گئے تھے کہ وہ ریاضی' نیچرل فلاسفی اور تاریخ وغیرہ میں شعبۂ انگریزی کے طلبا کو نیچا دکھلانے لگے تھے اور مقابلے کے امتحان میں بازی لے جاتے تھے۔"

(مرحوم دہلی کالج ص:۲۵۔۲۶)

میرے خیال میں اس کی وجہ یہی ہے کہ غیر ملکی زبانوں کے مقابلے میں طلبا اپنی یا قومی زبان میں مضامین کو جلد اور بہتر طور پر سمجھ لیتے ہیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے یہاں بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ انگریزی زبان ہی کے ذریعہ سائنس اور دیگر تعلیم بہتر طور پر دی جاسکتی ہے: جس کے نقصانات کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں یعنی (۱) وقت کا ضیاع (۲) رٹنے یا حافظے پر زور (۳) تفہیم میں مشکلات وغیرہ۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی بھی صریر کے اداریوں میں اکثر ان مسائل پر لکھتے رہے ہیں۔ ماہنامہ صریر دسمبر ۲۰۰۲ء کے اداریے کی ابتدا ان سطور سے ہوتی ہے۔

> ''ایک خبر کے مطابق حیدرآباد سندھ کے ادارہ تعلیم نے موجودہ اردو میڈیم اسکولوں میں سے کچھ کا انتخاب کیا ہے جنہیں اپ گریڈ کیا جائے گا۔ یعنی ان کا درجہ بلند کر دیا جائے گا۔ اور وہ کس طرح؟ اس طرح کہ انہیں انگلش میڈیم بنا دیا جائے گا۔ یعنی ان میں ذریعہ تعلیم انگریزی میں ہوگا۔''

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اتنے سالوں کے بعد بھی لارڈ میکالے کی روح ہمارے سرکاری اداروں کے ذہنوں میں فعال ہے۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی مزید لکھتے ہیں کہ

> ''ایسے مہنگے انگریزی میڈیم اسکولوں میں جن میں تعلیم حاصل کرنا امارت کی علامت ہے یا اسٹیٹس سمبل سمجھا جاتا ہے بہت ہی مہنگی کتابیں باہر سے منگوا کر خاص دکانوں پر بیچی جاتی ہیں۔''

سوال یہ اٹھتا ہے کہ تعلیم کے سلسلے میں یہ تفریق کیوں؟ کیا امیر اور غریب کے لیے الگ الگ اسکول ہوں گے۔ تعلیم سب کے لیے ہے یا صرف امیر اور رعایت یافتہ طبقے کے لیے؟

اب تو کراچی میں اتنے انگریزی میڈیم اسکول کھل گئے ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ گلی گلی انگلش میڈیم اسکولوں کی بھرمار ہے۔ رہائشی عمارتوں میں بھی انگریزی اسکول قائم ہیں جبکہ

اردو میڈیم اسکول کی اپنی کشادہ عمارتیں ہوتی ہیں اوراب بھی ہیں مگر خدانخواستہ وہ وقت نہ آئے کہ تومیا ئے گئے اور دوسرے اسکول کا جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے وہ بند ہوجائیں۔آ ثار تو یہی نظر آرہے ہیں۔میں نے تھوڑے دنوں تک ایک اسکول میں بھی پڑھایا تھا جس کا نام اشاعت القرآن اسکول تھا۔اس وقت اس میں تقریباً ۴۰۰ طلبا زیر تعلیم تھے اب وہاں صرف ۱۷ طالب علم ہیں یعنی وہ اسکول بند ہونے کے قریب ہے۔میں نے جب اس کا سبب وہاں کے ایک استاد سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ بہت سے تو انگریزی ذریعہ تعلیم والے اسکول میں چلے گئے اور کچھ اس علاقے کے ہنگاموں سے تنگ آ کر کہیں اور چلے گئے۔بہر حال یہ سانحہ بڑا قومی سانحہ یا المیہ ہے۔

نصاب اور انگریزی ذریعہ تعلیم سے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون ''اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم'' مطبوعہ قومی زبان جشن صدر سالہ نمبر ۲۰۰۳ء کے صفحہ چالیس پر لکھتے ہیں کہ

> ''غیر ملکی یونیورسٹیوں کے نصاب کو غیر ملکی زبان میں پڑھنے والے سے آپ پاکستانیت پر مبنی طرز احساس کی کیسے توقع کر سکتے ہیں؟''

میں اس سلسلے میں مزید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زبان کا تعلق صرف زبان سے نہیں ہوتا بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا تعلق وہاں کے رسم ورواج' ثقافت' مذہب اور دیگر موضوعات سے بھی ہوتا ہے۔سلیم اختر انگریزی ذریعہ تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> ''اب اردو میڈیم غریب غرباء کے بچوں کے لیے اور انگلش میڈیم امراء نو دولتیے طبقے کے بچوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں۔یہ جس طبقاتی رویہ کو تقویت دینے کا باعث بن رہے ہیں وہ دعوت فکر دیتا ہے۔''

میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ:۔

علم ہو سب کے واسطے شاہین
ہے یہی انقلاب کی صورت

انقلاب تو اس لیے لایا جاتا ہے کہ ملک اور قوم کے سارے افراد اس سے مستفید ہوں نہ کہ صرف ایک طبقے کو اس سے فائدہ پہنچایا جائے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی اس سلسلے میں لکھا ہے اور بجا لکھا ہے کہ ''کہاں تو وہ پرائیویٹ مدارس جہاں غرباء اور امراء سب کے بچے مفت تعلیم حاصل کرتے تھے اور کہاں آج کے پاکستان کے پرائیویٹ انگلش میڈیم مدارس جہاں غریب والدین کا بچہ تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ انگریزی زبان اور انگریزی میڈیم اسکول کھل گئے ہیں جن پر بڑے خوشنما لفظوں میں Elon School Lyerns High Gate Academy وغیرہ کے نام لکھتے ہیں بعض بڑی عمارتوں میں بھی انگریزی مدارس قائم ہیں۔ ان اسکولوں کی ماہانہ فیس حد درجہ ہوش ربا ہے اچھے اسکولوں میں میٹرک تک سائنس وغیرہ کی تعلیم میں اردو میڈیم کی جو گنجائش رکھی گئی تھی وہ بھی سرعت کے ساتھ ختم ہورہی ہے۔ سینٹ اسکولوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ سارے سینٹ ہمارے ملک میں آ گئے ہیں۔ اس طرح ملکی قومی نقصان ہورہا ہے۔ اس کا ہم صحیح اندازہ نہیں لگا رہے ہیں۔ ہمارے ملک اور قوم کو اگر ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے تو ہمیں تعلیم کو عام کرنا ہوگا اور ذریعہ تعلیم انگریزی کے بجائے اردو کو بنانا ہوگا۔ ہاں انگریزی کو ایک مضمون کی حیثیت سے ضرور پڑھائیں تاکہ انگلینڈ اور امریکہ جانے والوں کو مشکلات پیش نہ آئیں۔ اب رہا سائنس کی کتابوں کے اردو میں حصول کا مسئلہ تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کا تعلیمی بورڈ بنا دیا جائے۔ ترجمہ کرنے والا ادارہ قائم کیا جائے تاکہ دنیا میں جو سائنسی ترقی ہورہی ہے اور جو جدید کتابیں نہ صرف انگریزی بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں یا ملکوں میں لکھی جارہی ہیں ان کا فی الفور ترجمہ ہوجائے تاکہ ہمارے طلبا اور اساتذہ ان سے مستفید ہوسکیں۔ آخر اسپین (ہسپانیہ) جب سی طبی علوم میں سارے یورپ پر برتری رکھتا تھا تو دوسری قوموں نے عربی انگریزی اور دیگر دن میں ترجمہ کیا اور خاطر خواہ استفادہ کیا اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ اب ہمیں بھی ذہنی غلامی اور مغرب کی برتری سے بچنے کے لیے اپنی قومی زبان کو اپنے ملک میں ذریعہ تعلیم بنانا ہوگا

اگر یہ عمل ایک ساتھ تمام جماعتوں میں شروع نہ ہو سکے تو بتدریج اس کو رائج کیا جائے یعنی پرائمری پھر اَپر پرائمری' ثانوی اور اعلیٰ ثانوی مدارج کی سطح پر' پھر ڈگری' ایم اے' ایم ایس سی' میڈیکل اور انجینئرنگ سطح تک اردو کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ کتابیں اگر نہیں ہیں تو کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی جدید اور بہترین کتابوں کا ترجمہ کیا جائے۔ بس یہ کام شروع ہو جائے تو منزل کو حاصل کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ بی اے' بی کام اور بی ایس سی لیول کی کتابیں اردو میں دستیاب ہیں۔ ایک مرکزی ادارہ ترجمہ و تالیف اور تصنیف قائم کر دیا جائے جہاں قابل اور تجربہ کار ماہرین تعلیم کا تقرر کیا جائے اور یہ کام ان کے سپرد کر دیا جائے۔ اس طرح یہ کام آسانی سے پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ بس شرط اول قدم است کہ مجنوں باشی''

آمدنامہ سے غالبؔ کے قادر نامہ تک

مرزا غالبؔ نے اپنی منظوم مختصر لغت ''قادر نامہ'' کے آخری شعر میں لکھا ہے کہ جو شخص پورے ''قادر نامہ'' کو پڑھ لے اس کے لیے ''آمدنامہ'' کا پڑھنا مشکل نہیں ہوگا۔ وہ شعر یوں ہے۔

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اس کو آمدنامہ کچھ مشکل نہیں

جن لوگوں نے فارسی پڑھی ہے یا مدرسے میں تعلیم پائی ہے وہ اس حقیقت سے ضرور واقف ہیں کہ ''آمدنامہ'' ایک مختصر کتاب ہے جسے فارسی زبان دانی کی اگر کلید کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس میں فارسی کے تمام مصادر 'فعل کے اعتبار سے اس کی تمام قسمیں' مصادر کی گردان' (واحد اور جمع کے ساتھ اور تمام صیغوں کے ساتھ) درج ہیں نیز اسم فاعل سماعی' اسم فاعل قیاسی حاصل مصدر اور اسم مفعول بھی درج ہیں اور اگر کوئی آمدنامہ پر قدرت حاصل کر لیتا ہے تو فارسی زبان کا سیکھنا اس کے لیے نہایت سہل ہو جاتا ہے بلکہ اس کو آدھی فارسی زبان آ جاتی ہے' آمدنامہ کے اس مختصر تعارف کے بعد جب ہم مرزا غالب کے ''قادر نامہ'' کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سو فیصد نہ سہی مگر کسی حد تک تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اسکے مطالعے کے بعد اور اس میں درج شدہ الفاظ اور ان کے معنی (مرادفات) کو سیکھ لینے کے بعد آمدنامہ اور اس قبیل کی ابتدائی زبان دانی کی کتاب کا پڑھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اگرچہ قادر نامہ اپنی ہیئت' ساخت اور اصول کے لحاظ سے آمد نامہ کا بدل نہیں بلکہ یہ نظم جیسا ہے کہ اردو میں اور لوگوں نے بھی اس قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ ان سے

اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بہت سے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کے معنی آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور اگر اس نظم کو کوئی مبتدی زبانی یاد کر جائے تو اسے بہت سے الفاظ کے معنی یاد ہو جاتے ہیں اور مبتدیوں کے ذخیرۂ الفاظ اور اس کے DICTION میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

مرزا غالب نے یہ نظم اسی مقصد کے تحت بچوں کے لیے لکھی تھی۔ یعنی یہ نظم اپنے بھائی عارف کے دونوں بچوں کو فارسی اور اردو پڑھانے کے لئے کہی تھی۔

اس قسم کی منظوم لغت کا ذکر ہم لوگ سنتے آئے ہیں بلکہ اس قسم کی بعض نظموں کی شہرت تو اب تاریخی شہرت اختیار کر گئی ہے۔ ان میں ''خالق باری'' کا نام سرفہرست ہے جسے ہم لوگ امیر خسرو کی تصنیف پڑھتے اور سنتے چلے آرہے ہیں مگر اب تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ یہ امیر خسرو کی نہیں بلکہ کسی اور خسرو کی تصنیف ہے ویسے اس کی اہمیت مسلم ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی تصنیف ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ'' میں لکھا ہے کہ ''خالق باری'' امیر خسرو کی تصنیف ہو یا نہ ہو اس امر کا تصفیہ محققین کا کام ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ نہ صرف مقبول ہوئی کہ بلکہ رجحان ساز بھی ثابت ہوئی جس کا ثبوت اس کے تتبع میں لکھے گئے متعدد منظوم لغات ہیں۔''

اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے آٹھ دیگر منظوم کی لغات کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں، جو پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کے حوالے سے دی گئی ہے، مرزا غالب اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی مختصر منظوم لغات کا ذکر نہیں آیا ہے۔ ہاں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون میں آگے چل کر مرزا غالب کی منظوم لغت ''قادر نامہ'' کا ذکر ضرور کیا ہے بلکہ اس کے ایک شعر کا حوالہ بھی دیا ہے مرزا غالب نے اس نظم کے علاوہ ایک اور مختصر لغت لکھی۔ مرزا غالب نے جب برہان قاطع کا مطالعہ کیا تو اس کی تصحیح کی اور ''قاطع برہان'' کے نام سے ۹۸ صفحات پر مشتمل ایک لغت تیار ہوگئی جو ۱۸۶۸ء میں نول کشور پریس کے زیر اہتمام لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

ان باتوں سے حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرزا غالب کو اردو لغت سے بھی خاص شغف رہا

ہے۔''خالق باری'' کے مصنف کے متعلق جب میں نے مشفق خواجہ سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ ضیاء الدین خسرو کی تصنیف ہے جو''خسرو'' کی مماثلت سے امیر خسرو کے نام سے موسوم ہوگئی۔''خالق باری'' نام میں خاص بات یہ ہے کہ اس کے دونوں الفاظ یعنی خالق اور باری ہم معنی ہیں۔خالق باری کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

خالق باری سرجن ہار

واحد ایک بڑا کرتار

اب اس سلسلے میں اسمٰعیل میرٹھی کی بھی تین مختصر نظموں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ان تینوں مختصر نظموں کی تعداد ۲۸ ہے۔یعنی مرزا غالب کی نظم کے مقابلے میں اشعار کی تعداد کم ہے۔اسمٰعیل میرٹھی کو بچوں کے ادب سے بہت دلچسپی رہی تھی۔اسمٰعیل میرٹھی نے بھی یہ تین مختصر نظمیں مرزا غالب کی طرح اپنے بچوں کو سکھانے کے لیے لکھی تھیں۔ان نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ اسمٰعیل میرٹھی نے الفاظ کے ساتھ ساتھ بعض جملے محاورے اور مختصر جملے مع ترجمے کے موزوں کردیا ہے۔مثال کے طور پر انہوں نے تیسری نظم میں اس طرح لکھا ہے۔''کجا ہستی۔بتادے تو کہاں ہے'' اور اس کا دوسرا مصرع اس طرح ہے کہ''جسے کہتے ہیں بسمل نیم جاں ہے۔''اس طرح مختلف ادبا اور شعراء نے اپنے اپنے طور پر مختلف انداز میں لکھا ہے اور کچھ دوسری باتوں کا اضافہ کیا ہے اسمٰعیل میرٹھی نے ایک دوسری نظم میں وزن کا تصور دیا ہے تاکہ مبتدیوں کو وزن کا علم بھی ہوجائے۔مثال دیکھیے۔

متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن

اسے وزن کہتے ہیں شعر کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مرزا غالب نے یہ نظم عارف کے فرزندوں کے لیے لکھی تھی مرزا غالب کی منظوم لغت میں اشعار کی تعداد نہ صرف اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں سے زیادہ ہے بلکہ ان سے پہلے لکھی گئی منظوم لغات سے زیادہ ہے۔یعنی حکیم یوسفی (قصیدہ در لغات ہندی) اور سید فرزند علی شوق بریلوی (نصاب عجائب) کی منظوم لغات سے زیادہ ہیں۔مرزا غالب نابغۂ روزگار تھے۔ان

کی توجہ جس طرف بھی گئی انہوں نے اپنی جدت طرازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ان کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ان کی اپنی اولاد تو زندہ نہ رہی بھائی بھتیجوں سے محبت کا اظہار کرتے رہے۔ان کو پتنگ بازی کا بھی شوق تھا اور پتنگ پر بھی اشعار کہے ہیں۔نیز انہوں نے ایک لوری بھی لکھی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے

گاتی تھی شہرو کی بیگم تن نا با یا ہو
دودھ میں پکے تھے شلغم تن نا با یا ہو

مگر اس سلسلے میں ان کا اہم اور قابل ذکر کارنامہ بچوں کے لیے ان کی لکھی گئی وہ نظم ہے جس کا نام ''قادر نامہ'' ہے اور جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔اس نظم کو مرزا غالب نے ۱۸۵۶ء میں لکھا تھا۔اس منظوم لغت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

قادر اور اللہ یزداں خدا
ہے (نبی مرسل پیمبر) رہنما
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں امام
وہ رسول اللہ کا قائم مقام
ہے صحابی دوست خالص ناب ہے
جمع اس کی یاد رکھ (اصحاب) ہے
بندگی کا ہاں عبادت نام ہے
نیک بختی کا سعادت نام ہے
کھولنا افطار ہے اور روزہ صوم
لیل یعنی رات دن اور روز یوم
ہے صلوٰۃ اے مہربان اسمِ نماز
جس کے پڑھنے سے ہو راضی بے نیاز

جا نماز اور پھر مصلّا ہے وہی
اور سجادہ بھی گویا ہے وہی
اسم وہ ہے جس کو تم کہتے ہو نام
کعبہ مکہ وہ جو ہے بیت الحرام
گرد پھرنے کو کہیں گے ہم طواف
بیٹھے رہنا گوشے میں ہے اعتکاف
پھر فلک چرخ اور گردوں اور سپہر
آسماں کے نام ہیں اے رشک مہر

مندرجہ بالا دس اشعار میں تقریباً ۴۶ الفاظ ہم معنی یا مترادف آتے ہیں۔ اس منظوم لغت میں ۱۳۳ اشعار ہیں۔ اس سے مترادف الفاظ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مرزا غالب نے اس منظوم لغت میں نہ صرف یہ کہ الفاظ لکھے ہیں بلکہ ایک ایک لفظ کے کئی معنی دیے ہیں نیز کہیں کہیں ان کی وضاحت بھی کر دی ہے اور کہیں واحد کا جمع بھی لکھ دیا ہے۔ جیسے پیشوائے دین امام کو کہنے کے بعد اسکی وضاحت بھی کر دی ہے۔ یعنی دوسرے مصرعے میں لکھ دیا ہے۔ ''وہ رسول اللہ کا قائم مقام ہے''۔ اسی طرح اس کے بعد شعر میں واحد کا جمع (صحابی) اس طرح لکھا ہے۔

جمع اس کی یاد رکھ (اصحاب) ہے

اور جہاں الفاظ کے ہندی معنی دیے گئے ہیں وہاں اس کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ ہندی میں اس لفظ کو یہ کہتے ہیں یعنی اس کے یہ معنی ہیں

تیغ کی ہندی اگر تلوار ہے
فارسی پگڑی کی بھی دستار ہے
چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں
دود کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں

اس منظوم اور مختصر لغت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ہر لفظ کے ساتھ اردو' عربی' فارسی او ہندی الفاظ لکھ دیئے جاتے ۔ ہاں کلام موزوں کی مجبوریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جہان جہاں ان سے ممکن ہو سکا ہے مرزا غالب نے لفظ کے ہندی' فارسی اور عربی ہونے کی وضاحت کر دی ہے۔اس طرح غزل کا جب ذکر آتا ہے تو مرزا غالب نے غزل کے چند اشعار لکھ کر اس کی وضاحت مثال دے کر دی ہے۔

کس کو کہتے ہیں غزل ارشاد ہو
ہاں غزل پڑھیے سبق گر یاد ہو
صبح سے دیکھیں گے رستہ یار کا
جمعہ کے دن وعدہ ہے دیدار کا

اس طرح پانچ اشعار غزل کی بچے سے کہلوا کر (یعنی خود کہہ کر) بچے کو یوں داد دیتے ہیں

واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

پھر وہ لغت کی تدریس پر آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

لو سنو کل کا سبق آ جاؤ تم
پوزی (افسار) اور ڈیچی (پاردم)

غزل غالب کا محبوب صنف سخن ہے' اسی لیے شاید اس نظم کے آخر میں بھی پانچ اشعار لکھ گئے ہین حالانکہ وہاں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر غزل کی اہمیت جتانے کے لیے کہتے ہیں

پایا قادر نامے نے آج اختتام
اک غزل تم اور پڑھ لو والسلام
شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں
مانتا لیکن ہمارا دل نہیں

مگر اس غزل میں علم بقلم اور مدرسے کی بات کی ہے

علم ہی سے قدر ہے انسان کی
ہے وہی انسان جو جاہل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو رک رک کر سبق
ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

اس غزل کو پڑھ کر یہ بات بھی سامنے آ جاتی ہے کہ مرزا غالب غزل کو صرف عاشقانہ مضمون تک محدود کر دینا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس میں ہر طرح کے تجربے کے قائل تھے اور دیکھا جائے تو غزل مسلسل کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی ہے بلکہ غیر مردف غزل بھی لکھی ہے مثلاً دیوان غالب کی اس غزل میں مسلسل کو دیکھئے:۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

نظم 'قادر نامہ' چونکہ بچوں کی تدریس کے لیے لکھی گئی تھی اس لیے اس زبان کی بھی سادہ اور رواں ہے نیز اس میں اخلاقی اور علمی اور تدریسی انداز فکر کو اپنایا گیا ہے۔

☆......☆

علامہ اقبال

حمدیہ اور دعائیہ اشعار کے آئینے میں

علامہ اقبال کو جو اللہ سے جو محبت اور عقیدت تھی وہ محتاج بیان نہیں ان کی اللہ سے قربت اور خدا شناسی کا ایک انداز ان کی شہرہ آفاق نظموں شکوہ اور جواب شکوہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خودی کا جو فلسفہ پیش کیا وہ بھی خدا شناسی کا ایک ذریعہ ہے یعنی من عرفہ نفسہٖ فقد عرفہ ربہٗ کی تفسیر ہے۔ علامہ اقبال نے جب مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھی تو وہ بہت اداس اور رنجیدہ ہوئے اور اللہ تعالی سے نظم شکوہ کے انداز میں شکایت کی۔ پھر جواب شکوہ میں مسلمانوں کے زوال اور ان کی پسماندگی کا ذکر نہایت موثر اور پرسوز انداز میں کیا۔

علامہ اقبال کا شکوہ بھی اللہ سے بربنائے محبت اور عقیدت ہے۔ مگر شکوہ کرتے ہوئے بھی احترام کا جذبہ ان کے دل میں ہے پاس ادب نہ ہوتا تو وہ یہ ہرگز نہ کہتے ''شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو'' یہ نظم بھی اللہ تعالی سے مدد حاصل کرنے کا ایک انداز ہے۔ اگرچہ حالی کے بارے میں کہا جاتا کہ'' حالی نے زباں سے اف بھی نہ کی اقبال شکایت کر بیٹھے'' اقبال کا یہ جرأت مندانہ اظہار اللہ سے ان کی قربت اور عقیدت کا ہی مظہر ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت اگر غیر کے کاشانے پر ہے تو اس کے خاص بندے یعنی مسلمان اس نعمت سے کیوں محروم ہیں۔ دراصل یہ اقبال نے خداوند تعالی سے اس کی رحمت اور اس کے کرم کا تقاضہ کیا ہے اللہ تو بہت بڑا رحیم و کریم ہے۔ مگر اس سے ہم قربت کی وجہ سے تو'' تیرا تجھے کہہ کر بھی مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ ہمارا رب ہے ہم اس سے ہر انداز سے مانگتے ہیں اور کبھی کبھی یہ انداز شکایت کا بھی رنگ اختیار کر لیتا ہے اس

سلسلے میں ہم اپنے ماں باپ کی مثالیں بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ماں باپ سے بچہ کچھ نہ کچھ طلب کرتا رہتا ہے جب اس کی طلب پوری نہیں کی جاتی تو وہ مچل جاتا ہے' وہ ضد پر آ جاتا ہے اور اس کے مانگنے کا انداز بھی بدل جاتا وہ شکایت کرتا ہے اور شکایت کا انداز بھی بسا اوقات سخت ہو جاتا ہے۔ مگر بچہ یہ سب اس لیے کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے وہ جو طلب کر رہا ہے اس کو اس کے والدین ہی پورا کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی یہ ضد اور زبردستی سے حاصل کر لیتا ہے' اللہ تو سارے جہان کا رازق ہے' پروردگار ہے اس کی بخشش اس کی عطا اور کرم کا کوئی حساب نہیں۔

علامہ اقبال نے شکوہ میں جو انداز اختیار کیا اس سے کچھ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی اور بعض نے کفر کا فتویٰ بھی دے دیا مگر جب انہوں نے جواب شکوہ لکھا تو سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔

علامہ اقبال نے ویسے تو کوئی باقاعدہ حمد نہیں لکھی مگر ان کی شاعری میں جا بجا حمد یہ اشعار ملتے ہیں۔ ان کے زمانے میں شعری مجموعوں کی ابتدا میں یا عام طور پر حمد و نعت کا رواج ایک طرح سے نہیں کے برابر تھا۔ مرزا غالبؔ نے بھی کوئی باقاعدہ حمد اور نعت نہیں لکھی۔ مگر دیوان کا پہلا شعر جو ملتا ہے اس شعر پر انسان یعنی نقش فانی اللہ سے ہی مخاطب ہے۔ اس شعر کے بارے میں پروفیسر عطا کاکوی کہتے ہیں کہ یہ حمد یہ شعر ہے مگر شکایت کے انداز میں ہے۔ یعنی نقش اپنے نقاش سے' تصویر اپنے مصور سے شکایت کر رہا ہے کہ اس کو یعنی انسانی کو فانی کیوں بنایا گیا ہے۔ اقبال نے بھی اس موضوع پر اشعار کہے ہیں

خدا سے حسن نے ایک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا ہے فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمو اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

مذکورہ بالا آخری شعر میں علامہ اقبال نے فلسفہ حسن کو نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔

جیسا کہ پہلے میں لکھ چکا ہوں کے علامہ اقبال نے باقاعدہ طور پر حمد نہیں لکھی مگر حمد یہ اشعار ان کے اردو اور فارسی کے مجموعوں میں کثرت سے ملتے ہیں۔اس زمانے میں شعراء اپنے مجموعہ کلام کی ابتدا میں حمد و نعت کی شمولیت ضروری نہیں سمجھتے تھے مگر آج کل شعراء حمد و نعت پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں بلکہ حمد یہ اور نعتیہ مجموعے الگ الگ بھی شائع ہو رہے ہیں۔علامہ اقبال توحید اور رسالت کے زبردست قائل اور حامل رہے ہیں وہ اسلامی تعلیمات پر ایقان اور ایمان رکھتے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے خطبے میں یہ فرمایا تھا کہ ساری دنیا کے مسائل کا حل اسلام اور صرف اسلام ہے وہ مولانا رومی کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے۔وہی مولانا روم جن کے دیوان کو "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا گیا ہے" اور علامہ اقبال نے مولانا روم سے متعلق کیا ہے:

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت

علامہ اقبال کے کلام کی اصل روح توحید اور اسلامی تعلیمات ہے وہ خودی کو خدا سے قربت کا ذریعہ گردانتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

یعنی اللہ تعالی سے اتنی قربت حاصل کر لی جائے کہ مومن جو چاہے اسے حاصل ہو جائے وہ اس کے قائل ہیں کہ

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

علامہ اقبال نے فلسفۂ خودی کے متعلق لکھا ہے کہ ''مرد مسلم کو تخلقو باخلاق اللہ کی تفسیر بن جاتا ہے۔علامہ اقبال اس کی روشنی میں کہتے ہیں کہ اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرو۔اس کوشش میں (نعوذ باللہ) انسان خدا تو نہیں بنے گا بلکہ اس سے نزدیک تر ہو جائے گا۔پھر اس کے ارادے اور جذبات وہی ہو جائیں گے جو خدا چاہتا ہے۔وہ مومن بننے کی بھی چار شرائط پیش کرتے ہیں۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے انسان

انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔دنیا کو خوب تر بنانے کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے علامہ اقبال اس عمل کی روشنی میں انسان کو اللہ کا ایک طرح سے انباز بتاتے ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدم
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کے از زہر نوشینہ سازم

ان اشعار کے مطالعے کے وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ علامہ اقبال کی فلسفۂ خودی اور اللہ سے مومن کی قربت کو مدنظر رکھا جائے۔اس منظوم مکالمے کا مقصد یہ ہے کہ زمین تو اللہ کی ہے مگر انسان پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں جن کو اسے انجام دینا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں اللہ کو مختلف انداز سے یاد کیا ہے اور اللہ کی عظمت اور اس کی صفات کا ذکر کیا ہے۔ مسائل کا بھی ذکر ہے اور اللہ کی وحدانیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چند اشعار سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

☆

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

☆

ہے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی

☆

ارنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر
یہ حدیث کلیم و طور نہیں

☆

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

☆

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

☆

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہٰ میں ہے

☆

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

☆

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

☆

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا! خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات واضح ہے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو علامہ اقبال کے پیشِ نظر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

''الارض للہ'' علامہ اقبال کی ایک مختصر سی نظم ہے جس میں اللہ کی قدرت کا بیان اس طرح ہوا ہے۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ ساز گار

خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب

موسموں کے کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

اس طرح علامہ اقبال کی نظم 'لا الہ الا اللہ' جس میں خودی کے حوالے سے لا الہ الا اللہ کی تشریح کی گئی ہے اور خودی کی روح اور اس کا مرکز کلمۂ توحید کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ نظم بھی اس طرح سے حمد ذیل میں آتی ہے چند اشعار دیکھئے

خودی کا سرِ نہاں لا الہٰ الا اللہ

صنم کدہ ہے جہاں لا الہٰ الا اللہ

یہ مال دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند

بتانِ وہم و گماں لا الہٰ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زماں و مکاں کی زناری

نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہٰ الا اللہ

یہ نغمۂ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند

بہار ہو کہ خزاں لا الہٰ الا اللہ

اس طرح اپنے فارسی کلام میں بھی اللہ کی تعریف اور اس کی توصیف مختلف انداز سے کی ہے توحید کی تعلیم ہو یا اسلامی تعلیمات ان کا ذکر علامہ نے اپنے فارسی اشعار میں بھی موثر اور دلنشیں انداز میں کیا ہے۔ اسرار رموز میں وہ لا الہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

ملت بیضا تن و جاں لا الہٰ

ساز ما را پردہ گرداں لا الہٰ

☆

اہلِ حق را رمزِ توحید از براست
در آتی الرحمٰن عبداً مضمر است
(نظمِ توحید)

اس کے بعد علامہ اقبال نے مختلف سورتوں کے حوالے سے عشقِ الٰہی توحید اور اسلام کی تعلیم دی ہے۔ در تفسیر سورۂ اخلاص میں کہتے ہیں:

گفت تا کہ در ہوس گردی اسیر
آب و تاب از سورۂ اخلاص گیر

☆

گر بہ اللہ الصمد دل بستۂ
از حدِ اسباب بیروں جستۂ

لم یلد ولم یولد: میں کہتے ہیں

گر نسب را جزوِ ملّت کردۂ
رخنہ در کارِ اخوت کردۂ
ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلدو لم یولد است

اور ولم یکن لہ کفواً احد کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں

رشتہ بالمہ یکن باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم در نسازد با شریک
مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرت او بر نتابد ہمسرے

علامہ اقبال ان اشعار میں اگرچہ مسلمانوں سے مخاطب ہیں یعنی حمد کی طرح اللہ سے مخاطب نہیں ہیں مگر وہی باتیں کہہ رہے ہیں جو تعلیمات قرآنی ہیں۔

پیام مشرق: لالہ طور کے زیر عنوان جو قطعات یا رباعیات ہیں ان میں بھی اللہ کے وجود اور اس کی صفات کا ذکر انہوں نے اپنے انداز میں کیا ہے۔ مثلاً

شہید ناز او بزم وجود است
نیاز اندر نہاد ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب
بسیمائے سحر داغ سجود است

☆

دل من روشن از سوز درون است
جہاں بیں چشم من از اشک خون است
ز رمز زندگی بیگانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنون است

یہاں پر یہ عرض کردوں کہ اقبال کا فلسفۂ عشق دوسروں سے جداگانہ ہے ان کے یہاں عشق خدا سے محبت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

چند دیگر رباعیات بھی دیکھیے

بباغاں باد فروردیں دہد عشق
براغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است
بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

☆

دریں گلشن پریشاں مثل بویم
نمی دانم چہ می خواہم چہ جویم
بر آید آرزو یا برنیاید
شہید سوز و ساز آرزویم

☆

جہان مشت گل و دل حاصل اوست
ہمیں یک قطرہ خوں مشکل اوست
نگاہ ما دوبیں افتاد ورنہ
جہانِ ہر کسے اندر دلِ اوست

☆

نوائے عشق راساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ایں خوب تر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم

☆

خرد گفت او بچشم اندر نگنجد
نگاہِ شوق در امید و بیم است
نمی گردد کہن افسانۂ طور
کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

☆

تو خورشیدی و من سیارۂ تو
سراپا نورم از نظارہ تو

ز آغوشِ تو دورم نا تمام
تو قرآنی و من سیپارہ تو

☆

توی گوئی کہ من ہستم خدا نیست
جہانِ آب و گل را انتہا نیست
ہنوز این راز برمن نا کشود است
کہ چشم آنچہ بیند ہست یا نیست

ان حمدیہ اشعار کے بعد میں اب علامہ اقبال کی دعائیہ نظموں یا دعائیہ شاعری کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اقبال نے یوں تو ایک آدھ مناجات بھی لکھی ہے بعض لوگ ان کی دعا کو بھی مناجات کہتے ہیں۔ مگر یہ مناجات کی تعریف کی روشنی میں پوری نہیں اترتیں۔ سردست ان کی دعائیہ شاعری کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتا ہوں۔ دعا کے عنوان سے بھی ان کے یہاں کی نظمیں ملتی ہیں ان کی دعاؤں میں ایک دعا'' بچے کی دعا'' بھی ہے جو بہت مشہور دعا ہے مگر یہ ماخوذ ہے میری مراد اس دعا سے ہے جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

علامہ اقبال کی یہ دعا اگر چہ ماخوذ ہے مگر اس دعا کو اس انداز سے لکھا ہے کہ اس میں کہیں پر ترجمے یا اخذ کرنے کا شائبہ نہیں ہوتا ہے دراصل یہ اقبال کا شاعرانہ کمال ہے۔

علامہ اقبال نے یہ دعا اتنی ماہرانہ اور دلکش اور دلنشیں انداز میں لکھی ہے کہ اس کو ایک طرح سے اپنا لیا ہے اور یہ دعا بچوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ اسکے بعد ان کی ایک اور مشہور دعا ملتی ہے جو '' دعا'' کے ہی عنوان سے بانگ درا میں شامل ہے۔ وہ دعا بچوں کے لیے تھی تو یہ دعا عام مسلمانوں کے لیے ہے۔ اس دعا کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

اس دعا کا شمار ان کی بہترین دعاؤں میں ہوتا ہے اس میں علامہ اقبال کی آرزوؤں اور جذبات کی بہترین ترجمانی ملتی ہے۔وہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کو یاد کرتے ہوئے پھر اس کی آرزو کرتے ہیں کہ وہ سنہرا دور پھر لوٹ آئے مسلمان پھر سے دنیا میں سرخرو ہو جائیں۔

پھر وادی فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
رفعت میں مقاصد کے ہم دوش ثریا کر
خود داریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے
بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے

اس دعا کا اختتام بھی بڑے موثر انداز میں کرتے ہیں۔

میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

علامہ اقبال کو جوانوں سے بڑی امیدیں ہیں۔وہ جوان نسل کے اندر مرد مسلم کی خصوصیات دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ نوجوان نسل علم و آ گہی سے لیس ہو کر مصاف زندگی میں آگے بڑھیں اور ملک اور قوم کی قسمت بدل ڈالیں۔علامہ نوجوانوں کے لیے اس طرح دعا گو ہیں۔

جوانوں کی میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کردے

علامہ اقبال کی ایک مشہور دعا وہ بھی جو انہوں نے مسجد قرطبہ میں لکھی تھی اور جو ان کے مجموعہ 'کلام بال جبریل' میں شامل ہے۔ اس دعا کی ابتدا اس انداز سے ہوتی ہے:۔

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

اور آخر میں ان دعائیہ اشعار پر اس نظم کا اختتام ہوتا ہے

پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کر جام و سبو
چشم کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو خلوتیوں کے کدو
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کا گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لئے چار سو
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکے روبرو

مسجد قرطبہ کی شاندار عمارت۔ کے پیچھے ان مسلمانوں کا شاندار ماضی یاد آتا ہے اور پھر وہ اس کی تمنا کرتے ہیں کہ وہ مسجد جو ایک زمانے سے بے اذان ہے 'آباد ہو جائے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے مسجد قرطبہ میں ایک نظم لکھی ہے۔ جو نہ صرف ان کے جذبات اور احساسات کی آئینہ دار ہے بلکہ علامہ اقبال کی بہترین نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

اس مجموعے یعنی بال جبریل میں ان کی ایک اور مشہور دعا "طارق کی دعا" کے زیر عنوان ہے دراصل اندلس کے میدان جنگ میں حضرت طارق نے اللہ سے دعا کی تھی۔ اس دعا کو علامہ

اقبال نے نظم کے پیکر میں نہایت خوبصورتی اور موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔اس دعا میں طارق کے جذبات واحساسات جو تھے اس سے علامہ اقبال کما حقہ واقف ہیں مگر جو جذبات ایک مجاہد اور مومن کے ہو سکتے ہیں وہ یہی کچھ ہو سکتے ہیں جو علامہ اقبال نے اپنی اس دعائیہ نظم میں پیش کیا ہے اس دعا کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔یعنی حضرت طارق مجاہدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا سے مخاطب ہیں اور لشکر اسلام کی نصرت اور ان کی فتح یابی کے لئے یہ دعا کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کی ایک دعا فارسی میں ان کی فارسی کے مجموعہ کلام پیام مشرق میں شامل ہے۔یہ ایک مختصر دعائیہ نظم ہے جس میں صرف تین اشعار ہیں۔

اے کہ ازخم خانہ فطرت بجا مم ریختی
ز آتش صہبائے من بگداز مینائے مرا
عشق را سرمایہ ساز ازگرمی فریاد من
شعلۂ بیباک گرداں خاک سینائے مرا
چوں بمیرم از غبار من چراغ لالہ ساز
تازہ کن داغ مرا سوزاں بصحرائے مرا

اس طرح آخری شعر میں علامہ اقبال بعد مرگ بھی یہ آرزو کرتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان کی خاک سے لالہ کا چراغ روشن کرتا کہ یہ روشنی یعنی ان کا پیغام بعد مرگ بھی لوگوں تک پہنچتا رہے۔میں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کا خیال پیش کیا ہے۔

مرنے سے پہلے میں نے جلائے کئی چراغ
جاری ہے روشنی کا سفر میرے بعد بھی

ان کے فارسی مجموعہ ''زبور عجم'' میں بھی ایک دعا شامل ہے جس میں وہ شرح قلب کی دعا مانگتے ہیں۔یعنی اقبال اپنے سینے میں ایسا دل چاہتے ہیں جو باخبر ہو انہوں نے ایک جگہ خود کہا ہے

''دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کردوبارہ۔''

یارب درون سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ رانگرم آن نظر بدہ
سیلم مرا بجوئے تنگ مایہ پیچ
جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ
شاہین من بصید پلنگاں گزاشتی
ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
خاکم بہ نور نغمۂ داؤد بر فروز
ہر ذرہ مرا پر و بال شرر بدہ

یعنی اقبال اس دعائیہ نظم میں وسعت قلبی' وسعت نظری' عزم و حوصلہ اور اپنی قوت اور صلاحیتوں میں اضافے کی دعا مانگتے ہیں۔

جاوید نامہ میں صرف ایک نظم ایسی ملتی ہے جس کا عنوان انہوں نے مناجات رکھا ہے۔ یوں بعض مناجات اور دعا میں بڑا معمولی سا فرق ہے۔ اسی لئے بعض لوگ دعا کو مناجات اور مناجات کو دعا کہتے ہیں مناجات کے معنی عام طور پر لغت میں ''دعائیں مانگنے'' کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لغات میں مناجات کی تعریف اس طرح ملتی ہے ''وہ نظم جس میں خدا کی تعریف اور اپنی عاجزی کا اظہار کر کے دعا مانگی جائے'' اس طرح مناجات کا تعلق ذات اور شخصیت سے متعلق ہو جاتا ہے یعنی اس طرح یہ PERSONAL ہو جاتا ہے۔ دعا سے متعلق ہم کسی سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ میرے لیے دعا کریں مگر کسی سے یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ میرے لیے مناجات کریں۔ جاوید نامہ میں اقبال کی جو مناجات ہے اس کا آغاز انسان کی مشکلات کے اظہار سے ہوتا ہے۔

آدمی اندر جہان ہفت رنگ
ہر زماں گرم فغاں مانند چنگ
آرزوئے ہم نفس می سوزدش
نالہ ہائے دل نواز آموز دش

لیکن ایں عالم کہ آب و گل است
کے تواں گفتن کہ دارائے دل است

☆

ایں جہاں صید است و صیادیم ما؟
یا اسیرِ رفتہ از یادیم ما؟
زار نالیدم صدائے بر نخواست
ہم نفس فرزند آدم را کجاست

یہ دعا کئی بندوں پر مشتمل ہے۔ آخر میں علامہ اقبال خدا سے دعا کرتے ہیں کہ

آنیم من جاودانی کن مرا
از زمینی آسمانی کن مرا
ضبط در گفتار و کردارے بدہ
جادہ ہا پیداست رفتارے بدہ

☆

من کہ نومیدم زپیران کہن
دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

☆......☆

ٹیپو سلطان علامہ اقبال کی نظر میں

رجال اقبال میں ٹیپو سلطان کا نام نمایاں اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ اقبال جن عظیم شخصیتوں سے متاثر ہوئے اور ان پر نظمیں یا اشعار کہے ہیں یا ان کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے ان میں ٹیپو سلطان نمایاں اور منفرد ہیں۔ علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کو حریت' شجاعت' قومی حمیت و غیرت اور خودداری کا استعارہ قرار دیا ہے۔ وہ ٹیپو سلطان کو ایک زبردست اسلامی سپاہی یا مجاہد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے شعری مجموعہ ''ضرب کلیم'' میں پانچ اشعار پر مشتمل ایک نظم ''سلطان ٹیپو کی وصیت'' لکھی ہے اگرچہ یہ نظم مختصر ہے مگر یہ بہت ہی پرسوز اور دل پذیر نظم ہے۔ یہ نظم نہ تو ٹیپو سلطان کا قصیدہ ہے اور نہ مرثیہ' بلکہ اس نظم میں علامہ اقبال نے ان اصولوں کی وضاحت اور تشریح کی ہے جن پر یہ مرد مومن یعنی ٹیپو سلطان ساری زندگی کاربند رہا۔ علامہ اقبال جانتے اور سمجھتے تھے کہ ٹیپو سلطان اگرچہ دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے مگر قوم کو زندگی بخش پیغام دے گئے ہیں۔ ٹیپو سلطان جن اصولوں پر قائم رہے اور جس جرأت اور شجاعت سے فرنگی فوجوں کا مقابلہ کیا ان کے انہیں جذبات اور جاں نثاری کی تشریح کی گئی کیوں کہ ان ہی زریں اصولوں کو اپنا کر اور ان پر قائم رہ کر ہند کے مسلمان آزادی حاصل کر سکتے ہیں علامہ اقبال چاہتے تھے کہ مسلمانانِ ہند ٹیپو کی سیرت اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے مقصد کو اسی عزم و ولولے اور حوصلے کے ذریعے حاصل کریں اور وہ سیاست فرنگ کے فریب میں نہ آئیں۔

علامہ اقبال کے نزدیک اس مرد حر کی زندگی سیلاب کفر کے مقابلے میں ایک بند تھی جو اس علاقے کی حفاظت کر رہا تھا مگر افسوس کہ ۱۷۹۹ء میں یہ بند میر صادق اور چند دوسرے غداروں

کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور کفارِ فرنگ کے سیلاب نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ٹیپو سلطان کا اصل نام فتح علی خان تھا۔ ٹیپو کے معنی ہوتے ہیں چیتا' وہ واقعی شیر تھا۔ اس سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے باپ حیدر علی کے کوئی بچہ نہ ہوا' اس نے دکن کے ایک مشہور ٹیپو مستان شاہ کے مزار پر جا کر دعا مانگی۔ خدا نے بچہ دیا تو فتح علی خان کے علاوہ حصول برکت کی نیت سے اسے ٹیپو سلطان کہنا شروع کر دیا اور یہی نام مشہور ہو گیا اس کا یہ نام اسم با مسمیٰ ہے' یعنی وہ بہادر بھی تھا اور مرد مومن بھی۔ ٹیپو ۱۷۸۲ء میں باپ کے انتقال کے بعد میسور کا فرماں روا بنا جو آخری دور میں دکن کی سب سے بڑی' سب سے اچھی اور سب سے طاقت ور سلطنت تھی۔ ٹیپو سلطان کو والد کی میراث میں سلطنت کے ساتھ ساتھ انگریز دشمنی بھی ملی تھی۔ سلطان نے اندر اور باہر کی ہر قوت کو فرنگی کے انسداد کیلئے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر اس کا کسی نے ساتھ نہ دیا اور وہ اکیلا رہ گیا یہاں تک کے مرہٹے اور نظام بھی دشمنوں سے مل گئے تو ٹیپو نے اپنی جان کی بازی لگا دی اور انگریزوں کے خلاف بہادری سے لڑتے ہوئے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو شہید ہو گئے اور یہ ثابت کر دیا جو وہ کہا کرتا تھا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' اور اپنے خون شہادت سے اس قول پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

دراصل علامہ اقبال ٹیپو کے اس عزم و حوصلے کا سبق اپنی ملت کو دینا چاہتے تھے اور اسی لئے مذکورہ بالا نظم لکھی۔ ٹیپو سلطان کی وصیت کے یہ چند اشعار دیکھئے جس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال ٹیپو کی زبانی یہ پیغام دینا چاہتے تھے جو دراصل ایک مجاہد کی زندگی کا زندگی بخش پیغام ہے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

ان اشعار کا مطلب مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کے دل عشق سے مخمور ہوں وہ دنیا کی کسی چیز سے دل نہیں لگاتے اور بڑی سے بڑی نعمت اور دولت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اے پانی کی ندی یعنی تو نے اپنی زندگی کو ایک چھوٹی سی نہر سمجھ رکھا ہے یعنی اسے محدود کر دیا ہے۔ اپنی سوچ اور فکر کے دائرے کو وسعت دے اور بڑھ کر ایک بحر بیکراں ہو جا۔

باطل کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ طاقتور انسان یا قوم کی اطاعت بھی کرو اور حق کی تلقین یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ مسلمان کبھی شرک اختیار نہیں کر سکتا وہ کبھی منافقت نہیں کر سکتا۔

ٹیپو سلطان کی زندگی ہمیں جہد مسلسل کا سبق دیتی ہے۔ ٹیپو سلطان وہ مرد آہن تھا جو ٹوٹ تو سکتا تھا مگر جھک نہیں سکتا تھا آپ میں سے اکثر نے ارنسٹ ہمنگ وے کا ناول The oldman and sea پڑھا ہوگا۔ اس ناول پہ نوبل پرائز بھی ملا تھا اس ناول کا تھیم یہ ہے کہ A men can be destroyed but can not be defeated مگر ٹیپو سلطان کے سامنے صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بڑا مقصد تھا یعنی منافقوں اور دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہادت کا درجہ حاصل کر لیا جائے چنانچہ وہ شیروں کی طرح دشمنوں پر جھپٹا اور بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا اگر اپنے لوگ اس سے غداری نہ کرتے تو میدان جنگ کا نقشہ بدل کر رہ جاتا مگر اس کے دشمنوں میں بروٹس بھی تھا جو عین موقع پر دشمنوں کی صف میں پیش پیش تھا گویا۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یہ وہ غدار اور منافق اور غدار لوگوں سے آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کو بھی شکایت تھی ان کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہوا۔ دیکھئے بہادر شاہ کس حسرت اور تاسف کے ساتھ کہتے ہیں کہ

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

علامہ اقبال نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام یعنی 'جاوید نامہ' میں تقریباً آٹھ صفحات اس مردِ مومن یعنی ٹیپو سلطان کے ذکرِ جمیل کی نذر کیے ہیں۔ جاوید نامہ علامہ اقبال کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے یہ انکی ایک مشہور مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں سیر افلاک کے ذریعہ انہوں نے اپنا فلسفۂ حیات اور اپنے دور کے بعض اہم سیاسی و اجتماعی تحریکوں نیز ملت اسلامیہ کے حقائق اور مسائل پر اپنا نقطۂ نظر ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نظم کو انہوں نے ایک طرح سے طربیہ الٰہی (Divinecomedy) کہا ہے۔ اور اس مثنوی پر ان کو بجا طور پر فخر بھی ہے۔ کتاب کا ابتدائیہ جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے شاعر فضا کے نیلگوں کی سیر کا آغاز کرتا ہے۔

طربیہ الٰہی (Divinecomedy) میں ورجل دانتے کی رہنمائی کرتا ہے مگر یہاں پیر رومی علامہ اقبال کے رہنما ہیں۔ وہ ان کی رہنمائی میں مختلف افلاک کی سیر کرتے ہوئے فلک زحل پر پہنچتے ہیں یہاں پر اس بات کی وضاحت کردوں کہ زحل اس ستارے کا نام ہے جو ساتویں آسمان پر ہے اور نہایت سست رو اور نحس اکبر خیال کیا جاتا ہے۔ مثنوی کے اس حصے میں علامہ اقبال کے فلک زحل کا جو منظر دکھایا ہے وہ بہت مہیب خوفناک اور عبرت ناک ہے۔ اس فلک کے حوالے سے علامہ اقبال نے بتایا ہے کہ "رذیل روحیں جنہوں نے ملک وملت سے غداری کی اور جن کو دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا وہ یہاں پر ہیں" نظم کے اس حصے میں علامہ اقبال کا وہ شعر بھی ملتا ہے جو انہوں نے ان غداروں کے حوالے سے کہا ہے اور اب یہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

فلک زحل تمام مقامات سے بالکل مختلف ہے۔ مولانا روم اسے مطرود و مردود کے نام سے یاد کرتے ہیں جہاں تاریکی نے چھاؤں ڈال رکھی ہے اور ایک لاکھ فرشتے مسلسل اس پر بجلی کے کوڑے مارتے ہیں اور اس طرح قہر الٰہی کے اظہار میں پیہم مصروف ہیں۔ یہاں ارواح رذیلہ کا

بسیرا ہے جنہوں نے ملک وملت سے غداری کی اور جن کو دوزخ نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یعنی میر جعفر اور میر صادق ان دونوں غداروں کو ایک نہایت ہیبت ناک فضا میں دکھلایا گیا ہے۔ طوالت کے خوف سے بہت سے اشعار حذف کر رہا ہوں صرف ان اشعار کا حوالہ دیتا ہوں جہاں اقبال کے کلام کا اختتام ہوتا ہے

ملتے راہر کجا غارت گریست
اصل او از صادقے یا جعفریست
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں جہاں

ترجمہ:۔ جہاں کہیں بھی کسی ملت کا کوئی غارت گر ہے اس کی اصل کسی صادق یا کسی جعفر سے ہے یعنی غدار ہی ملت کی تباہی کا باعث بنتا ہے، جعفری روح سے خدا کی پناہ ہے آج کے دور کے جعفروں (غداروں) سے اللہ کی پناہ ہے۔ مولا کریم ان کو تباہ کر دے ملک بچالے)۔

اس کے بعد علامہ اقبال کا سفر مشرق کے بادشاہوں یعنی نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے محلوں کی طرف ہوتا ہے۔ علامہ اقبال ان دونوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان سے متعلقہ صرف دو اشعار کا حوالہ ضروری سمجھتا ہوں۔

نادر آں دانائے رمز و اتحاد
با مسلماں داد پیغام وداد

(ان میں سے ایک تو نادر ہے جو اتحاد کی رمز سے آشنا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو محبت اور دوستی کا پیغام دیا)

مرد ابدالی وجودش آیتے
داد افغاں را اساسِ ملتے

(دوسرا احمد شاہ ابدالی ہے جس کا وجود ایک مثالی وجود ہے اس نے افغانیوں کو ایک ملت کی

بنیاد سے آگاہ کیا کہ تمام مسلمان متحد ہو کر رہیں)

چند اشعار کے بعد علامہ اقبال ٹیپو سلطان کی عظمت کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

آن شہیدانِ محبت را امام

آبروئے ہند وچین و روم شام

(تیسرا بادشاہ محبت کے شہیدوں کا امام ہے۔ ہند وچین روم اور شام کی آبرو تھا)

نامش از خورشید و مہر تابندہ تر

خاک قبرش از من و تو زندہ تر

(اس کا نام سورج اور چاند سے بھی زیادہ روشن ہے۔ اس کی قبر کی مٹی مجھ سے اور تم سے بھی زیادہ زندہ ہے)

عشق رازے بود بر صحرا نہاد

تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد

(عشق ایک راز تھا جو اس نے صحرا پر رکھ دیا یعنی وہ راز عام کر دیا تجھے علم نہیں کہ اس (ٹیپو) نے اپنی جان کس قدر شوق و جذبے سے قربان کی تھی)

از نگاہِ خواجۂ (ﷺ) بدر و حنین

فقر سلطاں وارث و جذب حسینؓ

(بدر و حنین کے خواجہ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں کسی سلطان/ بادشاہ کا فقر جذبۂ حسینؓ کا وارث ہے)

رفت سلطان زیں سرائے ہفت روز

نوبت او در دکن باقی ہنوز

(سلطان ٹیپو اگرچہ اس مادی دنیا سے رخصت ہو گیا ہے لیکن اس کا ڈنکا ابھی تک دکن میں بج رہا ہے اور یہ اس کی حیاتِ جاوید کی علامت ہے یعنی

A man Lives in deedsandnot in years.

ایقان تھا عمل پر ایام پر نہیں
حسنِ عمل سے زندہ و جاوید ہوگیا

مندرجہ بالا اشعار کے بعد سے سلطان شہیدؒ زندہ رود یعنی علامہ اقبال سے مخاطب ہوکر پوچھتے ہیں۔

باز گو از ہند و از ہندوستاں
آن کہ باکاہش نیرزد بوستاں

(ہندوستان کے بارے میں ہمیں بتاؤ وہ ہندوستان جس کے ایک تنکے کے برابر بھی) بوستان کی قدر و قیمت نہیں ہے۔

آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد
آنکہ اندر دیر او آتش فسرد

(وہ ہندوستان آج جس کی مسجدوں میں مومنانہ ہنگامے مٹ چکے ہیں وہ ہندوستان جس کے مندروں میں آگ بجھ گئی ہے۔)

آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم
آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم

(وہ ہندوستان جس کے لئے ہم نے اپنا دل خون کرلیا ہے وہ ہندوستان جس کی یاد کو ہم نے اپنے دل میں پالا ہے)

از غم ما کن غم اورا قیاس
آہ ازاں معشوق عاشق ناشناس

(تو ہمارے غم ہی سے اس (ہندوستان) کے غم کا اندازہ کرلے۔اس عاشق کو نہ پہچاننے والے معشوق پر افسوس ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے اصل خیر خواہ تو ہم ہیں ان سوالوں یعنی اشعار کے جواب میں علامہ اقبال کہتے ہیں:۔

ہندیاں منکرز قانونِ فرنگ
درنگیرد سحر و افسونِ فرنگ

(اہل ہند فرنگی قانون کے منکر ہو گئے ہیں۔ اب انگریزوں کا سحر اور جادو ان پر اثر نہیں کر رہا ہے)

روح را بارگراں آئین غیر
گرچہ آید آسماں آئین غیر

(غیروں کا کام آئین روح کے لئے بھاری بوجھ ہے اگر چہ غیر کا آئین آسمان سے آیا کیوں نہ ہو)

اس طرح سوال وجواب کا سلسلہ آگے تک چلتا رہتا ہے' ان اشعار میں ٹیپو سلطان شہید کے حب الوطنی کے جذبات بھی موجزن ہیں۔ ٹیپو سلطان جو ہندوستان کو ایک آزاد ملک دیکھنا چاہتے تھے اور اسے غداروں سے نجات دلانے کی کوشش میں عمر کا ایک ایک دن صرف کر دیا۔ ٹیپو سلطان کو جہاں اپنی سرزمین یاد آتی ہے وہاں وہ 'کاویری' ندی کو بھی شدت سے یاد کرتے ہیں۔

اس نظم میں علامہ اقبال کے ٹیپو کی زبان سے حقیقت حیات و مرگ اور شہادت کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ دریائے کاویری جو ٹیپو کے لئے ایک زمزمۂ محبت ہے اس کو بہت دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔

رودکاویری یکے سرکم خرام
خستہ ای شاید کہ از سیرِ دوام
در کہستاں عمرہا نالیدہ ای
راہ خود را بامژہ کاویدہ ای
اے مرا خوشتر زجیحوں و فرات
اے دکن را آب تو آب حیات

اس نظم کے شعر نمبر ۲۷ میں ٹیپو کا وہ قول ہے جس پر اس نے عمل کر کے دکھا دیا وہ شعر یہ ہے

زندگی را چیست رسم و دیں کیش
یک دم شیری بہ از صد سالہ میش

(زندگی کے لئے رسم و دین اور مسلک کیا چیز ہے۔ یہ شیر کا ایک پل زندہ رہنا اور گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے)

اس نظم میں اکتالیس (۴۱) اشعار ہیں جس میں کاویری ندی کو مخاطب کر کے ٹیپو سلطان نے فلسفہ حیات و ممات اور شہادت کی حقیقت کو پیش کیا ہے۔

ٹیپو نے اپنے ملک اور قوم کے لئے اپنے جان اور مال اور سلطنت کی قربانی دے کر وہ مثال قائم کی ہے جس کی نظیر اور کہیں مشکل سے ملے گی۔

ٹیپو کی زندگی کا چراغ ۴ مئی ۱۷۹۹ء میں بجھ گیا مگر اس نے اپنے خون سے آزادی کی جو شمع روشن کی وہ تا دیر روشن رہی اور یہ شمع لوگوں کے جذبہ آزادی کو منور اور مہمیز کرتی رہی گی۔

مرنے سے پہلے میں نے جلائے کئی چراغ
جاری ہے روشنی کا سفر میرے بعد بھی

ٹیپو کی زندگی اور شہادت سے ہمیں جو پیغام ملتا ہے اسے ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ
Live Like Tipu & Die like Tipu

آخر میں اس بات کا بھی اظہار کر دوں کہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں ٹیپو سلطان شہید کے مزار پر حاضری دی تھی اور فاتحہ خوانی بھی کی تھی اور اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا تھا:۔

اے سرنگاپٹم اے عہد کمال حیدری
ہے امانت تجھ میں تصویر جلال حیدری
اے شہید اے مردِ میدانِ وفا تجھ پر سلام
تجھ پہ لاکھوں رحمتیں لا انتہا تجھ پر سلام

☆......☆

علامہ اقبال بچوں کے شاعر کی حیثیت سے

دنیا کی کوئی بھی زبان بچوں کے ادب سے خالی نہیں ہے۔ ہر زبان میں بچوں کے ادب پر کچھ نہ کچھ ادبی سرمایہ کی ضرور ملتا ہے' کسی بھی ملک کا سب سے بڑا سرمایہ اور اس کی سب سے بڑی دولت اس کے بچے ہوتے ہیں لہذا بچوں کی تربیت اور ان کی کردار سازی کے لئے دنیا کے بہت سے شعراً اور ادباً نے نظموں' قصوں اور کہانیوں کی شکل میں اپنی گراں قدر تخلیقات پیش کی ہیں جن میں سے بیشتر تخلیقات کو ہم' کثیر المقاصد ادب' بھی کہہ سکتے ہیں یعنی وہ تخلیقات بچوں کی تفریح کے لئے بھی معرض وجود میں آئی ہیں اور ان میں اخلاقی نکتے بھی پیش کئے گئے ہیں ساتھ ہی ساتھ معلومات موضوعات کو بھی سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج کے بچے کل کے جوان ہوں گے۔ ان پر ہی قوم و ملک کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوگا' اسی لئے تو ولیم ورڈز ورتھ نے کہا تھا Child is the father of man یعنی آج کا بچہ کل آنے والی نسل کا باپ ہوگا۔ اس لئے بچوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ بچوں کے ادب کا سرمایہ کسی زبان میں زیادہ ہے اور کسی زبان میں کم۔ اردو زبان بھی ان زبانوں میں شامل ہے جس میں بچوں کا ادب اور بالخصوص معیاری ادب اطمینان بخش نہیں ہے۔ یوں تو اس موضوع پر کچھ نہ کچھ تقریباً سارے ادیبوں نے لکھا ہے مگر بچوں کے اچھے ادیب اور شاعر اتنے کم ہیں کہ ان کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ بچوں کے شاعر کی حیثیت کے ایک نمایاں نام اسمٰعیل میرٹھی کا ہے۔ جنھوں نے صرف یہ کہ بچوں پر اور بچوں کے لیے لکھا ہے بلکہ بہت عمدہ لکھا ہے۔ میں ان کو بچوں کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں موجودہ دور میں بچوں کے متعلق بہت سے شعراء لکھ رہے ہیں۔ ان کو انعامات سے بھی

نوازا جارہا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے ان کو گراں قدر انعامات دیئے جارہے ہیں صدارتی تمغے اور دیگر انعامات بھی دیئے جارہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک شاعر تنویر پھول کو گورنر سندھ کی طرف سے انعام میں ایک بڑی رقم یعنی ایک لاکھ روپے کا انعام ملا ہے ان کو صدارتی انعام بھی ملا ہے اب دوسرے لوگ بھی اس طرف راغب ہورہے ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی نے نہ صرف بچوں کے لیے پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں بلکہ ایک نظم میں تو انہوں نے سائنسی موضوعات پر بھی اشعار کہے ہیں اگر ہم ان کو بچوں کے ادب کا باوا آدم کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ جس طرح منشی پریم چند نے اردو میں افسانہ نگاری کی باقاعدہ ابتدا کی ہے اور اسے بلند مقام تک پہنچادیا وہی کارنامہ اسمٰعیل میرٹھی نے انجام دیا۔ اسمٰعیل میرٹھی نے شعوری طور پر بچوں کے لئے باقاعدہ نظم نگاری کی اور ایسی معیاری اور پیاری پیای نظمیں لکھیں کہ جن کی چمک چمک اور آب تاب آج بھی قائم ہے اور ان کی مقبولیت میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔

اسمٰعیل میرٹھی کے بعد دوسرا اہم نام علامہ اقبال کا آتا ہے جنہوں نے بچوں کے ادب پر بھی خصوصی توجہ دی اور بچوں کے متعلق اور بچوں کے لئے بڑی عمدہ اور پیاری نظمیں تخلیق کیں، ان کے علاوہ اس دور کے دوسرے شعراء نے بچوں کے ادب پر کوئی توجہ نہیں دی کیوں کہ ایک آدھ نظمیں اگر کسی نے غیر شعوری طور پر بچوں کے لئے لکھ دیں تو ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

اگر چہ علامہ اقبال کا خاص موضوع بچوں کا ادب نہیں تھا مگر انہوں نے بہت سی کامیاب اور عمدہ نظمیں لکھ کر بچوں کے ادب کا دائرہ وسیع کردیا۔ سب جانتے ہیں کہ اقبال کی شخصیت بڑی متنوع اور پہلودار تھی وہ شاعر، ادیب، فلسفی، ماہر نفسیات، قانون دان، مصلح، ماہر تعلیم غرضیکہ بہت کچھ تھے انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ آج کے بچے کل کے ذمہ دار شہری ہوں گے اور ملک وملت کی کشتی کی پتوار ان کے ہاتھوں میں ہوگی۔ اس لئے انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا جائے۔ وہ نفسیاتی رموز سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے تھے

وہ چاہتے تھے کہ بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے اور اس طرح مناسب انداز میں ان کی پرورش اور پرداخت ہو ان کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں ان کی نفسیات اور تعلیمی نفسیات کا بھی خیال رکھا جائے نیز نفسیاتی تقاضوں کے عین مطابق ان کی تعلیم وتربیت ہو چنانچہ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال نے اس موضوع پر اشعار کہے۔

علامہ اقبال نے جو نظمیں بچوں کے لئے لکھی ہیں ان کو ہم تین شقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلی شق میں وہ نظمیں آتی ہیں جن کا موضوع انہوں نے بچوں کو بنایا ہے اور جو صرف بچوں کے مطالعہ کے لئے لکھی گئی ہیں۔ دوسری شق میں وہ نظمیں آتی ہیں جن میں بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے ان میں بچوں کی خصوصیت' ان کی عادات وخصائل ان کی جبلت ان کی فطرت اور ان کے جذبات کو پیش کیا گیا ہے۔ تیسری شق میں انگریزی سے ترجمہ شدہ نظمیں ہیں ان میں بھی دونوں طرح کی نظمیں شامل ہیں۔ علامہ اقبال نے چند اہم انگریزی نظموں کا ترجمہ کر کے بچوں کے اردو ادب میں اضافہ کیا ہے اس طرح نئی نسل کو انگریزی ادب کی چند مشہور نظموں سے استفادہ کرنے کا موقع میسر آ گیا اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی ایک اچھی روایت کا آغاز ہو گیا۔

پہلی قسم کی نظموں میں جن کو میں نے پہلی شق میں رکھا ہے ان پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ان میں ایک مکڑا اور مکھی'، ایک پہاڑ اور گلہری' ہمدردی' بچے کی دعا وغیرہ جیسی مشہور اور مقبول نظمیں شامل ہیں جبکہ دوسری شق میں بچہ اور شاعر' ماں کا خواب' طفل شیر خوار' بچہ اور شمع جیسی عمدہ نظمیں ملتی ہیں۔ مگر ان تینوں قسموں کی نظموں میں جو قدر مشترک ملتی ہے وہ ہے اخلاقی اور اصلاحی پہلو شاعر کا مقصد بچوں کی اخلاقی تربیت اور ان کی کردار سازی ہے شاعر نظموں کے ذریعے بچوں کی شخصیت کی تعمیر چاہتا ہے۔ وہ ان کی متوازن نشوونما کا خواہاں ہے۔ چنانچہ اسی مقصد جلیلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال نے بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔ علامہ اقبال اس نکتے سے اچھی طرح واقف تھے کہ جو بات کہانی کے انداز میں اور خاص طور پر نظم کی شکل میں پیش کی جائے اس کے

اثرات جلد اور دیر پا ہوتے ہیں چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے کہانی کے انداز میں علم وحکمت کی باتیں پیش کیں۔ چنانچہ شعر کے وسیلے سے وہ کہیں پند ونصیحت کرتے ہیں اور کہیں زندگی کے ادب واقدار سے بچوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ بچے منظوم قصے شوق سے پڑھتے ہیں اور اسی طرح سبق آموز نظموں سے سبق اور عبرت حاصل کرتے ہیں اور اخلاق وحکمت سے بھی انکی واقفیت اس وسیلے سے ہوجاتی ہے۔ علامہ اقبال علم وحکمت اور اخلاقی باتیں نہایت دلنشیں اور موثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں تاکہ بچے ان کو دلچسپی سے پڑھیں اور ان نظموں سے حسب استعداد اور توفیق استفادہ کریں۔ اس لئے مطلوبہ مقاصد کے حصول اور ان کی تکمیل کے لئے انہوں نے منظوم کہانیوں کا سہارا لیا ہے جیسا کہ ان کے پیر معنوی مولانا روم نے کیا ہے اور کہا بھی ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں ☆ گفتہ آید در حدیث دیگراں

علامہ اقبال نے بچے کی دعا میں ایک بچے کی زبان سے جو باتیں کہلوائی ہیں اور اس کی جن خواہشات کا اظہار دعا کی شکل میں ہوا ہے وہ ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ نظم ماخوذ ہے مگر علامہ اقبال نے اس نظم میں اس انداز میں لکھا ہے کہ ماخوذ نظم معلوم نہیں ہوتی۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ ہر مدرسے میں یہ نظم بچوں سے پڑھوائی جاتی تھی۔ یہ ایسی دعا ہے کہ اگر بچے کے دل کی دھڑکن بن جائے اور ہر بچے کے اندر یہی خواہش اور تمنا پیدا ہوجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے بچے کل ملک وقوم کے روشن چراغ نہ بن جائیں اور اس بات میں تو ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ انہیں ننھے منے چراغوں سے آئندہ ملک میں روشنی پھیلے گی اور ظلمت اپنے اختتام کو پہنچے گی اور انہیں کے ذریعے ملک سے جہالت' مفلسی اور پستی دور ہوسکے گی۔ اسی طرح نظم ہمدردی (جو ولیم کوپر کی نظم سے ماخوذ ہے) میں جگنو کی وساطت سے خدمت خلق کی تعلیم دی ہے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے ☆ آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اس شعر پر نظم کا خاتمہ ہوتا ہے اور یہی اس نظم کا بنیادی تصور یا مرکزی خیال ہے۔

علامہ اقبال اپنی نظم 'پرندے کی فریاد' میں ایک گرفتار اور مجبور پرندے کے کرب کا اظہار نہایت دلنشیں اور موثر انداز میں کیا ہے اس حقیقت کا اظہار ایک معصوم پرندے سے کراتے ہیں تا کہ بچوں کو اس کے دکھ درد کا احساس ہو اور وہ بھی آزادی کی نعمت کو سمجھ سکیں اور آزادی کی قدر کر سکیں۔ یہ بڑی عمدہ نظم ہے۔ سادگی میں حسن اور اثر ہے۔ اس نظم کے ذریعہ اقبال یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ پرندے بھی انہی کی طرح جان رکھتے ہیں انکو بھی آزادی پسند ہے۔ قید اور غلامی ان کو بھی پسند نہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ بچے پرندوں کو پکڑنا اور ان سے کھیلنا پسند کرتے ہیں بلکہ کھیلتے کھیلتے جب ان کا جی بھر جاتا ہے تو ان کی گردن بھی مروڑ دیتے ہیں۔ اس مشاہدے کو شاہین غازی پوری نے بھی اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔ ان کے بچے فیصل نے ایک پرندے کو پکڑا تھا اور اس سے کھیلتا رہا مگر جب اس کا جی بھر گیا تو پرندے کو مار دیا

چڑیے سے کھیلتا رہا فیصل تمام دن
جی بھر گیا تو مار دیا اس کو جان سے

اس طرح علامہ اقبال کی وہ نظمیں جو بچوں کے نفسیاتی مطالعہ اور ان کی عادات اور جذبات کے مشاہدے کے بعد لکھی گئی ہیں ان کی افادیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "ماں کا خواب" (یہ نظم بھی ماخوذ ہے مگر اقبال نے اس نظم کو اس طرح لکھا ہے کہ کہیں پر بھی اخذ کرنے کا گماں نہیں گزرتا بلکہ یہ ان کی اپنی نظم معلوم ہوتی ہے) کو دیکھئے اس نظم میں علامہ اقبال نے بڑی خوبی کے ساتھ ماں کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ بچے کی جدائی میں ماں کا اضطراب اس کی گریہ وزاری اور بچے کے جواب کو بڑے موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے اور آخر میں علامہ اقبال نے اپنا فلسفہ بچے کی زبانی اس طرح پیش کیا ہے

رُلاتی ہے تجھ کو جدائی مری ☆ نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر چپ رہا ☆ دیا پھر دکھا کر وہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے ☆ ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

اس طرح وہ اپنی نظم "طفل شیر خوار" میں یہ نفسیاتی نکتہ پیش کیا ہے کہ بچہ اکثر قلم یا چاقو سے کھیلنا پسند کرتا ہے۔ چاقو سے زخمی بھی ہو سکتا ہے اور قلم کی نوک سے بھی اسے نقصان پہنچ سکتا ہے اسی لئے شاعر کہتا ہے:۔

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلّا تا ہے تو
مہرباں ہوں میں مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو
پھر پڑا روئے گا اے نووارد اقلیم غم
چبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم
کیوں دُکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

بانگِ درا میں اقبال کی ایک نظم "عہدِ طفلی" کے عنوان سے ہے اگر چہ یہ نظم بچوں کے لئے نہیں لکھی ہے مگر یہ نظم بچوں ہی سے متعلق ہے۔ یعنی اس نظم میں شاعر اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں بچپن کی یاد تازہ کر دی ہے۔ بچے سوالات کرتے ہیں۔ استفساران معصوم ذہنوں میں بھی ہوتا ہے بچوں کا چاند سے بہلنا یا چاند سے بچوں کو بہلانا ایک عام شیوہ رہا ہے نیز شاعر نے اس نظم میں بچوں کے استعجاب و حیرت کو نہایت دلنشیں اور موثر انداز میں پیش کیا ہے

دورِ طفلی میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیر در میں لطف آتا تھا مجھے

اس شعر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں ماضی کی طرف سفر کرنا پڑ گا یعنی اس دور میں عام طور پر مائیں بچوں کو بہلانے کے لئے اس طرح کا عمل کرتی تھیں۔ اب اگر چہ دور اور اس کی ضروریات بدل گئی ہیں مگ ایک زمانہ تھا جب مائیں اور گھر والے بچوں کو چاند دکھا کر اس کا دل بہلاتی تھیں اور چاند سے متعلق گیت گا کر ان کا دل بہلاتی تھیں۔ چاند کو چندا ماما کہا جاتا تھا چاند کے حوالے سے علامہ اقبال کے یہ اشعار دیکھئے

تکتے رہنا وہ پہروں تک سوئے قمر

وہ پھٹے بادل میں بے آواز پا اس کا سفر

پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ وصحرا کی خبر

اور وہ حیرت دروغ مصلحت آمیز پر

آنکھ وقفِ دید تھی لب مائل گفتار تھا

دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استفسار تھا

چاند حسن وجمال کا استعارہ عاشقوں کے لئے بھی رہا ہے اور یہ ننھے معصوم بچوں کی دلبستگی کا سامان بھی رہا ہے۔ چاند کے بارے میں بچوں کو ان کی نانی اور دادی مختلف طرح کی کہانیاں سناتی تھیں بچہ ان کو حیرت سے سنتا تھا۔ اگر چہ انکی حقیقت کچھ نہ تھی مگر بچہ حیرت اور دلچسپی سے انکی طرف دیکھتا بھی تھا اور من گھڑت کہانیاں شوق سے سنتا بھی تھا۔ انہیں باتوں کو علامہ اقبال نے اس نظم میں بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور یہ کہہ کر اس دروغ گوئی کا پردہ بھی فاش کر دیا ہے۔

پوچھنا رہ رہ کے اسکے کوہ وصحرا کی خبر

اور وہ حیرت دروغ مصلحت آمیز پر

علامہ اقبال کی ایک نظم مکڑی اور مکھی ہے۔ جو ماخوذ ہے کسی انگریزی نظم سے جس میں لالچ کے نقصانات کو واضح کیا گیا ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ خوشامد ایک ایسا روحانی مرض ہے جو عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ان کی ایک نظم "ایک پہاڑ اور گلہری" ہے یہ نظم بھی ماخوذ ہے جس کا شاعر ایمرسن ہے اس نظم میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ خدا نے جس چیز کو بنایا ہے اس میں کوئی نہ کوئی مشیت پنہاں ہے، بڑی چیز بھی کام کی ہوتی ہے اور چھوٹی چیزوں کی اہمیت بھی اپنی جگہ۔ میں نے ایک ہندی نظم پڑھی تھی (یا دوہا) جس میں یہ بتایا گیا تھا جہاں سوئی کا کام ہو وہاں تلوار کام نہیں آ سکتی۔ اس نظم کا اختتام اقبال نے اس شعر پر کیا ہے جو اس نظم کا بنیادی تصور ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

بانگ درا ہی میں ان کی ایک نظم 'گائے اور بکری' ہے یہ نظم بھی ماخوذ ہے اس میں گائے اور بکری کے درمیان دلچسپ مکالمہ ہے اس نظم کا آغاز منظر نگاری سے ہوتا ہے۔ بکری سلام کر کے گائے سے ہم کلام ہوتی ہے اس کی خیریت پوچھتی ہے۔ گائے جواب میں اپنی بدنصیبی کا ذکر کرتی ہے اور آدمی کی شکایت بکری سے کرتی ہے۔

آدمی سے بھلا کوئی نہ کرے ☆ اس سے پالا پڑے خدا نہ کرے
دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے ☆ ہوں جو دبلی تو بیچ کھاتا ہے
اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں ☆ دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ برائی ہے ☆ میرے اللہ تری دہائی ہے

اس کے جواب میں بکری کہتی ہے:۔

سن کے بکری یہ ماجرا سارا ☆ بولی ایسا گلہ نہیں اچھا
یہ چراگہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ☆ یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں ☆ یہ کہاں بے زباں غریب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں ☆ لطف سارے اسی کے دم سے ہیں

....

قدر آدم کی اگر سمجھو ☆ آدمی کا کبھی گلا نہ کرو
گائے سن کر یہ بات شرمائی ☆ آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا برا اس نے ☆ اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی ☆ دل کو لگتی ہے بات بکری کی

اس طرح علامہ اقبال نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ صرف فائدہ ہی فائدے کی بات نہیں کرنا چاہیئے جس سے فائدہ پہنچتا ہے اس سے کچھ شکایت بھی ہوتی ہے۔

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے

بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال نے بچوں کے لئے بہت سی نصیحت آمیز عمدہ اور پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں انہوں نے بچوں کی نفسیات کا مشاہدہ اپنی نظموں میں پیش کیا ہے ان میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے اور یہ خصوصیت دوسرے شعراء کے یہاں مفقود ہے۔ ہر دو حیثیت سے اقبال کی یہ نظمیں اردو میں بچوں کے ادب میں ایک اضافہ اور سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان نظموں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بچوں کے شاعر کی حیثیت سے بھی ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں یہاں پر ایک بات کا اور اضافہ کر دوں کہ علامہ اقبال کی شاعری غالب کی طرح عام فہم نہیں ہے مگر بچوں کی جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں ان میں سادگی بیاں کو بطور خاص مدنظر رکھا ہے کیوں کہ ان کو اس بات کا علم تھا کہ یہ نظمیں بچے پڑھیں گے اس لئے انہوں نے یہ نظمیں آسان زبان میں لکھی ہیں تا کہ ان نظموں کی تفہیم میں بچوں کو دشواریاں پیش نہ آئے۔ اس لئے ان کی ایسی نظموں میں نغمگی، روانی، سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔

پہلا عظیم عوامی شاعر

"اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبر آبادی
کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے"

مندرجہ بالا قول اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کا ہے جس کا اظہار انہوں نے نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک عرصے تک ان کو صرف میلوں ٹھیلوں کا شاعر یعنی معمولی شاعر سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ مگر وہ اہل نظر کی نظروں سے زیادہ عرصے تک پوشیدہ اور اوجھل نہ رہ سکے اور ان کی غیر معمولی شاعری پر لوگوں کی نظریں پڑنے لگیں۔ اکبرالٰہ آبادی کے مصداق ان پر زمانے کی نظریں پڑیں

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتیوں میں نہاں ہوکر

چنانچہ ادیبوں اور نقادوں کی نظریں نظیر اکبر آبادی کی بے نظیر شاعری پر پڑیں اور پھر ان کی قدردانی ہونے لگی پھر تو ان کو ایک عظیم عوامی شاعر اور آسمان ادب کا درخشاں ستارہ کہا جانے لگا۔ نظیر اکبر آبادی کو فن شاعری پر مکمل عبور حاصل تھا ان کو نہ صرف فن شاعری پر بلکہ زبان پر بھی قدرت اور مہارت حاصل تھی۔ اب تو نظیر اکبر آبادی اردو کے پہلے عوامی شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کا کلام عوام اور ان کی روزمرہ زندگی کی زندگی کا بہترین آئینہ دار ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کو ہر رنگ میں دیکھا تھا اور اس طرح انہوں نے عوامی زندگی کے ہر پہلو کو

دلنشیں انداز میں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے ان کی شاعری میں زندگی کا ہر رنگ موجزن ہے۔ عوام کے جذبات اور احساسات کے بہت سے پہلوؤں نے ان کی شاعری کو ہمہ جہت اور ہمہ رنگ بنادیا ہے۔

نظیر اکبرآبادی کے یہاں موضوعات کی وسعت ہے۔ان کا مشاہدہ بڑا وسیع تھا اور انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کیا تھا چنانچہ ان کی شاعری میں تمدن' تصوف' مذہب' معاشرت' معیشت' فنا' بقا' قناعت' جوانی اور بڑھاپا جیسے سنجیدہ موضوعات سے لے کر عام موضوعات یعنی ہولی' عید' بقرعید' برسات' سردی' گرمی' پیسہ' آٹا' دال' کوڑی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ان سے پہلے کسی نے اتنے موضوعات اور نا قابل اعتنا موضوعات کو اپنی شاعری کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا تھا اس لحاظ سے نظیر اکبرآبادی دیگر شعرا سے ممتاز اور منفرد ہیں۔

نظیر اکبرآبادی نے شاعری کے سلسلے میں حقیقت نگاری کو اہمیت دی ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر اختر اورینوی کا کہنا ہے کہ ''نظیر بہت بڑا حقیقت نگار ہے' وہ زندگی کے ہر رخ کو نہایت ہی صداقت کے ساتھ پیش کرتا ہے'' نظیر اکبرآبادی نے اپنے زمانے کی حقیقتوں کو سیدھے سادے انداز میں بیان کردیا ہے۔ان کے یہاں حقیقت نگاری کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔اس سلسلے میں ان کی نظمیں' بنجارہ نامہ' دیوالی' اور برسات کی بہاریں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ برسات کی بہاریں کے دو بند دیکھئے جن سے اس دعوے کی صداقت کا یقین ہوجائے گا:۔

جو مست ہیں ادھر کے کر شور ناچتے ہیں
پیارے کا نام لے کر کیا زور ناچتے ہیں
بادل ہوا سے ہو کر گھنگور ناچتے ہیں
مینڈک اُچھل رہے ہیں اور مور ناچتے ہیں
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

اور اس کے برعکس حقیقت کا دوسرا رنگ بھی دیکھئے:۔

جب کوئل اپنی ان کو آواز ہے سناتی
سنتے ہی غم کے مارے چھاتی ہے امڈی آتی
پی پی کی دھن کو سن کر بیکل ہیں کہتی جاتی
مت بول اے پپیہے پھٹتی ہے میری چھاتی
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

نظیر اکبرآبادی نے اس نظم میں جزئیات نگاری کا کمال کر دکھایا ہے۔ برسات میں حشرات الارض کی بھی کثرت نظر آتی ہے اس موسم میں صرف سبزے، اور پھول پودوں کی ہی ارزانی نہیں ہوتی بلکہ کیڑے مکوڑوں کا بھی ڈر لگا رہتا ہے۔

سبزوں پہ بیر بہوٹی ٹیلوں اوپر دھتورے
پسو سے مچھروں سے روئے کوئی بسورے
بچھو کسی کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے
آنگن میں کنسلائی کونوں میں کھنکھورے
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

برسات میں جھولا ڈالنے اور جھولا جھولنے کا یہ حسین منظر بھی دیکھئے:۔

اور جس صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی
گلنار یا گلابی یا زرد سرخ دھانی
کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی
جھولوں میں جھولتی ہیں اوپر پڑے ہے پانی
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

کوئی تو جھولنے میں جھولے کے ڈور چھوڑے
یا ساتھیوں میں اپنے پاؤں سے پاؤں جوڑے
بادل کھڑے ہیں سر پہ برسے ہیں تھوڑے تھوڑے
بوندوں سے بھیگتے ہیں لال اور گلابی جوڑے
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

مگر نظیر اکبرآبادی کی نظریں صرف زندگی کے حسین رخ کو نہیں دیکھتیں بلکہ وہ دکھ بھرے اور اداس منظر بھی ہمیں دکھاتے ہیں۔ اس طرح آپ کو اس بات کا یقین آ جائے گا کہ نظیر زندگی کے ہر پہلو پر کیسی گہری نظر رکھتے تھے۔

کتنوں نے اپنے غم سے اب ہے یہ گت بنائی
میلے کچیلے کپڑے ' آنکھیں بھی ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالا نے اوڑھنی رنگائی
چھوٹا پڑا ہے چولہا ' ٹوٹی پڑی کڑھائی
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

نظیر اکبرآبادی ایک قلندرانہ صفت آدمی تھے' وہ مست قلندر تھے۔ روکھی سوکھی کھاتے اور مست رہتے۔ وہ ہر چیز کا بغور مطالعہ کرتے تھے مگر کسی چیز کا اثر دل پر نہیں لیتے تھے بلکہ ہر حال میں خوش رہتے' اگرچہ نظیر کا دور بھی پرآشوب دور تھا اور ایسے دور میں مسکرانا صرف نظیر ہی کا کام تھا۔ اس سلسلے میں ان کی نظموں ''من موجی' ہر حال میں خوش' کوڑی نہ رکھ کفن کو' بنجری کا عالم وغیرہ کا مطالعہ کیجئے حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یہ نظمیں ان کی قلندرانہ شان کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس قلندرانہ شان کے سلسلے میں دو اشعار دیکھئے:

ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دلگیری ہے بابا

☆☆

افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں

پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

نظیر Rich Diction کے مالک تھے' وہ لفظوں کے بادشاہ تھے۔ نظیر علماء کے مہذب طبقے سے لے کر چھوٹے طبقے کے مزدروں اور کسانوں کی زبانوں یعنی عوامی بولی پر پورا عبور رکھتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ اس قدر ہے کہ کوئی دوسرا شاعر اس سلسلے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ بہت سے الفاظ جواب متروک ہو چکے ہیں وہ نظیر کی شاعری میں محفوظ ہو گئے ہیں۔

اردو شاعری عربی اور فارسی شاعری کے زیر اثر آگے بڑھی ہے بالخصوص فارسی شاعری کے اثرات اس پر غالب رہے ہیں اور اردو کے شعرا کئی لحاظ سے فارسی شاعری کی تقلید کرتے رہے مگر نظیر اکبرآبادی ان میں وہ واحد شاعر ہے جس نے بڑی حد تک فارسی شاعری کی تقلید سے اپنے آپ کو بچا کر رکھا۔ ان کی شاعری خالصتاً پاک و ہند کی شاعری ہے' انہوں نے ہندوستان میں رہ کر ایران اور توران کی شاعری نہیں کی' ان کی شاعری کا خمیر برصغیر سے اٹھا اور انہوں نے اپنی شاعری میں یہیں کی تہذیب و ثقافت اور مسائل کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے گردوپیش جو کچھ دیکھا اس کا خوبصورت اظہار اپنی شاعری میں کر دیا مثلاً میلے ٹھیلے' ملکی تہوار' ملکی مناظر اور تفریحات وغیرہ اس طرح نظیر نے اس شاعری کے خلاف بغاوت یا روایت کے خلاف بغاوت کی جو ہندوستان میں جاری و ساری تھی۔

منظر نگاری کی بھی شاعری میں بڑی اہمیت ہے۔ نظیر کو منظر نگاری میں کمال حاصل تھا۔ میلوں ٹھیلوں' تہواروں اور موسموں کی منظر کشی ان کے کمال فن اور مشاہدے کی گہرائی کی بین مثالیں ہیں وہ انسانی زندگی اور ماحول فطرت کی جیتی جاگتی تصویریں اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی بہت سی نظمیں مرقع نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ برسات' برسات کی بہاریں' اور بنجارہ نامہ میں ان کی منظر کشی کا کمال ملتا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ نظیر درویش صفت انسان تھے اور قلندرانہ مزاج کے مالک تھے

اس لئے ان کی شاعری میں اخلاقی موضوعات کا بھی کثرت سے بیان ہوا ہے' نیکی کی تلقین کرتے وقت ان کا انداز واعظانہ نہیں ہوتا بلکہ ان کا انداز بیان بڑا سادہ' دلنشیں' موثر اور مخلصانہ ہوتا ہے اس لئے ان کا اخلاقی بیان زاہد خشک کا بیان نہیں لگتا۔

وہ درویشانہ لہجے میں بات کرتے ہیں یعنی "میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے" کا سا انداز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی فقیر گلی میں آ کر صدا لگاتا ہے اور فقیرانہ لہجے میں نیکی کی باتیں بتاتا ہوا گزر جاتا ہے۔

گر اچھی کرنی نیک عمل دنیا سے لے کر جاؤ گے
تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور اس میں سکھ بھی پاؤ گے
اور ایسی دولت چھوڑ کے تم گر خالی ہاتھوں آ ؤ گے
کچھ بات نہیں بن آئے گی گھبراؤ گے پچھتاؤ گے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

نظیر ایک صوفی منش اور قناعت پسند انسان تھے وہ صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو وحدت الوجود کا قائل ہے۔ نظیر کی نظر میں کائنات کی تمام مخلوق ذات باری تعالیٰ کا عکس ہے۔ نظیر اپنے عقیدے کی ترجمانی اپنی شاعری میں سادہ مگر موثر انداز میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے اپنے موقف اور خیالات کی ترجمانی کے لئے کہیں کہیں تمثیلی انداز بھی اپنایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک تمثیلی نظم "ہنس نامہ" کا حوالہ کافی ہوگا۔ انہوں نے اپنی اس نظم میں یہ بتایا ہے کہ انسان اس دنیا میں ہنس کی طرح ایک مہمان ہے مگر جب وہ دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو کوئی ساتھ نہیں دیتا ہے

سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

اور بقول قمر جلالوی:۔

دبا کے سب قبر میں چل دیئے دعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہوگیا زمانے کو

موسیقیت اور نغمگی شاعری کا لازمی جز نہ سہی مگر اس سے شعر میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ یہ شاعری کا ظاہری حسن ہے۔ موسیقیت کا عنصر نظیر کی شاعری میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ان کی اکثر نظموں میں الفاظ کی ترتیب اور ان کا انتخاب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مختلف سازوں کی جھنکار سنا رہی ہیں۔ ان کی مترنم بحروں میں سر اور تال کی ایک خاص کیفیت ملتی ہے۔ میں نے ابتداء میں نظیر کے جو چند بند پیش کئے ہیں ان میں غنائی خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

مگر ان تمام خصوصیات اور خوبیوں کے باوجود نظیر کی شاعری پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اپنی شاعری میں صحتِ زبان کا خیال نہیں رکھتے' کلام میں الفاظ کا مناسب استعمال' تلفظ کی غلطیاں اور قواعد کی خامیاں پائی جاتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ نظیر قواعد زبان سے اچھی طرح واقف تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے وہ زبان استعمال کی ہے جو عوام بولتی اور استعمال کرتی ہے۔ یعنی ان کے یہاں عوامی زبان کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے' اس لئے یہ اعتراض بڑی حد تک درست نہیں ہے اور میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ کلام نظیر میں شعری محاسن کی کمی نہیں۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں نظیر کئی زبانوں پر مہارت رکھتے تھے ہندی زبان پر ان کو بہت دسترس حاصل تھی۔ پروفیسر حافظ شمس الدین منیری ان کے اس رنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اسی انداز کا ہے جسے ہم نے نئی ہندی کا لقب دیا ہے یعنی اس کا ڈھانچہ تو اردو کا ہے مگر اس میں سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ کی کثرت ہے اور یہ مروجہ اردو کی طرح سہل اور عام نہیں ہے"

پروفیسر شمس الدین منیری ان کی شاعری کی ابتدا ۱۷۶۰ء قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:۔

"اس طرح وہ موجودہ ہندی کا پہلا شاعر ثابت ہوتا ہے"

اس سلسلے میں ان کی ایک مشہور نظم ''جنم کنھیا جی کا'' یہ بند دیکھئے

شبھ ساعت سے یوں دنیا میں اوتار گربھ میں آتے ہیں
جو نارد من ہے دھیان بھلی سب انکا بھید بتاتے ہیں
وہ نیک مہورت سے جس دم اس نشٹ میں جنمے جاتے ہیں
جو لیلا رچنی ہوتی ہے وہ روپ یہ جا دکھلاتے ہیں
یوں دیکھنے میں اور کہنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں
پر بالے پن ہی میں ان کے ابکار نرالے ہوتے ہیں

اس بند میں صرف دو لفظ عربی کے ہیں اور ایک فارسی کا لفظ ہے۔ بقیہ سنسکرت اور ہندی کے الفاظ ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے اس طرح کی اور بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں اور ان نظموں میں جو زبان نظیر نے استعمال کی ہے اسے پروفیسر منیری ''پنڈتانہ اردو'' کا نام دیتے ہیں۔ ایسی نظموں میں کنھیا کا بال پن' کنھیا کی بانسری' کنھیا کی سگائی' سری کرشن درگا جی کا درشن وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کو نہ صرف مختلف زبانوں کا علم تھا بلکہ ملک کے اندر بولی جانے والی بہت سی بولیوں سے بھی وہ واقف تھے۔ پنجابی زبان سے بھی ان کی اچھی واقفیت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پنجابی زبان میں بھی کہیں کہیں بلاتکلف شعر کہہ گئے ہیں۔ وہ اپنی نظم ''نانک شاہ گرو'' میں کہتے ہیں:۔

ہر آن دلوں وچ یاں اپنے جو دھیان گرو کا لاتے ہیں
اور سیوک ہو کر ان کے ہی ہر صورت وچ کہلاتے ہیں
گر اپنی لطف وعنایت سے سکھ چین انہیں دکھلاتے ہیں
خوش رکھتے ہیں ہر حال انہیں سب من کا کاج بناتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک گرو شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کو کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

ایک اور پنجابی کی نظم دیکھئے جو اس سے بھی زیادہ ٹھیٹھ پنجابی میں ہے:۔

کس طرح سے تو جلد آ جا نکلتی دل سے یہی صدا ہے

ساڈے ملنے نوں دل ہے بیکل یہی وہ گلاں نت اکھدا ہے

سدائے میتوں دے اپنے گھر وچ نہیں تے اتھے ساڈے نال آ

غرضیکہ نظیر اکبر آبادی نے دیگر علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی اپنے اشعار میں استعمال کئے ہیں جو نہ صرف ان کی زبان دانی کو ظاہر کرتی ہے بلکہ ان کے وسیع المشرب ہونے کا ثبوت بھی بہم پہنچاتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی کے یہاں بے شمار موضوعات ملتے ہیں مگر ان کی تقسیم ہم اس طرح کر سکتے ہیں مثلاً موسم' تہوار' مشاہدات' تجربات' اور اخلاقیات کے موضوعات۔

موسم سے متعلق ان کی جو نظمیں ملتی ہیں ان میں برسات کی بہاریں' موسم' زمستاں' اوس وغیرہ۔ اور تہواروں کے زیر تحت عید' دیوالی' شب برات' ہولی وغیرہ ان کی مشاہداتی نظموں میں آگرہ کی تیراکی' شہر اکبر آباد' تاریخ گنج کا روضہ اور طفلی بطور خاص قابل ذکر نظمیں ہیں۔

تجرباتی نظموں میں تندرستی' مفلسی' روٹیاں' اہل دنیا' خوشامد اور' زر' ایسی نظمیں ہیں جو ہمیں متاثر کرتی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کے یہاں اخلاقیات کا بھی بڑا عمل دخل ہے وہ ایک صوفی منش آدمی اور شاعر تھے۔ ان کی اخلاقی نظموں میں قابل ذکر نظمیں یہ رس' کلجگ' بنجارہ نامہ' نیکی بدی' اللہ کا نام' مرد انی بہار' دنیائے ناپائیدار اور' موت' شامل ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں جہاں ان کے مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ملتا ہے وہیں ان کی شاعری کی فضا میں ہمیں تصوف کی بھی کارفرمائی بہ طرز احسن ملتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر شمس الدین منیری کہتے ہیں کہ

''بڈھے شاعر کو جب دنیا اور اہل دنیا کا کافی تجربہ ہو جاتا ہے اور اس کا دل اس

طرف سے سرد ہونے لگتا ہے تو اس کی نظریں اوپر کی طرف اٹھتی ہیں اور اس کا دل و دماغ اخلاق و تصوف کی فضا میں پرواز کرنے لگتا ہے...... اس میدان میں نظیر نے جو جولانئ طبع دکھائی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے''

نظیر اکبر آبادی چونکہ عوامی زبان استعمال کرتے تھے اور عوام کی نمائندگی کرتے تھے اس لئے کچھ نقادوں نے ان کو باغی شاعر قرار دے دیا اور بعض نے تو ان کو اشتراکی شاعر کہہ دیا۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے' نظیر اکبر آبادی ایسے شاعر تھے جنہوں نے اپنی سرزمین سے محبت کی اور یہاں کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنایا۔ غریب طبقے کی ترجمانی کی اور امیروں کے بے جا رکھ رکھاؤ پر طنز کیا مگر وہ ایک صوفی منش اور مذہبی آدمی تھے' مذہب اور اخلاقیات کا غلبہ ان کی شاعری پر ہے۔ ان کی ایسی نظموں میں ایک نظم'' اللہ کا نام'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

المختصر نظیر اکبر آبادی نے اپنے ارد گرد کی چیزوں' میلوں ٹھیلوں' تہواروں اور رسومات کا بہت گہرا مشاہدہ کیا تھا' ان کی ایک نظم'' آگرہ کی تیراکی'' ہے اس نظم میں پیراکی کے فن سے متعلق ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں جن کا اس زمانے میں لوگوں کو سمجھنا بھی دشوار ہے۔ اس زمانے میں کبوتر بازی میں کبوتروں کے اقسام اور ہنس نامہ میں پرندوں کی جتنی قسمیں لکھی ہیں ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کتنا وسیع تھا۔

نظیر اکبر آبادی کو منظر کشی میں کمال حاصل تھا۔ یوں تو میر انیس نے بھی منظر نگاری کی ہے مگر ان کی منظر نگاری محدود ہے اور کہیں کہیں پر تو حقیقت نگاری سے دور ہو گئے ہیں یعنی وہ صحرا میں پھول کھلاتے اور پرندوں کی خوش الحانیاں دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر نظیر کا کمال ہے کہ اس نے اپنی شاعری میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے۔

☆......☆

محققِ اعظم۔ قاضی عبدالودود

میں نے ایک آدھ دوسرے مضامین میں بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ تحقیق ایک مشکل اور صبر آزما فن ہے۔ یہ کام اس لئے بھی مشکل ہوجاتا ہے کہ اس میں تنقید کا بھی بڑا عمل دخل ہے کیوں کہ کسی گمشدہ کتاب کی بازیافت اور اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ بغیر تنقیدی صلاحیت کے نہیں لگایا جاسکتا۔ میں تحقیق کے کام کو آثار قدیمہ کے ماہر سے بھی مشابہت دیتا ہوں یعنی جب آثار قدیمہ کا ماہر کسی پرانی بستی یا عمارت کا کھوج لگاتا ہے تو اس سلسلے میں وہ کئی علوم سے کام لیتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ اور عمرانیات کا علم اس کے لئے لازم ہوتا ہے۔ ماہرین نے اس سلسلے میں مختلف اصول وضع کئے ہیں اس کی ایک مثال اس طرح پیش کی جاسکتی ہے کہ کوئی درخت کتنا پرانا ہے اس کی عمر کا اندازہ یا حساب اس کے تنے کے گول نشانات یا دائروں سے لگایا جاتا ہے۔ درخت کے تنے کے کٹنے بعد اس کی سطح پر گول دائرے کی شکل میں اس کے نشانات نظر آئیں گے وہ درخت کی عمر کو ظاہر کریں گے۔ مثلاً اگر اس کے تنے پر بیس گول گول نشانات نظر آرہے ہیں تو اس کی عمر بیس سال ہوگی۔ یہ تو صرف ایک قاعدہ یا کلیہ ہوا اس کے علاوہ بھی کئی اصول اور قاعدے ہیں' اسی طرح کوئی نادر' نایاب یا کوئی قدیم کتاب ملتی ہے تو محقق اس کتاب کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی قدامت کا بھی پتہ لگاتا ہے یعنی یہ کتاب کب لکھی گئی؟ کس دور میں شائع ہوئی اور یہ کتاب کتنی پرانی ہے کیوں کہ قدامت کے لحاظ سے بھی کسی کتاب یا مخطوطے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے' اس سلسلے میں ایک بار میں نے مشفق خواجہ صاحب سے سوال کیا کہ تحقیق کرنے والے اس بات کا کس طرح اندازہ لگاتے ہیں کہ کوئی کتاب کب لکھی گئی اور کب شائع ہوئی۔ انہوں نے اختصار سے یہ بتایا کہ محقق یہ اس کتاب یا مسودے میں استعمال ہونے

والے کاغذ اس کی روشنائی یعنی اس میں استعمال ہونے والی سیاہی سے بھی اس کا اندازہ لگاتا ہے یعنی اس کتاب میں جو کاغذ استعمال کیا گیا ہے ویسا کاغذ کس دور میں استعمال ہوتا رہا ہے اور اس وقت ایسا کاغذ کہاں سے آتا تھا یا کہاں بنتا تھا' اس قسم کی سیاہی کہاں اور کب استعمال ہوتی تھی نیز اس کی جلد بندی میں جولئی یا گوند استعمال کی گئی ہے ان کا استعمال کس زمانے میں ہوتا تھا بعض کتابوں کے حاشیے میں نقش و نگار بنے ہوتے تھے۔ ایسا کب ہوتا تھا اس کی بھی تحقیق کرنی پڑتی ہے' کبھی کبھی ان چیزوں کا کیمیائی تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس مسودے یا کتاب میں جو 'خط' کا استعمال کیا گیا ہے وہ کون سا خط ہے مثلاً وہ خط کوفی ہے' یا شامی۔ وہ کتاب کا تبے والی مشین (یعنی کلکتیہ حروف پر چھپی ہے یا نسخ یا نستعلیق میں) اس طرح کی اور دیگر باتیں ہیں جن کے ذریعے اس کتاب کی قدامت کا پتہ لگایا جاتا ہے میرے اس سوال پر کہ اس فن پر کوئی کتاب موجود ہے؟ مشفق خواجہ صاحب نے بتایا کہ میرے پاس دو تین کتابیں اس فن پر موجود ہیں ان میں سے ایک کتاب قاضی عبدالودود صاحب نے بھیجی تھی۔

قاضی عبدالودود صاحب تحقیق کے ان رموز اور اصولوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ مشرقی زبانوں میں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبانوں پر مہارت رکھتے تھے۔ پہلوی (قدیم فارسی) اور ہندی بھی سیکھی تھی نیز مغربی علوم میں لاطینی' فرانسیسی اور جرمنی زبانیں (انگریزی کے علاوہ) سیکھی تھیں۔ جرمن زبان جرمنی میں اور فرانسیسی زبان فرانس میں سیکھی تھی۔ ان کے تبحر علمی کے سبھی قائل تھے اس سلسلے میں ایک مثال پیش کرنا مناسب ہوگا یعنی بعض تحقیقی کاموں کے لئے کسی زبان کا جاننا ناگزیر ہوتا ہے ایک محترمہ عظیم آباد تحقیق کے سلسلے میں آئی ہوئی تھیں۔ وہ پروفیسر کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود سے اس سلسلے میں رہنمائی چاہتی تھیں ان کا موضوع تذکرہ نگاری تھا۔ دونوں نے یعنی پروفیسر کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود نے جب ان سے پوچھا کہ وہ فارسی زبان جانتی ہیں تو انہوں نے نفی میں جواب دیا ان کے اس جواب پر دونوں نے کہا کہ تذکرے اور خاص کر قدیم تذکرے تو فارسی زبان میں ہیں اس لئے پہلے آپ فارسی زبان

سیکھیں پھر اس موضوع پر تحقیق کا کام آگے بڑھائیں۔ یا پھر موضوع بدل دیں۔ تذکرے کا کام بغیر فارسی دانی کے ممکن نہیں ہے۔

قاضی صاحب کئی علوم اور زبانوں کے ماہر تھے۔ مشرقی اور مغربی علوم کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا لسانیات کا بھی عمیق مطالعہ کیا تھا' تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ تاریخ ادب اور بالخصوص تاریخ ہند' تاریخ ایران و عرب سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ اسلامی عہد کی تاریخ کا بالعموم اور مغلیہ دور کی تاریخ کا بالخصوص مطالعہ کیا تھا اس لئے وہ شعراء و ادباء جن کا زمانہ ولادت یا وفات یا ایسے واقعات جن کا سن کتابوں میں درج نہیں ہے اس کا تعین قرائن سے کیا جس کی بصیرت انہیں تاریخ کے مطالعے سے حاصل ہوئی۔

قاضی عبدالودود صاحب کا ایک نمایاں وصف ان کا زبردست حافظہ تھا۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ پوچھنے والے نے ابھی پورا شعر بھی نہیں پڑھا یا اسے شعر یاد نہیں اور اس نے صرف چند الفاظ بتائے اور ادھر قاضی صاحب نے شعر پڑھنے کے بعد اس شعر کے خالق کا نام پوری تفصیل اور حوالوں کے ساتھ بتادیا۔ یعنی یہ کس کا شعر ہے اور یہ شعر کس کس کے نام سے غلط طور پر منسوب ہوگیا ہے (اگر ایسا ہوا ہے تو) اور کس نسخے میں کس طرح درج ہے۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت کردوں کہ محقق کا حافظہ بھی اچھا ہونا چاہیے۔ یہ خوبی میں نے پروفیسر عطا کاکوی اور مشفق خواجہ میں دیکھی۔ مشفق خواجہ سے کسی کتاب یا مصنف کے بارے میں جب بھی میں نے سوال کیا تو انہوں نے اس کی پوری تفصیل بتادی کہ یہ کتاب کس موضوع پر ہے اس نے اور کون کون سی کتابیں لکھی ہیں اور اس کی کون سی کتاب شائع ہونے سے رہ گئی ہے۔ بہت سے مصنفوں کے غیر مطبوعہ مسودے بھی مشفق خواجہ کے پاس تھے۔ ان مسودوں کے بارے میں یہ بھی بتادیتے تھے کہ کون سی کتاب کہاں ہے کس ریک یا الماری میں ہے اور مکان کی کس منزل پر ہے یہ ساری باتیں انہیں یاد تھیں۔ جو اس بات پر دال ہے کہ محقق کا حافظہ بہت اچھا ہونا چاہئے اور یہ خوبی یا خصوصیت قاضی عبدالودود میں بدرجہ اُتم موجود تھی۔ اس سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد حسنین کہتے

ہیں کہ "قاضی صاحب کی ذہانت غضب کی ہے اور حافظہ بے پناہ' ان کی تحقیقی سر بلندی کی بنیاد ذہانت حافظہ اور محنت ہے۔ نقل دیوان میں دیوان فدوی کا ناصاف مصرع پڑھتا اور اسے دوبارہ پڑھنے کی نوبت نہ آتی متن دیکھے بغیر و فی الفور لفظ مشتبہ کی وضاحت کر دیتے جیسے یہ ان کا کہا ہوا کلام ہو"

اسی سلسلے کا ایک واقعہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو بیان کرتے ہیں کہ

"ایک بار ایک مجلس میں متعدد ادیب اور شاعر موجود تھے ذکر چھڑا کہ اردو کے ہزاروں شعر ایسے ہیں جو زبان زد ہیں لیکن عام طور پر معلوم نہیں کہ کس کے شعر ہیں۔ لوگوں نے یکے بعد دیگرے کوئی دس شعر پڑھے۔ قاضی صاحب نے فوراً بتایا کہ یہ شعر کس کے ہیں اب ان کی باری آئی انہوں نے جو شعر پڑھے ہم لوگ کسی کا جواب نہ دے سکے"

قوت حافظہ قاضی عبدالودود صاحب کی ایسی خوبی ہے جو ان کو دیگر محققین سے ممتاز کرتی ہے اپنے وسیع مطالعہ اور قوت حافظہ ہی کی مدد سے انہوں نے آوارہ گرد اشعار سے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں ایسے اشعار درج ہیں جن کو دوسرے شعراء سے بھی منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ قاضی صاحب نے بقول ڈاکٹر یوسف خان "تحقیق کو ایک باضابطہ شعبہ بنا دیا ہے اور اسے نہ صرف تنقید سے ممیز بلکہ ممتاز بھی کر دیا ہے" پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے بھی اپنے مقالہ "میر اور ہم" میں میر کی شاعری میں مقاومت پر بڑا زور دیا ہے اور اس سلسلے میں اس شعر پر بہت زیادہ انحصار کیا ہے۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا
(امیرؔ)

قاضی عبدالودود صاحب نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ کلیات میر میں یہ شعر نہیں ملتا اور یہ

شعر کسی قدر مختلف شکل میں ایک غیر معروف شاعر کا ہے جو امیر تخلص کرتا تھا اس لئے اس شعر کو بنیاد بنا کر میر کے کلام کے بارے میں نتائج اخذ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس ایک مثال سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ادبی تنقید میں تحقیق کی کتنی اہمیت ہے۔ اس طرح یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ الحاقی یا جعلی شعر پر تنقید کا نتیجہ بھی غلط ہوگا اور ایسی تنقید قابل اعتبار تنقید نہیں ہے۔ اس طرح اگر یہ دیکھا جائے کہ قاضی صاحب کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے تنقید کو تحقیق سے بھی وابستہ کر دیا۔

قاضی صاحب ایک بڑے بااصول آدمی تھے۔ ان کی اصول پسندی' اصول پرستی اور وسعت نظری نے تحقیق کو ایک معیار دیا۔ قاضی صاحب کے پیش نظر ہمیشہ تخلیق کا بلند Ideal رہا ہے' ان کی لغت میں مصلحت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ان کے اپنے اور غیر دونوں برابر تھے۔ وہ معیار کے سلسلے میں کسی کی رد و رعایت نہیں برتتے تھے۔ وہ نہ تو تعلقات کا وہ خیال کرتے تھے اور نہ وہ کسی بڑی شخصیت سے متاثر یا مرعوب ہوتے تھے وہ ان تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار نہایت جرأت اور جسارت کے ساتھ کر دیتے تھے۔ اس سخت گیری کی وجہ سے جہاں ان کے اپنے خفا ہو جاتے تھے وہاں غیر بھی ان کے شاکی نظر آتے تھے بقول علامہ اقبال:۔

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

وہ تو لوگوں کے منہ پر کھری کھری اور سچی بات کہہ دیتے ہیں' بعض اوقات ان کا یہ انداز دل شکنی کا سبب بھی بن جاتا تھا۔ ڈاکٹر انجم فاطمی (نبیرہ شاد عظیم آبادی) ان سے ملنے گئے۔ شاد عظیم آبادی سے اپنا رشتہ بتایا' باتوں کا سلسلہ چلا تو قاضی عبدالودود نے کسی حوالے سے کہا معاف کیجئے شاد عظیم آبادی بڑے لاغی تھے۔ فلاں فلاں جگہ یہ بات غلط لکھی ہے...... اس طرح غلطی یا غلط بیانی کہیں نظر آتی وہ اس کی سخت گرفت کرتے وہ اس معاملے میں بڑے سخت گیر تھے

بقول ڈاکٹر گیان چند

''قاضی عبدالودود کبھی میرؔ، غالبؔ، آزادؔ اور شادؔ عظیم آبادی جیسے گزشتگان پر اپنا گرز گاؤ سر چلاتے ہیں تو کبھی ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر ممتاز احمد جیسے معاصرین پر بغدہ گراں رسید کردیتے ہیں''

قاضی عبدالودود کی اس خصوصیت کے پیش نظر ڈاکٹر ذاکر حسین انہیں ''تنبیہ الغافلین'' قسم کے لوگ کہا کرتے تھے اور اسی وصف کی بنا پر ڈاکٹر گیان چند ان کو 'بت شکن محقق'' کہتے ہیں اور یقیناً اس خصوصیت کے باعث ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مضمون میں یہ لکھا ہے کہ قاضی عبدالودود ہمارے دور میں حق گوئی اور بیباکی کا دوسرا نام ہے''

تحقیق چونکہ ایک بہت مشکل اور صبر آزما کام ہے اس لئے بعض لوگ دھوکا کھاجاتے ہیں۔ ایسی ایک غلطی بابائے اردو سے بھی ہوگئی۔ بابائے اردو نے انشاء کی عدیم النظیر تصنیف دریائے لطافت کو اردو صرف ونحو کی پہلی کتاب قرار دیا ہے جبکہ اس سے پہلے ایک کتاب دستور الفصاحت کا سراغ ملتا ہے اس سلسلے میں عبدالرؤف عروج نے لکھا ہے اور بابائے اردو کے اس دعویٰ کو باطل قرار دیا ہے کہ'' دریائے لطافت'' اردو صرف ونحو کی پہلی کتاب ہے۔' ان کی رائے میں دریائے لطافت کی موجودگی سے پہلے ''دستور الفصاحت'' کا وجود ملتا ہے۔(دریائے لطافت اردو کی اوّلین کتاب صرف ونحو بزبان فارسی۔ ڈاکٹر شازیہ عنبرین مطبوعہ 'اخبار اردو' اسلام آباد جولائی ۲۰۰۷ء)۔ اسی مضمون میں ڈاکٹر شازیہ نے ڈاکٹر مسعود حسین خان کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ کہ' مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق 'دریائے لطافت' کسی ہندوستانی کی لکھی ہوئی پہلی اردو قواعد ہے جبکہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کے نزدیک اردو کی پہلی قواعد ۱۸۴۰ء میں سرسید احمد خان نے ''قواعد صرف ونحو اردو'' کے نام سے لکھی۔'' یہاں پر اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ کتاب یعنی دریائے لطافت فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اگرچہ تمام نظم ونثر کی مثالیں اردو میں ہیں، بہر حال یہاں پر میرا مقصد کسی بھی اعتبار سے بابائے اردو کے مرتبے کو کم

کرنا نہیں تھا اور نہ ہے بلکہ ایک غلطی جوان سے ہوگئی اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ یوں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے تحقیق کے میدان میں بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں اور یہ اردو زبان وادب پر ان کا بڑا احسان ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ تحقیق کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کا نقطۂ نظر سائنٹفک تھا۔ وہ ۲+۲=۴ کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنے تحقیقی کاموں میں مختلف اشاروں اور علائم سے بھی کام لیا ہے بقول پروفیسر کلیم الدین احمد سائنٹسٹ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک جو نئی نئی دریافتیں کرتے ہیں اور دوسرے وہ جوان دریافتوں کو تنقید کی روشنی میں دیکھتے ہیں یعنی بہت سی دریافتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی بنیاد مفروضوں پر ہوتی ہے یا جن میں پیچیدہ حساب کتاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح نقاد اس میں یہ دیکھتے ہیں کہ مفروضوں میں کوئی جھول تو نہیں ہے یا حساب میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے۔ قاضی صاحب کا تعلق دوسرے قسم کے سائنسدانوں سے ہے یعنی وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی تحقیقی کتاب یا تحقیقی مقالے میں کوئی کمی یا خامی تو نہیں رہ گئی۔ قاضی صاحب نے انہیں اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تخلیقی یا تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا ہے اس طرح انہوں نے بے شمار تحقیقی مضامین لکھے جس سے تحقیق کی نئی راہیں کھل گئیں ان سے پہلے جو تحقیق کا انداز تھا وہ انشاء پردازانہ تھا۔ اس طرح وہ (قاضی صاحب) بقول سید امتیاز علی عرشیؔ ''تمام تحقیقی کام کرنے والوں کے رہنما بن گئے'' ان کے سلسلے میں مالک رام کا یہ کہنا بھی قابل توجہ ہے کہ ''قاضی عبدالودود صاحب نے ہمارے طلبا و اساتذہ و مصنفین کی دو نسلوں کو متاثر کیا ہے''

رشید حسن خان قاضی عبدالودود کی محققانہ حیثیت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں یعنی اردو تحقیق کا ان کو معلمِ ثانی کہتے ہیں اور معلم اوّل حافظ شیرانی کو قرار دیتے ہیں ان کے اس قول سے اختلاف کی بہت کم گنجائش ہے کیوں کہ نئے ماخذ کی تلاش اور اولین ماخذ کی اہمیت کا احساس حافظ محمود شیرانی کے زمانے سے ہوتا ہے یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دونوں حافظ قرآن تھے۔ قاضی عبدالودود نے ابتدائی عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تحقیق میں جرأت و

بے باکی اور سائنسی طرزِ استدلال قاضی عبدالودود کی رہین منت ہے' قاضی صاحب نے تحقیق کا معیار بہت بلند کر دیا شاید وہ بقول کلیم الدین احمد آرنلڈ کے اس قول سے متفق تھے۔

Let us keep our standerd high

قاضی عبدالودود صاحب کا بھی یہی خیال تھا کہ معیار کو بلند رکھنا چاہیئے چنانچہ انہوں نے تحقیق کا معیار بلند رکھا۔ اسی لئے گیان چند یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ'' مجھے قاضی صاحب سے عقیدت ہی عقیدت ہے۔ تحقیق کی صحت اور معیار کی بلندی کے لحاظ سے وہ میرے مثالی محقق ہیں۔ اسی لئے میں نے اپنی مثنوی کی کتاب ان کے نام معنون کی ہے۔ قاضی صاحب کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے تحقیقی مضامین میں بھی وقتاً فوقتاً اضافہ اور ترامیم کرتے رہتے تھے۔ ان کے اس عمل سے بعض اوقات ان کے کاتب تنگ آ جاتے' ان کو دوبارہ کتابت کرنی پڑتی تھی۔

قاضی صاحب نے اپنی کتابوں کی اشاعت کی طرف دھیان نہیں دیا۔ دیوان جوشش تذکرہ ابن طوفان' اشتر وسوزن اور عیارستان کے علاوہ کوئی مستقل کتاب شائع نہیں ہوئی۔ آخری دو کتابیں ان تبصروں پر مشتمل ہیں جو'معاصر' میں شائع ہوئے تھے۔ ان کے بہت سے مقالے مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں غالب بحیثیت محقق' آزاد بحیثیت محقق' عبدالحق بحیثیت محقق وغیرہ شامل ہیں۔ کلیم الدین احمد نے بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام ان کے مقالات کی دو جلدیں شائع کی ہیں۔ قاضی عبدالودود کے مقالات کی تعداد تقریباً ۲۶۳ تک پہنچتی ہے' اگر یہ تمام مقالات کتابی صورت میں شائع ہو جائیں تو اہل ادب اور بالخصوص تحقیق کرنے والوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوں گے۔

☆.....☆

کلیم الدین احمد پر ایک نظر

کلیم الدین احمد اردو تنقید کی دنیا میں ایک منفرد اور عظیم شخصیت تھے۔ وہ اردو تنقید کی آبرو تھے۔ انہوں نے اردو تنقید کو ایک آبرومندانہ مقام عطا کیا۔ ان سے پہلے اردو تنقید خود ان کے بقول ''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نکتہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر''۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ان سے پہلے اردو تنقید کا یہی حال تھا۔ حالی نے اردو غزل اور اردو شاعری کے حوالے سے ایک مفید بحث کا آغاز کیا تھا اور انہوں نے مغربی تنقید سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ کلیم الدین احمد نے مغرب سے استفادہ کیا ان کے استفادے کا مطلب بھی وہی ہے جس کی تحریک حالی نے چلائی تھی مگر چونکہ حالی مغربی ادب سے برائے نام واقفیت رکھتے تھے اس لئے وہ یہ کام نہ کر سکے۔ کلیم الدین احمد کی مغربی ادب سے واقفیت بہت وسیع اور گہری تھی۔ وہ نہ صرف انگریزی ادب پر عبور رکھتے تھے بلکہ فرانسیسی اور لاطینی ادب کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی پر بھی انہیں اچھی دسترس حاصل تھی' انگریزی کے وسیلے سے عالمی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ مغربی نقادوں کے مختلف مراتب اور درجات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس سلسلے میں ان کے اہم اور غیر اہم خیالات و نظریات میں آسانی سے فرق کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے بقول پروفیسر ڈاکٹر سید نواب کریم ''استفادہ وہی مفید ہے جو خیال و فکر کی دنیا کو وسعت دے سکے' منور کر سکے' ذہنی جذباتی اور روحانی کوائف کی بوقلمونی اور تنوع میں ہم آہنگی اور توازن قائم کرنے میں معاون ہو'' چنانچہ کلیم الدین احمد نے اس نظریہ کے تحت مغربی علوم سے استفادہ کیا بعض لوگ ان کے استفادے کی وجہ سے ان پر مغرب پرستی کا

الزام بھی لگاتے ہیں مگر بقول ڈاکٹر سلیم اختر ایک ایسے شخص پر مغرب پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے جس نے 'فن داستان گوئی' جیسی کتاب لکھی ہے جو سراسر مشرقی ہے۔ انہوں نے مغرب سے اچھے اصول ۔لے کر مشرق کو دیئے ہیں ۔ اصول' اصول ہوتا ہے' مغربی یا مشرقی نہیں ہوتا جن اصولوں کے تحت کوئی نظم' افسانہ یا ناول اچھا کہلائے گا' اس کے لئے مغرب اور مشرق کے پیمانوں سے فرق کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر مغرب نے فکشن یا شاعری کے لئے کچھ اچھے پیمانے وضع کئے ہیں تو ہم بھی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

کلیم الدین احمد اردو کے ایک سخت گیر نقاد ہیں اس لئے بہت سے لوگ ان کے برش قلم کی تاب نہ لا سکے۔ ان کی پہلی گراں قدر تصنیف ''اردو شاعری پر ایک نظر'' جب منظر عام پر آئی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس کتاب میں پرانی شاعری سے لے کر نئی شاعری تک کوئی بھی ان کی بے لاگ تنقید کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ بالخصوص غزل پر جو انہوں نے تنقید کی اس پر غزل گو طبقہ اور غزل کے دلدادہ خاص طور پر برافروختہ ہوئے ۔ غزل سے متعلق ان کی بعض آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے خود مجھے بھی اس سلسلے میں ان سے جزوی اختلاف ہے مگر کلیم الدین احمد غزل کی خارجی ساخت کے نہیں بلکہ اس کی معنوی بے ربطی اور انتشار کے شاکی ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں کہا ہے کہ'' غزل کی مخصوص صورت کو برقرار رکھتے ہوئے اس صنف میں نظم لکھی جا سکتی تھی اور لکھی جاتی ہے''

پروفیسر آل احمد سرور بھی زلف غزل کے اسیر نظر آتے ہیں وہ کہتے ہیں'' غزل تلوار کی دھار کا آرٹ ہے اور چاول پر قل ہو اللہ احد لکھنے اور نقش نگینے کا فن ہے مگر یہی سرور آگے چل کر کلیم الدین احمد کے ہمنوا بن جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں'' مگر اس میں انفرادیت کو پھلنے پھولنے کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی رمزیت خاصی جامع اور گہری ہے مگر پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کے دور میں زیادہ عرصے تک کام نہیں دے سکتی اس لئے شاعری کا مستقبل زیادہ تر غزل سے نہیں نغمہ سے وابستہ ہے۔ اس سلسلے میں کلیم الدین احمد آل احمد سرور پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے

ہیں کہ میں نے کہا ہے کہ سرور صاحب ایک سانس میں ہاں، نہیں کہہ جاتے ہیں، شاید انصاف معقولیت اور توازن کا نتیجہ ہے، مگر کلیم الدین احمد نے غزل سے متعلق جو باتیں کہیں اس پر تادم مرگ قائم رہے کیوں کہ انہیں اپنی اصابت رائے پر بھر پور ایقان تھا۔ اس بات کا اظہار انہوں نے حال ہی میں کلیم عاجز کے شعری مجموعہ ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کیا ہے۔ جو اس مجموعے میں شامل ہے۔

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں شاعری کا جو روپ اور اس کی اصلاح کے لئے جو مفید مشورے دیئے ہیں اس سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ اردو شاعری کو با مقصد بنایا جائے اور اسقام کو دور کرنے کی کوشش کی جائے مگر اسے بھی بہت سے لوگ اردو شاعری کی یک رخی تصویر سمجھ کر بر وفراختہ ہوئے ہوئے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے اس کے جواب میں ''ہماری شاعری'' لکھی جس میں اردو شاعری اور غزل کے محاسن احسن طریقے سے پیش کئے۔ حالؔی اور کلیم الدین احمد کی نیتیں صاف تھیں وہ دراصل مشرقی شاعری کو عروج پر دیکھنا چاہتے تھے۔ کلیم الدین احمد چاہتے تھے کہ اردو شاعری مغربی شاعری سے آنکھ ملا سکے۔ کلیم الدین احمد، مولانا حالی اور عظمت اللہ خان کی طرح غزل کی پراگندہ خیالی سے پریشان تھے مگر وہ غزل اور دیگر اصناف سخن کی بعض کمزوریوں کے باوجود جن شعراء کے اندر شاعرانہ کمال یا اوصاف دیکھتے ہیں ان کی تعریف بھی کرتے ہیں مثلاً میر تقی میر کی شاعری سے متعلق کہتے ہیں ''میرؔ کے شعروں میں یہ پامال مضامین ایک عجیب اثر آفرینی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اثر کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پامال مضامین پیش پا افتادہ معلوم نہیں ہوتے بلکہ ایک نیا پن لئے ہوئے ہیں''

میر کی شاعری سے متعلق ''پستش بغائت پست و بلندش بغائت بلند'' یا بہتر نشتر کی بات کرتے ہیں مگر ایسا کیوں ہے کسی نے بھی غور نہیں کیا مگر کلیم الدین احمد اس کا کھوج لگاتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو میر ہیں۔ ایک غزل کے میدان میں نفیس و پاکیزہ اشعار

تراشتا ہے' ایسے اشعار جو دل پر تیر ونشتر کا کام کرتے ہیں۔ دوسرا نہایت عامیانہ سے بے ڈھنگے اشعار موزوں کرتا ہے جس کو شاعری سے واسطہ نہیں۔ ایسا کیوں ہے اس کی وضاحت بھی کلیم الدین احمد آگے چل کر کرتے ہیں ''حقیقت میں دو میر ہیں ایک جس کے دل میں مختلف جذبات وکوائف گزرے ہیں جس نے اپنی زندگی اور اپنے ماحول میں چند عبرت آگیں حقیقتوں کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جب میر ان ذاتی احساس وحقائق کی عکاسی کرتے ہیں تو ان کے اشعار تاثیر سے لبریز ہوتے ہیں۔ دوسرا میر فارسی کے زیر اثر ہے وہی مضامین موزوں کرتا ہے جو عام طور پر فارسی میں پائے جاتے ہیں۔ مضامین ہی نہیں' وہی بندشیں اور تشبیہیں بھی اردو شاعری میں فارسی شاعری سے مستعار لی گئی ہیں۔ جب میر اس تقلید کے زیر اثر لکھتے ہیں ..... تو ان کے اشعار بیک قلم مائل انحطاط ہو جاتے ہیں''

کلیم الدین احمد جس شاعر یا ادیب میں جو خوبی یا خامی دیکھتے ہیں اس کا برملا اظہار کردیتے ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کے کلام میں انہیں جو خوبیاں نظر آئیں اس کا برملا اظہار کردیا انہوں نے نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر اس خوبی سے قلم اٹھایا کہ پہلے جو لوگ نظیر کو میلوں ٹھیلوں کا معمولی شاعر سمجھتے تھے اب انہیں تسلیم کرنے لگے۔ اس طرح کلیم الدین احمد نے نظیر کو بے نظیر بنادیا' اردو شاعری پر ایک نظر' میں نظیر کے متعلق کہتے ہیں'؟' اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبرآبادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے۔ نظیر کو تنہا ستارہ کیوں کہا؟ اس کا جواز وہ اس طرح پیش کرتے ہیں'' جب غزل عالم گیر تھی اور جب غزل گوئی اور شاعری مترادف الفاظ تھے ایسے زمانے میں نظیر نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور آزادی فکر کا بیش قیمت نمونہ پیش کیا۔ تو نہیں کہہ سکتے کہ نظیر نے غزلیں نہیں لکھیں لیکن انہوں نے غزل کو حاصل شاعری نہیں سمجھا''

کلیم الدین احمد نے صرف شاعری پر ہی اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا بلکہ شاعر اور اس ں پر بھی مفید بحث کی ہے اور ان کی معقول تعریفیں بھی پیش کی ہیں۔ جہاں مغرب کے شاعروں کی آراء سے اختلاف کیا ہے اسے بھی لکھا ہے اور جہاں اتفاق کیا ہے اسے بھی ضبط تحریر

میں لائے ہیں۔ مثلاً شاعر کی تعریف کے سلسلے میں انہوں نے شبلی کے اس قول سے اتفاق نہیں کیا ہے کہ" شاعر ایک بلبل ہے جو اندھیرے میں گاتا ہے اور گا کر اپنی تنہائی کو خوش کرتا ہے۔ سننے والے سنتے ہیں اور بے خود ہو جاتے ہیں" کلیم الدین احمد ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ" شاعر بلبل نہیں' وہ صاحب دماغ انسان ہے اور صرف یہی نہیں' صاحب دماغ تو بہت ہوتے ہیں شاعر اپنے عہد میں ادراک کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے وہ بلبل کی طرح بے اختیاری کے عالم میں گاتا نہیں' وہ جو کچھ کہتا ہے سمجھ بوجھ کر کہتا ہے"

شاعری میں تخیل کا کیا کام ہے اور تخیل کیا ہے' اس کی تعریف حالی نے اپنی مجبوریوں کے باوجود اچھی کی ہے مگر ان کی تعریف مکمل نہیں' کلیم الدین احمد تخیل کی تعریف اس طرح کرتے ہیں " دور و نزدیک کی سب چیزوں پر شاعر کے تخیل کا تصرف ہے۔ وہ ان چیزوں کو ایک جگہ اکٹھا کر سکتا ہے۔ مختلف اور متضاد خصوصیتوں میں توازن و اتفاق پیدا کر سکتا ہے۔ پرانی اور جانی ہوئی چیزوں میں نیا پن اور تازگی ڈال دیتا ہے۔ عام اور خاص خیال اور نقوش' انفرادی اور عالم گیر باتوں میں میل دے کر نئے نقشے بناتا ہے۔ تیز اور گہرے جذبات کو نئی مناسبت اور تنظیم کے ساتھ پیش کرتا ہے۔' کلیم الدین احمد نے یہاں کالرج کے خیال سے فائدہ اٹھایا ہے مگر وہ اس فیض سے انکار نہیں کرتے بلکہ وہ کالرج کی اصل عبارت اس باب کے آخر میں پیش بھی کر دیتے ہیں مگر یہ استفادہ بقول پروفیسر نواب کریم استفادہ نظر نہیں آتا بلکہ ان کی اُپج نظر آتی ہے" وہ اسی طرح شاعر اور شاعری کی تعریف' شعر میں تجربہ اور ذریعۂ اظہار' شعر مفرد اور نظم پر بحث کرتے ہوئے اپنے خیالات کو نہایت موثر اور مدلل انداز میں پیش کرتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کی ایک بڑی خوبی ان کا بنیادی وصف جرأت اظہار ہے۔ وہ جس جرأت اور جسارت سے اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ دراصل تنقید اسے ہی کہتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ کلیم الدین احمد نے اردو تنقید کو جسارتِ بیان سے روشناس کیا۔

پروفیسر شمیم احمد نے اپنی نئی کتاب 'برش قلم' کا انتساب کلیم الدین احمد کے نام پر یہ لکھ کر کیا ہے کہ ''جن کی تنقید سے میں نے جرات اظہار اور بے لاگ بات کہنے کا انداز سیکھا مگر کلیم الدین احمد جراتِ اظہار کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ کہیں بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے جبکہ شمیم احمد (بالخصوص 'برش قلم' میں) جراتِ اظہار کے ساتھ ساتھ کہیں قابل اعتراض لہجہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کا ایک بڑا کارنامہ ان کی عملی تنقید بھی ہے۔ان کی معرکتہ الآرا کتاب 'عملی تنقید' اردو میں اپنے طرز کی پہلی منفرد تنقیدی کتاب ہے۔اس کتاب کو تین جلدوں میں شائع ہونا تھا مگر افسوس کہ اس کی صرف ایک ہی جلد شائع ہو سکی جس میں شعر و غزل سے بحث کی گئی ہے۔ دوسری جلد میں مثنوی' قصیدہ' مرثیہ وغیرہ پر عملی تنقید شامل تھی اور تیسری جلد میں افسانوی ادب کا جائزہ تھا۔عملی تنقید (Applied Criticism) کی عمر مغرب میں بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔آئی اے رچرڈز نے ۱۹۳۰ء میں اس کی بنیاد رکھی تھی۔اس تنقید کو مقبول بنانے میں ایف آر لیوس کا نام بھی قابل ذکر ہے۔پروفیسر کلیم الدین احمد نے ان سے کیمبرج میں شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ عملی تنقید میں وہ اشعار کا تجزیہ کر کے دکھاتے ہیں۔نثری لفظ اور شعری لفظ کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔خیال' ذہنی نقش اور تاثر کے ہر پہلو سے کلیم الدین احمد نے اس کتاب پر بحث کی ہے۔شعر کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لئے' کیا اور کیسے'' کی بحث اٹھاتے ہیں۔ہماری تنقید ان باتوں سے واقف نہیں تھی۔الفاظ میں معانی کی مختلف سطحوں کا احساس اردو کے ناقدوں کو اس سے نہیں تھا۔اس سلسلے میں پروفیسر کلیم الدین احمد کا یہ قول ملاحظہ فرمائیں ''شعر کا ہر لفظ پیکر (Bodyimage) ہے۔اس کو جب ہم بولتے ہیں تو اس کی ساخت کو ہم منہ میں محسوس کرتے ہیں' سنتے ہیں تو ایک خاص صوتی پیکر کا احساس ہوتا ہے۔سوچتے ہیں تو آنکھوں کو اندرونی آنکھوں کو اس کا صوری پیکر نظر آتا ہے''عملی تنقید کے مقدمے میں (جسے نواب کریم نے تنقید کا دل قرار دیا ہے) کلیم الدین احمد نے شاعری کو اصول' نوعیت' خصوصیت اور اس کی

کارکردگی کونہایت ہی خوش اسلوبی' تنقیدی مہارت اور بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اشرف نے (شیرازہ سری نگر کے ایک شمارہ میں) ''اردو میں ہیئتی تنقید کا سفر'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے کلیم الدین احمد کو اردو تنقید میں آئی اے رچرڈس کی حیثیت دی تھی اس رائے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر علی حماد عباسی کہتے ہیں ''کلیم الدین احمد کو اردو تنقید میں آئی اے رچرڈس کی حیثیت دینے والی بات پر جا ہے کسی کو ہو نہ ہو مجھے تو سخت اعتراض ہے' کلیم الدین احمد رچرڈس سے کہیں بڑے اور قد آور نقاد ہیں جس طرح سے وہ بلا جھجک اور ہر طرح کے رعب و داب سے بے نیاز ہو کر ادب کا تجزیہ کرتے ہیں اور الفاظ و معنی کے نازک رشتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس طرح الفاظ کو کھنگال کر معنی کے معنی اور تہہ تک پہنچتے ہیں اور جس فنی ہوشمندی' چابکدستی اور نشتریت کا ثبوت دیتے ہیں وہ بہر صورت رچرڈس کے بندھے ٹکے اور اصولوں کی کسوٹی پر ادب و شعر کو پرکھنے کے طریقۂ کار سے کہیں افضل ہے'' پروفیسر علی حماد عباسی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ''اگر کلیم الدین احمد کا تنقیدی سرمایہ انگریزی میں منتقل ہو جائے تو مدعیان شعر و ادب آئی اے رچرڈس کو انگریزی کا کلیم الدین احمد کہہ کر ان کی عظمت کا اعتراف کرتے''

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ''فن تنقید'' ۔ ''فن داستان گوئی'' ۔ ''سخن ہائے گفتنی'' اور ''اقبال ایک مطالعہ'' ایسی تنقیدی کتابیں ہیں جن کی مثال اردو زبان میں نہیں ملتی جس وقت اردو افسانے کا شور اور غلغلہ تھا اس وقت کلیم الدین احمد نے داستان کی بات چھیڑ دی۔ انہوں نے لکھا کہ ''آج اردو میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز مختصر افسانہ ہے' داستانوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا'' ۔ ''فن داستان گوئی'' میں جس عمدگی' مہارت اور سلیقے سے داستانوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے نئی نسل کو یہ کہہ کر اس کی افادیت اور اہمیت ظاہر کر دی ہے کہ ''داستان گوئی اب زندہ نہ سہی لیکن کامیاب داستانیں ہیں اور زندہ رہیں گی''

''سخن ہائے گفتنی'' میں بیشتر وہ تبصرے اور اداریے شامل ہیں جو'معاصر' (پٹنہ) میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ چند مقالے بھی ہیں۔ اس کتاب میں جو تبصرے ہیں وہ بھی ان کی تنقیدی بصیرت اور روشن نظری اور بے باکی کی بیّن دلیلیں ہیں اس کتاب کا ایک گراں قدر مقالہ 'ریڈیو اور کلچر' شامل ہے' جس میں کلچر پر ریڈیو کے اثرات نیز ریڈیو کی اہمیت اور افادیت پر مختلف گوشوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

تنقید نگار کے علاوہ کلیم الدین احمد کی کئی اور حیثیتیں بھی ہیں۔ وہ ایک محقق' شاعر اور سوانح نگار کے نام سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ کلیم الدین احمد جب ڈاکٹر محمد حسنین کے گائیڈ ہوئے اور جب وہ ان کو اپنا تحقیقی مقالہ دکھاتے اور ان سے مشورے کرتے تو اس دوران کلیم الدین احمد کو تحقیق سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس حیثیت سے انہوں نے 'دیوان جہان' 'تذکرہ گلزار ابراہیم'' ''دیوان خاص'' ترتیب وحواشی کے ساتھ شائع کیے۔ سوانح میں ان کی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' کی تین جلدیں مکمل ہوئیں دو جلدیں شائع ہو چکی تھیں' تیسری جلد قسط وار زبان وادب میں شائع ہو رہی تھی۔ سوانح نگاری میں بھی انہوں نے حق گوئی اور بے باکی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اس میں وہ باتیں بھی ہیں اپنے اور اپنے والد سے متعلق لکھ گئے ہیں جنہیں عام طور پر لوگ چھپاتے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے ان کی نظموں کے دو مجموعے ''۴۲ نظمیں'' اور ۲۵ نظمیں شائع ہو چکی ہیں مگر مظہر امام نے ان کی شاعرانہ اہمیت کو تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ ایک طرح سے مسترد کر دیا جب کہ ڈاکٹر ممتاز احمد صدر شعبہ اردو جامعہ پٹنہ نے ان کی شاعری سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی ہے' جس میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے اور انہیں ایک منفرد اور باصلاحیت شاعر تسلیم کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعر کی حیثیت سے ان کا وہ مقام نہیں جو انہیں تنقید نگار کی حیثیت سے حاصل ہے بایں ہمہ چند اچھی نظمیں بھی کہی ہیں۔ کلیم الدین احمد نے انگریزی میں بھی ایک معرکۃ الآرا کتاب ''سائیکو انالائسز اینڈ لٹریری کریٹیسزم'' لکھی ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل رہ چکی ہے' اس کے علاوہ پانچ جلدوں پر مشتمل

انگریزی اردو لغت مکمل کیا اور وہ اردو انگریزی لغت پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے کلیات شاد (تین حصوں میں) دیوان جوشش مقالات قاضی عبدالودود اور رقص شرر مسلم عظیم آبادی کے کلام کا انتخاب بھی مع مقدمہ مرتب کر کے بہار اردو اکادمی سے شائع کرایا۔ انہوں نے اصطلاحات پر بھی ایک بیش بہا کتاب لکھی جو بقول مشفق خواجہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

کلیم الدین احمد کا شماران نابغۂ روزگار اور ممتاز لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے علم و ادب کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا' ساری زندگی صرف پڑھنے لکھنے سے واسطہ رہا۔ تادم مرگ لکھتے پڑھتے رہے اور اردو زبان وادب کو اتنا کچھ دے گئے کہ اہل زبان اپنے اس عظیم محسن کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا شعری نظریہ

"ان لوگوں کے اقوال قلمبند کرو جو دنیا سے بے نیاز ہیں' کیوں کہ اللہ عزوجل نے ایسے فرشتے مامور فرمائے ہیں جو ان کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھے رہتے ہیں اور ان کو صرف وہی بات کہنے کی اجازت دیتے ہیں جو خدائے پاک ان سے کہلوانا چاہتا ہے"

(سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ)

جب حضرت عمر فاروق اعظم کا یہ قول میں نے پڑھا اور اس کے بعد شاعری سے متعلق ان کے اقوال پڑھے تو میں نے اپنا یہ فرض جانا کہ ان کے اقوال کی روشنی میں ان کے شعری نظریہ کا ایک جائزہ پیش کروں۔ یوں تو حضرت فاروق اعظم کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں مثلاً وہ ایک بیمثال عادل' بے مثال منتظم' علم و دانشوری' جرأت اور شجاعت کے پیکر تھے۔ جمہوریت کی ایسی مثال قائم کی کہ آج تک لوگ انہیں یاد کرتے ہیں۔ صرف اپنے ہی نہیں بلکہ بیگانے بھی مثلاً گاندھی جی کو یہ کہنا پڑا کہ جمہوریت کی بہترین مثال حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ (عہد خلافت) ہے۔ وہ مرادِ رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تین مواقع پر ان کی رائے کو پسند فرمایا اور اس کے مطابق وحی اتاری یعنی (۱) مقامِ ابراہیم میں نماز پڑھنے کے بارے میں (۲) دوسرے پردے سے متعلق (۳) اور تیسرے غزوۂ بدر کے قیدیوں کی بابت۔ میں نے اختصار کے ساتھ صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت عمرؓ کی عظمت کی دلیل ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے متعلق

بہت سے لوگوں کو علم ہے۔ حضرت عمر فاروق کی شخصیت کا ایک پہلو وہ بھی ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ میری مراد حضرت عمر کی شعری ادب سے دلچسپی اور ان کا شعری نظریہ ہے۔ حضرت عمر صرف صاحب جلال ہی نہیں تھے بلکہ صاحب جمال بھی تھے۔ ذوق جمال بھی ان کی شخصیت کا ایک اہم عنصر تھا۔ انہیں شعر و شاعری سے دلچسپی تھی جس کا اظہار انہوں نے مختلف مواقع پر کیا ہے۔ وہ صرف شعری ادب کا ذوق ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی شعر پڑھنے کی تلقین کرتے تھے۔ اس سلسلے میں صرف شعر خوانی کی تلقین ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے پڑھنے کا حکم صادر فرماتے رہے وہ کہتے ہیں کہ ''لوگوں کو اشعار یاد کرنے کا حکم دو کیوں کہ وہ اخلاق کی بلند باتوں اور صحیح رائے اور انساب کی طرف راستہ دکھاتے ہیں'' (احکام بنام گورنر)

اس قول یا فرمان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ ادب کی افادیت کے قائل تھے اور شعری ادب کو اخلاق کو سنوارنے کا ایک بہترین ذریعہ تصور کرتے تھے۔ شعر سے ان کی دلچسپی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا مطلب تھا کہ ''یہ جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا' مال ہو یا اولاد سب فنا ہو جائیں گے البتہ اللہ کی ذات کو بقائے دوام حاصل ہے''

حضرت عمر صرف یہی نہیں کہ شعر پڑھتے تھے' شعر یاد رکھنے کی تلقین کرتے رہتے تھے اور شعر کی افادیت کے قائل تھے بلکہ وہ شعر میں ابلاغ کو ضروری سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ شعر میں ایسے الفاظ نہ لائیں جائیں جو شعر کو شعر نہ رہنے دیں بلکہ اوہ اسے معمہ یا چیستاں بنا دیں۔ اس لئے وہ شعراء کو نامانوس الفاظ کے استعمال سے باز رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے دور کے مشہور شاعر زہیر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''وہ نامانوس الفاظ کی تلاش میں نہیں رہتا۔ اس کے کلام میں پیچیدگی نہیں ہوتی اور وہ ان معنوں کو باندھتا ہے جن سے واقف ہوتا ہے کسی کی مدح کرتا ہے تو انہیں اوصاف کا ذکر کرتا ہے جو واقعی اس میں ہوتے ہیں۔

اس قول میں کئی باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں (۱) اوّل یہ کہ اجنبی اور نامانوس الفاظ سے گریز کیا جائے اور کلام کو پیچیدہ اور مبہم ہونے سے بچایا جائے (۲) جس مضمون سے واقفیت نہ ہو اسے نہ باندھا جائے ورنہ اس میں صداقت اور خلوص کا فقدان ہوگا۔ (۳) سوم مدح کے سلسلے میں (اس زمانے میں قصیدہ گوئی کا رواج بھی عام تھا) مبالغہ آمیزی سے کام نہ لیا جائے۔ مگر شعرا بادشاہوں اور محبوباؤں کے سلسلے میں غلو اور اغراق سے بھی کام لیتے رہے ہیں۔ حد سے زیادہ مبالغہ جھوٹ کی سرحد عبور کر لیتا ہے اس کا شعر غیر منطقی' غیر موثر اور لایعنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ جذبے کی صداقت اور خلوص شاعری کا لازمی حصہ ہیں۔ شعر میں معنویت اور اثر و دلکشی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ ایک زمانے میں قصیدہ نگاری کے ساتھ ساتھ ہجو نگاری کا بھی بڑا زور تھا بلکہ قصیدہ نگار ''ہجو'' بھی لکھتا تھا۔ ہجو نگاری کو بھی ایک فن سمجھا جاتا تھا۔ عربی اور فارسی میں اس کا بہت بڑا ذخیرہ یا سرمایہ موجود ہے مگر حضرت عمر فاروق اسے سخت ناپسند کرتے تھے' اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ''ہجو گوئی بری عادت ہے'' اور یہ بری عادت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ اس زمانے میں شعرا عورتوں سے متعلق اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار بہت کھل کر کرتے تھے اور عشقیہ شاعری کا چرچا عام تھا۔ یہ بات فارسی اور اردو شاعری میں بھی عام تھی۔ اسی بات کے پیش نظر علامہ اقبال نے یہ شعر کہا تھا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

حضرت عمر ایک بامقصد' اصلاحی اور تعمیری شاعری کے حق میں تھے اسی لئے انہوں نے شعراء کو مشورہ دیا کہ وہ عورتوں کی نسبت عشقیہ شعر کہنے سے گریز کریں۔ اسی طرح وہ اپنے شعری نظریہ پر پورے اترنے والے شاعر سے متعلق کہتے ہیں کہ ''نابغۂ اشعر العرب (سب سے بڑا شاعر) ہے'' اسی طرح اس زمانے کے ایک عظیم شاعر امراء القیس کے شعری فن کے متعلق کہتے ہیں کہ ''وہ (امراء القیس) سب سے آگے ہے' اسی نے شعر کے چشمے سے پانی نکالا' اسی نے

اندھے مضامین کو بینائی عطا کی'' آج شعرو ادب پر گہری نظر رکھنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ امراء القیس عربی زبان کا ایک زبردست شاعر گزرا ہے۔ اس طرح حضرت عمر کی رائے ان سے متعلق کتنی صائب اور درست تھی۔ اس بات سے ان کی شعر سے متعلق تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے اندر شعر فہمی اور شعر نجی کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔

اسی طرح کوفہ کے ایک شاعر بشیر بن ربیعہ نے کچھ اشعار کہہ کر حضرت عمر فاروق کی خدمت میں ارسال کیا ان اشعار میں جنگ قادسیہ میں اپنی شجاعت سے متعلق لکھا تھا۔ حضرت عمر نے یہ اشعار پڑھ کر حضرت سعد کو لکھا کہ ''بشیر بن ربیعہ کو بھی سورماؤں کی فہرست میں شامل کرو'' اس قول سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تعمیری اور بامقصد شاعری یا جوش و جذبے کو بڑھانے والی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ اسی لئے تو انہیں بشیر کی شاعری پسند آئی۔

حضرت عمر کبھی کبھار ترنم سے خود بھی شعر پڑھا کرتے تھے مگر وہ ترنم کی زیادتی یا اس کے رواج کے خلاف تھے۔ آج کل صورت حال یہ ہے کہ ترنم کا ہی مشاعروں میں بول بالا ہے۔ اس لئے اچھی شاعری قلم تک اور بڑی شاعری کم از کم مشاعروں کی حد تک ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ شعر کے معیار کو پرکھنے کے لئے اسے ترنم سے الگ کر کے دیکھنا ہوگا۔ ترنم سے کلام سنانے کا ایک واقعہ حضرت عمر اور ان کے ہمراہیوں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی جب حضرت عمر حج کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو ان کے ہمراہ ایک شاعر خواتؔ بن جبیر بھی تھے۔ ان کے ہمراہیوں نے خوات بن جبیر سے کسی شاعر کے کلام کی فرمائش کی کہ شعر ترنم سے سنائیں مگر حضرت عمر فاروق نے کہا کہ ''نہیں ان سے خود ان کا شعر سنو'' چنانچہ خوات نے اپنے شعر ترنم سے سنائے۔ راستے بھر ان کے کلام سے حضرت عمر محظوظ ہوتے رہے جب صبح ہونے لگی تو فرمایا کہ ''خواتؔ اب گانا ختم کرو صبح ہوگئی'' اس واقعہ سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے اوّل یہ کہ شاعر سے خود شاعر کا کلام سنا جائے۔ دوم شعر ترنم سے ہی کیوں نہ پڑھا جائے اس کی حد ہونی چاہیئے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ حضرت عمر جب قافلے کی صورت میں سفر کر رہے تھے تو

انہوں نے کسی مقام پر جب لوگ ادھر اُدھر اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے ایک شعر ترنم سے پڑھا جس کا مطلب یہ تھا ''کسی اونٹنی نے محمد ﷺ سے زیادہ راست باز اور وعدہ پورا کرنے والے کو اپنے کجاوے پر نہیں بٹھایا'' جب حضرت عمر یہ شعر پڑھ رہے تھے تو قافلے والے ہر طرف سے آ آ کر ان کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔

حضرت عمر نے جب اپنے گرد مجمع دیکھا تو قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی یہ دیکھ کر سب لوگ واپس ہونے لگے۔ حضرت عمر نے بلند آواز سے کہا کہ جب میں نے ساز چھیڑے تو تم چاروں طرف سے آ دھمکے لیکن جب اللہ کا کلام پڑھا تو بھاگ گئے''

ان کے اس اقدام کے پیچھے بھی دراصل یہی نظریہ ہے کہ لوگ صرف ترنم کی وجہ سے شعر کو نہ سنیں اور شعر و نغمہ کو بلاوجہ بہت زیادہ اہمیت نہ دیں۔ المختصر حضرت عمر فاروق کے شعری نظریہ کی بنیاد قرآنی تعلیمات پر ہے۔ شعراء کو تلمیذ الرحمٰن بھی کہا گیا ہے اور شاعری کو پیغمبری کا جزو بھی قرار دیتے ہیں مگر ایسے شعرا تلمیذ الرحمٰن ہیں یا جن کی شاعری کو جزو پیغمبری قرار دیا جا سکتا ہے اس سلسلے میں سورہ الشعراء میں اللہ تعالیٰ صاف صاف فرماتا ہے۔

ترجمہ:۔

''اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں۔ اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر) لوگ خیالی مضامین کے ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے یعنی شرع کے خلاف نہ ان کا قول ہے نہ فعل (یعنی ان کے اشعار میں بیہودہ باتیں نہیں ہیں) اور انہوں نے اپنے اشعار میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا۔''

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں کم از کم اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ تحقیق مبالغہ آرائی کرنے والے شعراء یا جھوٹی شاعری جو مسلک سے دور ہوں اور جس میں حق گوئی سے احتراز کیا گیا ہو وہ پسندیدہ شاعری نہیں۔ ایسے شعراء خیالوں کی دنیا میں بھٹکتے رہتے ہیں یعنی

وہ گمراہ ہیں اور گمراہی پھیلاتے ہیں ایسے شعراء اللہ کی نظر میں قابل تعزیر ہیں مگر وہ جو حق کا ساتھ دیتے ہیں ذکرِ خیر کرتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ جس شاعر کے قول و فعل میں تضاد ہو وہ قابل مذمت ہے مگر وہ لوگ جن کے مضامین بیہودہ نہیں ہیں اور جو ایمان والے ہیں اور کثرت سے اللہ کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے ہیں وہ یقیناً پسندیدہ اور ستودہ ہیں۔

حضرت عمر کے شعری نظریہ کا سرچشمہ اور منبع یہی آیات ربانی ہیں جن کی تشریح اور وضاحت بطرزِ احسن ان کے اقوال میں ملتی ہے۔ شعر کی ماہیت' اس کی ضرورت اور اس کی اہمیت کی تشریح اور وضاحت میں انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور بصیرت سے بھی کام لیا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ اور علامہ اقبالؔ بھی تعمیری اور اصلاحی شاعری کے قائل تھے۔ حالی کی غزلوں میں موضوعات عشق پر اشعار ملتے ہیں۔ علامہ اقبال نے تو عشق کا مفہوم ہی بدل ڈالا اگرچہ داغؔ دہلوی کے زیر اثر ابتدا میں کچھ روایتی غزلیں کہیں مگر بہت جلد ان کی غزلوں کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے غزل کے مزاج میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی۔ اسی لئے علامہ اقبال کی وہ غزلیں جو ضرب کلیم میں شامل رہیں۔ ان کو اردو غزل کا نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ مولانا حالی نے عشقیہ غزلیں کہیں مگر جب وہ سرسید کی تحریک سے متاثر ہوئے تو ان کی شاعری کا رخ بدل گیا یعنی ان کی شاعری نے اصلاحی رنگ اختیار کر لیا اس طرح اپنی شعر گوئی کو ملت کی فلاح اور بہبود کے لئے وقف کر دیا۔ حالی نے مسدس میں یہ بھی کہا اور شاید اسی نظریئے کے تحت کہا تھا

گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

حالی شاعری کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ بامقصد اور ملی شاعری کے قائل تھے اور اس سلسلے میں مسدس حالی ان کا ایک اہم ملی کارنامہ ہے۔ یعنی اس طرح وہ حضرت عمر کے شعری نظریہ کے حامل نظر آتے ہیں۔

☆......☆

اردو قصیدے کا ارتقا

اگر چہ یہ دور قصیدے کا دور نہیں ہے مگر ایک زمانے میں اس کا بڑا شہرہ اور چرچا تھا اور اس صنف کا شمار مقبول اصناف میں ہوتا تھا۔ شاہوں' نوابوں اور راجاؤں کے دور میں اس صنف کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ عام طور پر لوگ یہی سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کہ قصیدہ صرف بادشاہ' وزیر یا کسی امیر کی تعریف میں لکھی جانے والی نظم ہوتی ہے مگر جب ہم بالخصوص عربی قصائد کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ کسی کی بہادری کے کارنامے پر فخر و ناز کرنے کے لیے قصائد لکھے جاتے تھے۔ قصیدے کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عربوں میں خاص طور پر یہ دستور تھا کہ جب کوئی شاعر کسی قوم میں نام پیدا کرتا تو بڑی خوشی کا اظہار کیا جاتا اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ شاعر خاندان کا نام بلند کرے گا بعض قصیدے روحانی بزرگوں کی تعریف میں لکھے گئے ہیں اور کچھ حمدیہ اور نعتیہ قصائد بھی لکھے گئے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قصیدے کے لیے مضمون کی قید نہیں مگر فی زمانہ قصیدہ نگاری کا رواج بہت کم ہو گیا اور اب نہ شاہ رہے نہ نواب۔ مگر جو قصیدے عربی' فارسی اور اردو میں شاہوں' وزیروں اور امراء کی شان میں لکھے گئے ہیں ان کی اپنی ایک ادبی حیثیت ہے اس کے ذریعے اردو زبان و ادب کی جو خدمت ہوئی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قصیدے کو معتوب صنف سخن کہتے وقت لوگ اس کے افادی پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھیں تو قصیدے کا فیضان آج بھی جاری ہے۔ قصیدے نے ہماری زبان کو وسعت دی اور اس نے ہماری شاعری کو آگے بڑھایا ہے جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ دوسری صورتوں میں قصیدہ سرائی اور ثنا خوانی آج بھی جاری ہے اردو غزل قصیدے ہی کی دین ہے۔

یعنی قصیدے کی تشبیب نے اردو غزل کو جنم دیا' جس طرح اردو غزل اردو شاعری کی آبرو اور اس کا سرمایہ ہے اسی طرح قصیدہ بھی اردو کے شعری ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ہم یہ جانتے ہیں کہ قصیدہ نگاروں نے مبالغے کا بے دریغ استعمال کیا ہے اور اس طرح قصیدہ نگاروں کی مبالغہ آرائی اور دروغ بازی نے اردو شاعری کو نقصان بھی پہنچایا ہے مگر ایسے اعتراضات تو غزل اور اردو مثنوی پر بھی کئے جاسکتے ہیں اور کئے جاتے ہیں' قصیدے میں چونکہ ممدوح کی تعریف بھی مقصود ہوتی ہے اس لئے اس میں شعور پیدا کرنے کے لیے شعراء مبالغے سے کام لیتے تھے اور لیتے ہیں بلکہ مبالغے کی حد سے بھی گذر جاتے ہیں۔ایسی مثالیں اردو غزل میں بھی مل جائیں گی میں صرف ایک مثال پر اتفاق کرتا ہوں:۔

اک دن فراق یار میں رویا جو رات بھر ☆ ہفت آسماں پہ پہنچا تھا پانی کمر کمر

قصیدے میں مبالغے کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔اس ضمن میں ظہیر فاریابی کے قصیدے کا یہ شعر قابل ذکر ہے جو اس نے اپنے ممدوح قزل ارسلاں کی مداحی میں لکھا ہے۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے ☆ تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

(یعنی خیال جب آسماں کی نو کرسیوں کو پاؤں کے نیچے رکھ لیتا ہے تب قزل ارسلاں کی رکاب کو چوم سکتا ہے)

لیکن چونکہ غزل گوئی کا عمل جاری رہا اور یہ صنف کسی شاہ اور وزیر کی محتاج نہیں رہی اس لیے اس کے موضوعات میں میں خاطر خواہ اور عصری تقاضوں کے تحت تبدیلیاں ہوتی رہیں اس لیے غزل ہر دور میں مقبول رہی اور آج بھی تمام اصناف سخن میں غزل سب سے زیادہ کہی جارہی ہے مگر قصیدے کے معاملے میں یہ بات بھی دیکھی گئی ہے کہ اس میں صرف مدح کا پہلو ہی نہیں ہوتا اس کے دیگر اجزاء میں شعری محاسن دیکھے جاسکتے ہیں۔بہت سے اردو کے قصیدہ نگاروں نے مدح میں بھی حسن اور اعتدال قائم رکھا ہے۔سعدی شیرازی نے تو قصیدے میں بادشاہوں کو نصیحتیں بھی کی ہیں۔ان سے پہلے بھی خاقانی اور انوری نے بھی اپنے بعض قصیدوں کی تشبیب میں بے ثباتی

عالم کا نقشہ بھی کھینچا ہے ۔علم وعرفان اور تصوف کے بعض نکتے پیش کئے ہیں ۔یہ بات اردو قصیدوں میں نہیں ملتی ۔بعض لوگ قصیدہ نگاروں سے زیادہ ان کے ممدوح یعنی سلاطین و وزرا امراء سے برانگیختہ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر حامد اللہ افسر کی یہ رائے دیکھئے۔

''مجھے شعراء سے زیادہ سلاطین و امرا کی بدمذاقی پر حیرت ہے جن کی تعریف میں یہ قصیدے کہے جاتے تھے۔ خدا جانے وہ کیوں کر اس لغویت کو برداشت کر لیتے تھے۔لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں قزل ارسلاں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سب کے سب بادشاہ بدمذاق اور بے وقوف نہیں تھے۔ وہ اپنی بساط اور حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ انہیں صرف خوش کرنے کے لیے کہا جارہا ہے اس لیے وہ ان کو خوش کردیا کرتے تھے خوشی کس کو پسند نہیں وہ بھی انسان تھے ان کے اندر بھی یہ بشری کمزوری تھی مبالغے میں بھی بعض شعراء نے اپنی جولانی طبع دکھلائی ہے۔ٹی ۔ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ "A Writer Writes Of His Own Time" یعنی ادیب اپنے دور کا ترجمان ہوتا ہے۔اس لیے جو باتیں اس دور میں مروج تھیں اور جس بات کا سلاطین و امراء تقاضا کرتے تھے یا ان کا مزاج اور ان کی طبیعت جس کی متقاضی تھی قصیدہ نگار ان کی ترجمانی اور عکاسی کرتے تھے۔

قصیدہ نگاروں نے مختلف قدرتی مناظر، بہار کا منظر، عشقیہ مضامین حقائق زندگی، تصوف، فلسفۂ زندگی وعظ و پند وغیرہ سے مملو مضامین کو اپنے قصیدے میں جگہ دیتے تھے۔ یہ خصوصیات فارسی قصائد میں زیادہ اور اردو قصائد میں کم ملتے ہیں۔ اردو کے بعض شعراء نے فارسی قصائد کو سامنے رکھ کر قصائد کہے ہیں۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال نے بھی اپنی نظم ''ماو تو'' کہتے وقت ظہیر فاریابی کے قصیدے کی تشبیب کو پیش نظر رکھا ہے۔ اردو کے ایک اہم قصیدہ نگار سودا نے انوری، خاقانی اور عرفی کے انداز میں قصیدے لکھ کر اس صنف سخن کو بلندی تک پہنچایا اور ایک طرح سے اردو کے قصیدے کو فارسی کے قصیدے کے ہم پلہ کردیا۔ عرفی کا ایک مشہور قصیدہ ہے جو قصیدہ لامیہ ہے جو اس نے اکبری دربار کے ممتاز امیر میر ابوالفتح کی مدح میں لکھا ہے اور اس قصیدے کا مطلع ہے۔

چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بہ حمل
شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

مرزا سودا نے اس قصیدے پر اپنا مشہور قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

انوری کی تقلید میں سودا نے کے ہجو نگاری کی ہے۔اس نے بھی ایک گھوڑے کی ہجو میں اپنا مشہور قصیدہ 'تضحیک روزگار' لکھا ہے۔اس ہجو یہ قصیدے کا شمار اردو کے مشہور اور مقبول قصیدوں میں ہوتا ہے۔اس طرح سودا نے خاقانی 'کہ ہمت ورزنا شئیست بازانو د پیشانی'۔اس زمین میں سودا نے کا ایک نعتیہ قصیدہ لکھا ہے جس کے قافیے نورانی 'مسلمانی' ورخشانی وغیرہ ہیں۔خاقانی کا ایک اور مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے

ایں گرز جہاں علامت انصاف شد نہاں
اے دل کرانہ کن زمیاں خانۂ جہاں

اس زمیں میں جو قصیدہ سودا نے لکھا ہے اس کا مطلع ہے

شکر خلد سے کیوں نہ حکیموں کی ہو زباں
جب شہرہ سے مرے ہو بلا اس قدر جہاں

ممدوحین کے لحاظ سے قصیدے کی دو اہم قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) سلاطین و امراء کی مدح والے قصیدے

(۲) بزرگان دین کی مداح والے قصیدے

سودا کے وہ قصائد جو انہوں نے آصف الدولہ 'عالم گیر ثانی' غازی الدین خان 'شجاع الدولہ کی مدح میں کہے ہیں اس پر ان کو معاصرین اور متاخرین سے داد ملی ہے۔سودا کے قصیدوں سے متعلق مولانا عبدالسلام کہتے ہیں کہ "مشکل لیکن دل آویز ردیفیں اختیار کی ہیں اور ان کو نہایت

خوبی کے ساتھ نبھایا ہے" ڈاکٹر خلیق انجم سودا کی قصیدہ گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مشکل اور سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دینا سودا ہی کا کام تھا۔" سودا نے جہاں امراء کی قصیدہ گوئی میں اپنے فن اور کمال کا مظاہرہ کیا ہے وہاں انہوں نے بزرگان دین کے جو قصائد لکھے ہیں ان میں اپنی عقیدت کا اظہار دلنشیں اور موثر انداز میں کیا ہے۔ انہوں نے بزرگان دین پر جو قصائد لکھے ہیں ان کی تعداد ان قصائد سے زیادہ ہے جو انہوں نے سلاطین امراء اور نوابین کی مدح میں کہے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر عتیق احمد کا کہنا ہے کہ

"انعام و اکرام کی توقع کے باوجود سودا نے سلاطین امراء و نوابین کی مدح میں جو کچھ کہا وہ مقداری اعتبار سے (معیاری اعتبار سے قطع نظر) اس کلام سے کم ہے جو ان مذہبی شخصیات کی شان میں کہا گیا۔"

اس سلسلے میں وہ پروفیسر کلیم الدین احمد کے ہم نوا و ہم خیال نظر آتے ہیں۔

"اگر اکثر و بیشتر نفع کی امید مدح کی متحرک ہوتی ہے تو کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر قصیدے کو اظہار عقیدت کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس طرح قصیدے میں مذہب اور مذہبی عقائد کی رنگ آمیزی ہوتی ہے لیکن یہ رنگ آمیزی کسی گہرے پر جوش مذہبی جذبے سے متاثر و مجبور ہو کر نہیں ہوتی۔ اس قسم کے قصیدوں میں عقیدت کے سوا کچھ نہیں ہوتا" (اردو شاعری پر ایک نظر)

سودا نے اپنے قصیدوں کے الگ الگ نام بھی رکھے ہیں۔ مثلاً بحر بیکراں (در مدح حضرت علیؑ) کوہ دو پیکر (کاظمین رخ کی منقبت میں)۔ صبح صادق (حضرت امام صادقؑ کی مدح میں) ایک غیر مطبوعہ قصیدہ "خلاصۃ الاوراد" (جو حضرت امام زین العابدین کی مدح میں ہے)" رزمیہ بہار سیف الدولہ کی تعریف میں "تضحیک روزگار (گھوڑے کی ہجو میں) اسی طرح ایک غیر مطبوعہ قصیدہ شیخ بریلی کی ہجو میں ہے جس کا نام انہوں نے "مضحکۂ روزگار" رکھا ہے۔ یہ سارے نام سودا کی جدت طبع کا ثبوت ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں سودا نے اساتذہ کے مشہور قصیدوں پر قصیدے لکھ کر اپنی صلاحیت فصاحت اور استادی کا ثبوت دیا ہے ان کی اس روش کو اگر ہم تقلید کی روش بھی کہیں تو بھی ان کے فن کی ان کو داد دینی پڑے گی۔ کیونکہ انہوں نے ان مشکل زمینوں میں بھی اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے اور ان میں ندرت پیدا کی ہے۔ ان کے قصائد میں بزاز و ندرت بیان اور شگفتگی ملتی ہے۔ ان کے ایک قصیدے کا مطالعہ اس سلسلے میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس قصیدے میں مبالغے کا زور ایسا ہے کہ جس پر صاف آمد کا گمان ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ انوری کی زمین میں کہا ہے۔

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل ☆ تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض ☆ ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل

واسطے خلعت نوروز ہر باغ کے بیچ ☆ آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی ☆ پوشش چھینٹ قلمکار بہ ہر دشت و جبل

عکس گلبن دو زمیں پر ہے کہ جس کے آگے ☆ کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ ☆ ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

آب جو گرد چمن لمعہ خورشید سے ہے ☆ خط گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

سایہ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر ☆ ساغر لعل میں جو کیجئے زمرد کو حل

سنگ نے رتبہ آئینہ کیا ہے پیدا ☆ تیغ کہسار ہوئی بسکہ ہوا سے صیقل

سودا کے قصائد کے مطلع یعنی تشبیب بہت بلند اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ ایک قصیدے کے چند اشعار دیکھئے۔

برج حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار ☆ کھینچے ہے اب خزاں پہ صف لشکر بہار

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام ☆ حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام

ہوائے فیض سے ایسا ہے سبز باغ جہاں ☆ شبیہ سنبل تر سے ہے موج ریگ رواں

میر تقی میر کا اصل میدان غزل ہے مگر انہوں نے چند قصیدے بھی کہے ہیں مگر ان کے تمام قصیدوں کا مزاج ایک جیسا ہے۔ میر کے قصیدے ہلکے پھلکے نظر آتے ہیں۔ سودا کی طرح ان کے قصیدوں میں وہ شان و شکوہ اور طمطراق نظر نہیں آتا۔ میر ہمیشہ پریشان خاطر رہے۔ ان کے قصیدوں پر ان کی شکستہ خاطری اور ان کے مزاج کی افسردگی کے عکس نظر آتے ہیں۔ غزل کے لیے سوز چاہیے مگر قصیدہ گوئی جوشِ بیان کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے وہ غزل گوئی میں کامیاب ہیں مگر قصیدہ نگاری میں کامیابی نہیں مل سکی۔ ان کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے

جو پہنچے قیامت تو آہ و فغاں ہے کہ تا مرے ہاتھ میں دامن آسماں ہے

اس قصیدے میں شروع سے آخر تک اسی درد و غم کا اظہار ہوا جو میر کی غزل گوئی کی خصوصیت ہے۔

قصیدہ ایک مشکل فن ہے۔ بہت غور و فکر اور بڑی محنت کے بعد ایک اچھا قصیدہ وجود میں آتا ہے۔ قصیدہ گو کو بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اسے زبان و بیان، پرشوکت الفاظ روانی اور تسلسل کا بطور خاص خیال رکھنا پڑتا ہے وہی قصیدہ کامیاب قصیدہ کہا جاتا ہے جس میں اس کے چاروں اجزاء یعنی تشبیب، گریز، مدح اور عرض مطلب یا دعا میں ایک فطری ربط پایا جاتا ہو یعنی چاروں اجزا ایک دوسرے سے فطری طور پر مربوط ہوں اگر تشبیب فطری نہ ہو۔ یعنی اس پر آمد نہیں بلکہ آورد کا گمان ہو تو قصیدے کی خوبی خاک میں مل جاتی ہے۔ تشبیب کا گریز ایسا ہو جسے پڑھ کر یہ گمان نہ ہو شاعر نے دانستہ گریز کیا ہے بلکہ اس بات کا احساس ہو کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اور پڑھنے والا ممدوح تک ذہنی طور پر اس طرح پہنچ جائے کہ اس کو درمیان کا فاصلہ محسوس نہ ہو۔ قصیدے کے لیے زبان و بیان اور الفاظ کا بھی خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ قصیدہ نگار کسی بادشاہ یا کسی بزرگ ہستی کی تعریف کرتا ہے اس سے وہ قصیدے لئے شاندار اور پرشکوہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ سودا، مومن، ذوق اور غالب نے ان باتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ مگر جب ہم اردو قصیدے کے ارتقا کا منزل بہ منزل جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس کے ابتدائی دور میں کوئی

کامیاب قصیدہ نگار نظر نہیں آتا۔ شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ہماری زبان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی بلکہ اردو زبان اس وقت ابتدائی حالت میں تھی۔ دوسرے یہ کہ اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوتی ہے شاعری کے آغاز میں دو طبقے نظر آتے ہیں ایک طبقہ تو بادشاہوں کا ہے اور دوسرا طبقہ صوفیوں اور درویشوں کا طبقہ ہے۔ اس طرح بادشاہ خود تو قصیدہ کیوں لکھتا۔ صوفی اور درویش منش لوگوں نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ یہ چیز ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ صوفی منش شاعروں میں وَلی نے خاصی شہرت حاصل کی تھی۔ انہوں نے چند قصیدے کہے۔ مگر ایک تو زبان کی تنگ دامنی اور دوسرے شعراء کی درویشانہ فطرت کی وجہ سے قصیدے میں زور اور اثر پیدا نہ ہوسکا جو فارسی قصیدہ گویوں کے ہاں پایا جاتا تھا۔ ولی دکنی نے جو قصیدہ حضرت شاہ وجیہ الدین کی مدح میں لکھا ہے وہ بھی دکنی الفاظ اور اجنبی الفاظ سے بھرا ہوا ہے مگر اس کے بعد ہی قصیدے کا سنہرا دور آتا ہے اور وہ زمانہ سودا کا ہے۔ سودا اور ان کی قصیدہ نگاری کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ سودا نے فارسی کے مشہور اور کامیاب قصائد کو پیش نظر رکھا اور فارسی کے ممتاز قصیدہ گو یعنی خاقانیؔ انوریؔ اور عرفیؔ کے قصیدوں کے جواب میں قصیدے کہہ کر یہ بات ثابت کردی کہ وہ اردو کے ایک کامیاب قصیدہ نگار ہیں۔

سودا اور میرؔ کے بعد انشاءؔ اور مصحفیؔ کا دور آتا ہے۔ ان شعراء نے کم از کم میرؔ سے بہتر قصیدے لکھے مگر ان کا بھی شمار اہم اور کامیاب قصیدہ نگاروں میں نہیں ہوتا ہے۔ انشاء علم و فضل زبان دانی اور ذہانت میں سودا سے کم نہ تھے مگر اپنی افتادِ طبع اور غیر سنجیدگی کے سبب قصیدہ گوئی میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ مصحفیؔ بھی قصیدہ نگاری میں کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ ان کی طبیعت میں زور نہیں تھا اور قصیدہ گوئی زورِ طبیعت کا تقاضا کرتی ہے۔ آتشؔ اور ناسخؔ نے شاعری میں نام پیدا کیا مگر ان کی طبیعت قصیدہ گوئی کی طرف مائل نہ ہوسکی۔ دہلی کے اہم اور ممتاز شعراء نے یعنی ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ نے صنف قصیدہ کی طرف توجہ دی۔ اگرچہ ان شعراء نے بہت کم قصیدے کہے ہیں مگر ان کے قصائد میں ہم ایک نئی آن بان اور شان دیکھتے ہیں۔ ذوقؔ نے سوداؔ کے بعد

قصیدہ گوئی میں کامیابی اور شہرت حاصل کی ۔عبدالسلام ندوی ذوق کی قصیدہ نگاری کے متعلق کہتے ہیں کہ

"ذوق میں اس فطری سادگی کا فقدان ہے جو سودا کے قصاید کی نمایاں خصوصیت ہے لیکن یہ کمی اس طرح پوری ہوگئی ہے ذوق نے کلام کی چستی اور بندش کی دلآویزی سے قصیدے میں بہت حد تک بے ساختگی پیدا کر دی۔"

ذوق کے ہاں قصیدے کے چاروں اجزاء میں ایک خوشگوار ربط ملتا ہے۔وہ تمام مرحلوں سے آسانی اور کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔مثال کے طور پر ان کا یہ قصیدہ ملاحظہ کریں جو انہوں نے شہزادہ مرزا ابوظفر کے جشن غسل پر لکھا تھا

واہ وا! کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا ☆ مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

اس قصیدے میں ذوق کی جولانی طبع اور ان کا زور بیان نظر آتا ہے۔ذوق بھی خاقانی کی طرح سے علوم کے ماہر تھے۔یعنی علم نجوم،علم ہیت،طب،منطق،فلسفہ،فقہ،تصوف،تفسیر،حدیث،تاریخ اور موسیقی میں اچھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔کہیں کہیں اصطلاحات کے استعمال سے ان کے ہاں ثقالت بھی پیدا ہوگئی ہے لیکن خاقانی کے قصائد کی جیسی ثقالت ان کے یہاں نہیں ملتی۔

ذوق کو ان کے ایک قصیدے کے صلے میں ایک گاؤں انعام ملا تھا

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت ☆ نشۂ غم میں سرمست غرور نخوت

مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے ☆ تھا تصور سراسر میں تصدیق صفت

ہوگیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو ☆ تھا مرا ذہن نہ محتاج حصول صورت

جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام ☆ عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت

مندرجہ بالا اشعار میں تصور، تصدیق، حصولی، حضوری، نظری، بدیہی وغیرہ منطق کی اصطلاحات ہیں جن کو ان اصطلاحات کا علم نہ ہو وہ اس قصیدے کے اشعار نہیں سمجھ سکتا۔

ذوق ایک شائستہ اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے اس لیے ان کے قصائد میں وہ جوش و جذبہ نہیں ہے جو سودا کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن سلام سندیلوی کے بقول سودا کے یہاں تعقید اور سستی ترکیب کثرت سے مل جائیں گے لیکن ذوق کے قصیدوں میں یہ نقص نظر نہیں آتا اس کے علاوہ ذوق نے اپنے قلم کو ہجوگوئی سے آلودہ نہیں کیا

مرزا غالب نابغۂ روزگار تھے۔ قدرت نے ان کو اعلیٰ دماغ اور اعلیٰ ذہن دیا تھا۔ وہ جس میدان میں نکل جاتے تھے وہاں اپنا جھنڈا گاڑ آتے تھے۔ مرزا غالب نے صرف چار قصیدے کہے ہیں دو بزرگوں کی تعریف میں یعنی حضرت علی کرم رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہیں اور دو قصیدے اس زمانے کے بادشاہ یعنی بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے ہیں لیکن ’ہر چہ در قامت کہتر در قیمت بہتر‘ کے مصداق یہ چاروں قصیدے اپنا جواب آپ ہیں۔ ان قصیدوں کی روشنی میں مرزا غالب کی استادی کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے مدحیہ قصیدوں میں بڑا زور پیدا کیا ہے گویا کہ جوش بیان اور زور بیان کا دریا بہا دیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں اگرچہ انہوں نے صرف دو قصائد لکھے ہیں مگر ان سے ان کی قصیدہ نگاری کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے ان کو خود کمپنی بہادر سے پنشن ملتی تھی وہ کسی کو کیا جاگیریں عطا کر سکتے تھے یا مالی امداد دے سکتے تھے اگر ایسا کرنے کے قابل ہوتے تو یقیناً مرزا غالب ان کے لئے مزید قصائد لکھ سکتے تھے کیوں کہ مرزا غالب ضرورت مند بھی تھے اور قصیدہ نگاری میں کمال کی دسترس رکھتے تھے۔ مرزا غالب نے اپنی جدتِ فکر اور جدتِ ادا سے قصیدہ نگاری کو نیا مزاج عطا کیا ہے۔ بالخصوص ان کے قصیدوں کی تشبیب بڑی جاندار ہے مثال کے طور پر ان کے ایک قصیدے کے چند ابتدائی اشعار دیکھئے۔

یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں اور یہ غالب کا تیسرا قصیدہ ہے۔

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب بندۂ عاجز ہے گردش ایّام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

عذر میں تین دن نہ آنے کا لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا صبح جو جاوے اور آوے شام

غالب کے اس قصیدے کا شمارہ بلند اور عمدہ قصیدوں میں ہوتا ہے۔اس قصیدے کے بارے میں عبدالسلام ندوی (شعرالہند کے مصنف) کا کہنا ہے کہ یہ قصیدہ اردو شاعری کے لئے سرمایہ نازش ہے''نظم طباطبائی نے بھی اس قصیدے کو بہت زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' یہ قصیدہ اور خصوصاً اس کی تشبیب ایک کارنامہ ہے مصنف کے کمال کا'اور زیور ہے اردو شاعری کے لئے۔اس زبان میں جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ہے اس طرح کی تشبیب کم کہی گئی ہے''

اس تشبیب کے بعد مرزا غالب نے غزل کے چند اشعار لکھے ہیں پھر ماہ کی طرف خطاب کر کے گریز اختیار کیا ہے یہ ایک خوبصورت گریز کی عمدہ مثال ہے۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ اے پری چہرہ پیک تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ہیں مہ و مہر زہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن نام شاہنشہ بلند مقام

قبلہ چشم و دل بہادر شاہ مظہر ذوالجلال والاکرام

مرزا غالب کا ایک اور مشہور قصیدہ ہے۔اس قصیدے (صبح دم دروازۂ خاور کھلا) سے متعلق مولانا عبدالسلام ندوی کہتے ہیں کہ'' یہ پورا قصیدہ تشبیب سے مدح و دعا تک جوش بیان کا بہترین نمونہ ہے''

اس قصیدے کے ابتدائی چند اشعار دیکھئے اور یہ دیکھئے کہ بقول عبدالسلام ندوی کہ جوش اور زور بیان نے ان کے قصائد (غالب) کو ایک نعرہ جنگ بنا دیا ہے۔اس نعرہ جنگ کی عکاسی اس قصیدے میں ملتی ہے یہ مرزا غالب کا چوتھا قصیدہ ہے۔

صبح دم دروازہ خاور کھلا ۔ مہر عالم تاب کا منظر کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں ۔ شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیما کی سی نمود ۔ صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ۔ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

ان قصائد سے پہلے دو قصیدے بزرگان دین یعنی حضرت علیؓ کی مدح میں ہیں۔ پہلے قصیدے کا مطلع یہ ہے:۔

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار ☆ سایۂ لالہ بے داغ سویدائے بہار

اس قصیدے میں مطلع ثانی بھی ہے جو یہ ہے:۔

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار ☆ دلِ پروانہ چراغاں پرِ بلبل گلزار

حضرت علی کی مدح میں دوسرے قصیدے کا مطلع یہ ہے:۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ☆ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

مرزا غالب نے اس قصیدے کا پہلے یہ مطلع کہا تھا:۔

تو ڑ ہے عجز تنک حوصلہ بر روئے زمیں ☆ سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

مگر اس کے بعد مذکورہ بالا مطلع درج کر دیا۔

پہلے قصیدے یعنی "سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار" کے بہاریہ تشبیب سے متعلق نور الحسن نقوی کہتے ہیں کہ "گیارہ اشعار کی اس تشبیب میں بہار کی کوئی زندہ تصویر بنتی نظر نہیں آتی بلکہ ذہن ژولیدہ بیانی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ مجھے ان کے خیال سے اتفاق نہیں مرزا غالب ذوق کی طرح سادہ بیانی سے کام نہیں لیتے تھے غالب کے قصیدے میں بھی مشکل پسندی یا دشوار پسندی نمایاں ہے۔ اس تشبیب کے یہ اشعار دیکھئے جس سے نور الحسن نقوی کا یہ خیال باطل ہو جاتا ہے کہ ان کی اس تشبیب میں بہار کی کوئی زندہ تصویر نظر نہیں آتی۔ اس تشبیب کے یہ اشعار دیکھئے اور قارئین کرام خود فیصلہ کریں۔

راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار	کوہ وصحرا ہمہ معموری شوق بلبل
سرنوشت دو جہاں ابر بہ یک سطر غبار	سونپے ہے فیض ہوا صور مژگان یتیم
قوت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار	کاٹ کر پھینکئے ناخن تو بہ انداز ہلال

اس قصیدے کی تشبیب متصوفانہ ہے یعنی تشبیب جو دس اشعار پر مشتمل ہے ان میں مرزا غالب نے فلسفہ وحدت الوجود کی تائید کی ہے پھر گریز کیا ہے یعنی حضرت علی کی مدح میں شعر گوئی کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

مرزا غالب کے بعد مومن کی قصیدہ نگاری کا ذکر از حد ضروری ہے کہ مومن نے بھی عمدہ اور کامیاب قصیدے لکھے ہیں۔ مومن کے یہاں مرزا غالب جیسی جامعیت اور آفاقیت نہیں مگر مومن نازک خیالی میں مرزا غالب سے بھی سبقت لے گئے۔ اس کے علاوہ مومن نے بادشاہوں کی مدح سرائی سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ ان کے صرف دو قصائد ایسے ملتے ہیں جن میں ایک نواب کی تعریف میں اور دوسرا راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں ہے مگر یہ قصیدے بھی صلے کی امید میں نہیں لکھے۔ مومن کے یہاں بھی مذہبی قصائد ملتے ہیں۔ انہوں نے خلفائے راشدینؓ کی تعریف میں بھی قصائد لکھتے ہیں۔ مومن نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی قصیدے لکھے ہیں ان دونوں زبانوں میں لکھے گئے قصائد میں شعری محاسن اور فنی لوازم بہ حد کمال دیکھے جا سکتے ہیں۔ مومن کے قصائد کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے قصیدوں میں فارسی کی دلکش تراکیب اور لطیف بندشیں ملتی ہیں جس کو اختراع کا نام دیا جا سکتا ہے۔

مومن کی قصیدہ نگاری کے بارے میں پروفیسر ضیا احمد صاحب لکھتے ہیں

کہ ''مومن سے پہلے جس قدر شعرا گزرے ہیں قصیدے میں (باستثنائے سوداؔ) مومن کا کوئی ہمسر نہیں اگرچہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہوسکتا''

مگر ان کی اس رائے سے جزوی اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کہتے ہیں کہ:

''مگر نہایت ادب کے ساتھ اس قدر اور اضافہ کرنے کی جرأت کریں گے کہ اگرچہ ذوق کی زبان صفائی اور روانی میں امتیازی درجہ رکھتی ہے لیکن انکی شاعری (قصیدہ ہو یا غزل) بڑی حد تک روایتی ہے۔ اساتذہ فن میں صرف دو بڑے فنکار ایسے ہیں جن کے قصائد غیر فانی کہے جاسکتے ہیں سودا فکر کے تنوع اور زندگی کی ترجمانی کے لحاظ سے۔ دوسرے مومن خلوص جذبات اور جوش بیان کے اعتبار سے''

اس سلسلے میں ان سے اتفاق کرتے ہوئے سودا کے سلسلے میں صرف یہ کہوں گا کہ جہاں تک روایت کی پرستاری یا فارسی کے ممتاز قصیدہ گویوں سے استفادے کا تعلق ہے تو یہ کام سودا نے بھی کیا ہے۔ اس کی مثالیں بھی سودا کے باب میں دے چکا ہوں (گو بہت اختصار کے ساتھ)

مومن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنا پہلا قصیدہ ''حمد الٰہی'' کی صورت میں لکھا ہے۔ اس قصیدے کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

مومن کہے کس سے حال آخر ہے کون ترے سوا خدایا

وہ جوش اور عقیدت جو ہم ان کی حمد میں دیکھتے ہیں وہ ان کی نعت اور مناقب میں بھی نظر آتا ہے۔ تشبیب کے چند اشعار دیکھئے

شرف مدینے کو جس سے ہے ہو نہ ہو وہ ہے جسے بتاتے ہیں محبوب حضرت قدوس

جو خواب میں بھی کبھی دیکھتی جمال اس کا تو دیتی دل کہیں یوسف کو دختر طیلموس

جو شمع بزم کہوں اس کے روئے تاباں کو کتان ماہ بنے نور شعلہ فانوس

وہ کون احمد مرسل شفیع ہر دوسرا جو خلق کا سبب اور باعث معاد نفوس

مدح کے حصے میں مومن کہتے ہیں:۔

جہاں مطاع شہنشاہ آفتاب نشاں فلک سریر قمر طلعت و ملک ناموس

سیاہ چشموں کو مشکل نگاہ دزدیدہ یہ اسکے حفظ سے ہے ملک معدلت مہروس

کرم میں دوں اسے نسیاں سے کس طرح تشبیہ کروں میں جان کے کیوں ترقئی معکوس

اب ان کی منقبتوں سے کچھ مثالیں دوں گا تا کہ ان کی منقبت نگاری کا اندازہ ہو سکے:۔

درمدح حضرت ابوبکر صدیقؓ

اے مسیحا دم رواں پرور زندگی بخش دین پیغمبر
گرمی التفات سے تیری خشک ہو عاصیوں کا دامن تر
تو وہ سلطان کہ بارگہ تری پست کا شانہ ہے فلک منظر

درمدح حضرت عثمان غنیؓ

کرم اس کا ہو اگر پایہ فضائے اعداد ذرا وہ عرش کو بھی گنئے حد شمار
اس کے تمکیں سے اگر کوہ کو دیجئے تشبیہ یقیں ہے شعلہ جوالہ کو آ جائے قرار

حضرت عمر فاروقؓ کی مدح میں

امام اہل یقیں شہر یار کشور عدل امیر لشکر دیں و مبارز مقبل
بلند پایہ عمرؓ جس کے قصر رفعت کا گدائے خاک نشیں شاہ آسمان منزل

درمدح حضرت علیؓ مرتضیٰ

سیف و قلم ہیں دونوں ستون کاخ دین کے حیراں ہوں باب علم کہوں یا جہان تیغ
رنگیں بیان ہو گئے ترے غزوہ کے ذکر میں پڑھنے لگے درود لب خونچکان تیغ

☆

دو قصائد یعنی ایک قصیدہ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک اور دوسرا قصیدہ راجہ اجیت سنگھ کی تعریف میں لکھا ہے:۔

نواب وزیر الدولہ کے متعلق یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ نواب صاحب سے مومن کو مذہبی لگاؤ بھی تھا مومن کے اس قصیدے کے چند اشعار دیکھئے:۔

بخشش بے شمار اے مشکل ہے دبیر فلک کو دیوانی
اس کے عہد کرم کی نسبت سے بڑھ گئی عمر عالم فانی
ہے سخاوت اسے قرار کہاں کہ ہے عادت طبیعت ثانی

اس قصیدے میں ان کے گھوڑے کی تعریف میں بھی چند اشعار کہے ہیں۔ راجہ اجیت سنگھ کی تعریف میں جو قصیدہ کہا ہے اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ کریں۔

تو سن باد پا ترا روز وغا بگاڑ دے صرصر عاد کی ہوا دم میں وہ بجھا کے صرصری
سیر ریاض میں نسیم سطح ہوا پہ بوئے گل عرصہ بحر طے کرے آن میں بے شناوری

مومن نے اپنے قصائد میں اصطلاحات علیہ کثرت سے استعمال کئے ہیں جن سے ان کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کئی زبانوں اور کئی علوم پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ فلسفہ' طب' ریاضی' ہیئت' عملیات' نحو' شاعری' تصوف نرد وغیرہ۔ وہ صنائع اور بدائع کا بھی استعمال کرتے ہیں جن سے انکی علمیت اور صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر ضیا احمد بدایونی نے اپنے عالمانہ مضمون 'ایوان قصیدہ کے ارکان اربعہ' (مطبوعہ اردو قصیدہ نگار مرتبہ ڈاکٹر ام ہانی اشرف) میں اردو کے چار بڑے قصیدہ نگاروں کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے ان میں سودا' ذوق' غالب اور مومن شامل ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہ قصیدہ نگاری کے چار بڑے ستون ہیں۔ ویسے انہوں نے ضمنی طور پر ولی' دکنی' میر' انشاء' مصحفی کا بھی ذکر کیا ہے مگر ان قصیدہ نگاروں کو وہ حیثیت اور اہمیت نہ مل سکی جو سودا' ذوق اور غالب کو ملی۔ اپنے اس مضمون کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں کہ

''درحقیقت یہ چاروں باکمال (سودا' ذوق' غالب' مومن) قصیدے کے ایوان کے چار ستون ہیں اور ان میں سے کسی کو نظر انداز کر دینا ہمارے لئے غیر ممکن ہے''

مجھے بھی ان کی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے مگر ان قصیدہ نگاروں کے بعد کچھ لوگ جن میں اردو ادب کے چند اہم نام شامل ہیں یعنی مولانا احسن مارہروی اور محمد حسین عسکری محسن کاکوروی کو معروف قصیدہ نگاروں میں شامل کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ویسے قصیدے نہیں لکھتے جیسے کہ سودا' غالب' ذوق اور مومن نے لکھے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا دور تو شاہوں' وزیروں اور امراء کا دور نہیں تھا اس لئے ایسے لوگوں کی مدح میں کیسے قصیدے لکھتے۔ اس لئے انہوں نے بزرگوں کی مدح (روحانی اور دینی بزرگوں) کی

تعریف میں قصیدے لکھے مگر ایسے قصیدے تو مرزا سودا' مرزا غالب اور مومن نے بھی لکھے اور خوب لکھے۔ اس معیار تک ان کے مذہبی قصیدے نہ پہنچ سکے۔ دوسرے، یہ کہ انہوں نے نعتیہ قصیدے ہندو مائتھولوجی کے زیر اثر لکھے۔ میری مراد ان کے ایک مشہور قصیدے سے ہے جس کا مصرع ہے

''سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل''

بقول محمد حسن عسکری کہ ''محسن کی ساری شہرت اس ایک قصیدے پر موقوف ہے...... '' آخر اس نظم میں کیا بات ہے جو آج سے سو سال پہلے ہماری اجتماعی روح کی کسی پوشیدہ رگ کو چھوگئی ورنہ اس قصیدے پر تو کئی اعتراضات وارد ہو سکتے تھے۔ مثلاً ایک تو بعض لوگوں کو یہی شکایت ہوتی کہ نعت رسول میں مناسبات کفر کا استعمال غیر مشروع ہے' محمد حسن عسکری نے جس انداز میں محسن کا کوروی کے دفاع کی کوشش کی ہے وہ قابل قبول نہیں' بھلا حضور اکرم کی تعریف کرنے اور قصیدہ لکھنے کے لئے کاشی اور متھرا جانے کی کیا ضرورت تھی ان کا قصیدہ یا نعت لکھنے کے لئے اپنے خامہ کو گنگا جل سے دھونے کی بھی ضرورت نہیں تھی پھر بقول حسن عسکری صاحب خود محسن کو بھی اپنی صفائی میں شعر کہنے پڑے۔ انہوں نے جلال الدین جعفری کا بھی حوالہ دیا ہے جنہوں نے اپنی کتاب ''تاریخ قصائد اردو'' میں لکھا ہے کہ ''ان کی زبان کی متانت قصائد کے لئے موضوع (موزوں) نہیں۔ پھر سحر لکھنوی کے اشعار کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے اسی زمین میں کہے ہیں۔ ان کے قصیدے کے چند اشعار لکھنے کے بعد حسن عسکری صاحب کہتے ہیں لیکن محسن کا قصور معاف ہو گیا بلکہ عیب ہنر ٹھہرا حالانکہ وہ نعت لکھ رہے تھے جس میں ادب و لحاظ بھی ضروری تھا۔ پھر وہ سوال کرتے ہیں کہ اس قصیدے میں کیا چیز تھی جو لوگوں کے لاشعور میں اترتی چلی گئی۔ وہ اپنے شک وشبہ کا بھی اظہار کرتے ہیں اور مختلف حوالوں سے ان کا دفاع بھی کرنا چاہتے ہیں یا کرتے ہیں۔ محمد حسن عسکری کہتے ہیں کہ محسن کا کوروی سے ہر پرانے نقاد نے یہی کہا ہے (پرانے نقاد سے ان کی کیا مراد ہے اور ہر پرانے نقاد کا نام بھی نہیں لکھا ہے) کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت پر خلوص اور شدید محبت رکھتے تھے مگر ان کا یہ جواب شافی نہیں کبھی ایسے لوگ بھی غلطی کر جاتے ہیں۔ ایسی تشکیک کے عالم میں محمد حسن عسکری ''سرسید کی عقلیت

اور افادیت اور مولانا حالی کی پیروی مغربی نے محسن کی قسم کی نعت گوئی کو ناممکن بنادیا...... مطلب یہ ہے کہ ''نعت گوئی کے سلسلے میں محسن کا کوروی پر کسی اسلوب یا خاص لب ولہجہ کی پابندی نہ تھی سوائے اس روایتی پابندی کے'' باخدا دیوانہ باش و بامحمد ہوشیار'' محمد حسن عسکری حیات ہوتے تو ان سے عرض کرتا کہ سرسید کا دور خردمندی اور خردافروزی کا دور تھا اور ان کا یہ کہنا کہ ''غدر کے بعد انفرادی آزادی غائب ہونے لگی' بالکل غلط ہے'' عسکری صاحب اس قصیدے کے بارے میں مزید کہتے ہیں'' چنانچہ انہوں نے (محسنؔ) نے وہی انداز اختیار کیا جو اس زمانے میں لکھنوی شاعری کا تھا اور جو انہوں نے سیکھا تھا گو اس انداز کو استعمال اس طرح کیا کہ بازی گری کا کرشمہ کری بن گئی اور لفاظی میں معنویت پیدا ہوگئی'' ان کے اس انداز کو وہ ایک طرح سے بازیگری اور لفاظی سے بھی تعبیر کرتے ہیں...... اس سلسلے میں عسکری صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ 'یہاں ایک دوسری الجھن یہ نکلتی ہے کہ محسن اچھے شاعر سہی لیکن کیا یہ بات مناسب تھی کہ وہ دربار رسالت میں ایسا جذبہ' ایسا لب ولہجہ اور ایسا انداز بیان لے کر پہنچیں۔ اوّل تو محسن کے عقیدے کی رو سے (خود آپ کا اور مسلمانوں کا عقیدہ کیا ہے) رسولؐ کی مثال ہی یہ ہے کہ وہ اپنے کسی امتی کو رد نہیں کرتے۔ مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے اور اصول رہا ہے کہ رسول کی تعریف میں محتاط رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور جسے عربی' فارسی اور اردو کے تمام شعرائے مد نظر رکھا ہے عرفیؔ نے تو نعت گوئی کو تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ یعنی اس سلسلے میں بہت زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ معاملہ خدا کا نہیں رسول کا ہے۔ عسکری صاحب نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ انہوں نے اس سلسلے میں امتی کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے۔

حالی پر بھی اپنے نقطۂ نظر سے محمد حسن عسکری نے اعتراض کیا ہے مگر حالی کا انداز تو ہے کہ:۔

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت　　بڑھا جانب بو قبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا　　دعائے خلیل اور نوید مسیحا

حفیظ جالندھری نے بھی حضورؐ کی دنیا میں تشریف آوری کو ایک خوشگوار بہار سے تشبیہ دی ہے

ان کا یہ شعر سب کو یاد ہوگا:۔

ہوا چاروں طرف اقصائے عالم میں پکار آئی ☆ بہار آئی بہار آئی بہار آئی بہار آئی

محمد حسن عسکری اپنے اس مضمون میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مظفر والے (یہ کون سا شائستہ طرز تخاطب ہے) مولانا حالی کی تعلیم کی رو سے تو محسن کا کوروی کا ہر شعر مذاق شاعری سے بیگانہ اور بے اثر ٹھہرتا ہے کہ میں غالب کا طرفدار نہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ حالی نے حضرتؐ کے مرتبے کو مدنظر رکھ کر ان کی تعریف اور توصیف کی ہے اور یہی نقطہ نظر ہر شاعر کے پیش نظر رہا ہے۔ سرسید نے اسی لئے حالی کے مدوجزر اسلام سے متعلق کہا تھا کہ حشر میں جب خدا ان سے سوال کرے گا تو وہ جواب دیں گے کہ حالی سے مسدس حالی لکھوایا۔ اور مسدس حالی کی جو مقبولیت اور قدر وقیمت ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ محمد حسن عسکری کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ محسن کا کوروی کا کلام غیر مقبول ہو جائے گا وہ کہتے ہیں کہ اردو کے نئے نقادوں کے یہاں صرف ایک جگہ محسن کا ذکر دیکھا ہے اور ان صاحب نے بھی (ان صاحب کا نام نہیں لکھا) محسن کی شاعری کو خلوص اور شدت سے عاری خشک اور مصنوعی کہہ کے اڑا دیا ہے'' مگر دوسرے نئے نقادوں میں سے اہم نقادوں کا ذکر بھی ضروری تھا۔ انہوں نے جس ایک نئے نقاد کا حوالہ دیا ان کا بھی نام نہیں لکھا اور اس نقاد نے جو رائے دی ہے وہ بھی محمد حسن عسکری کے موقف کے خلاف ہے۔ محمد حسن عسکری اس طور ناامید ہو گئے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ''میں نے یہ مضمون اس امید میں نہیں لکھا کہ محسن کی شاعری کو حیات نو مل جائے گی اور لوگ تو الگ رہے ہمارے شاعروں میں سے مختار صدیقی کے سوا کسی نے بھی محسن کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ شاعری ایک خاص معاشرے اور ایک خاص ذہنیت کی پیداوار تھی۔ رات گئی بات گئی۔ اب دوسرے ذہن ہیں اور ان کی دوسری ضرورتیں ہیں۔ محسن کا کلام وہیں پہنچ گیا جہاں ہر کتاب آخر میں پہنچتی ہے۔

(میرے خیال میں یہ بات درست نہیں کیا مرزا غالب، درد، میر اور علامہ اقبال کے مجموعوں (یعنی کتابوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ہرگز نہیں)

کتب خانے میں ممکن ہے۔ موہن جوداڑو کی طرح کسی دن یہ بھی برآمد ہو جائے۔ بہرحال دو شخص تو

ایسے پڑھتے ہی رہیں گے ایک حضرت جبریل اور ایک میں۔ حضرت جبریل کا حوالہ اس لئے انہوں نے دیا ہے کہ محسن کاکوروی نے اپنے قصیدے کا اختتام اس شعر پر کیا ہے:۔

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

آخر میں میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ ”بہ ایں عقل دانش بباید گریست“ یا پھر یہ کہ

”اے روشنیِ طبع کہ بر من بلا شدی“

کاشی اور متھرا کے حوالے سے میں ایک گیت کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ بچپن میں یہ فلمی گیت سنا تھا جو کچھ اس طرح ہے

کاشی دیکھی متھرا دیکھا۔ دیکھے تیرتھ سارے

کہیں نہ من کا میت ملا تو آیا تیرے دوارے

ترے دوار کھڑا اک جوگی

نہ مانگے یہ سونا چاندی، مانگے درشن دیوی

دنیاوی محبوب کے لئے ایسا کہنا تو ناروا اور ناجائز نہیں مگر ایسا کہنا کسی روحانی بزرگ کے سامنے بھی ایسا اظہار شائستہ نہیں چہ جائیکہ ایسی بلند اور بزرگ ترین ہستی کے لئے ایسا پیرایہ اختیار کرنا بھی مناسب اور روا نہیں۔

اب تو پروفیسر محمد حسن عسکری بھی خدا کو پیارے ہو چکے ہیں اور حضرت جبریل کی زبانی اس قصیدے کا آخری شعر سن رہے ہوں گے۔

☆......☆

اردو غزل پر ایک نظر

"غزل اردو شاعری کی آبرو ہے"۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی

"غزل اردو کی مقبول ترین صنف سخن ہے"۔ پروفیسر عطا کاکوی

"غزل نیم وحشی صنف سخن ہے" ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد

"شاعری کا مستقبل زیادہ تر غزل سے نہیں' نغمہ سے وابستہ ہے"۔ آل احمد سرور

"کوہ ہمالیہ جیسی رفعتوں اور بحرالکاہل کی سی گہرائیوں کی حامل صنف غزل مشرقی شعریات اور ہماری ادبی جمالیات کا گراں قدر اثاثہ ہے"۔ غفور شاہ قاسم

"غزل سدابہار صنف سخن ہے اور ہر دور میں مقبول خاص و عام رہی ہے"۔ ڈاکٹر بشیر سیفی

اس طرح غزل کی موافقت اور مخالفت میں مختلف ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے سب سے زیادہ مخالفت ترقی پسندوں نے کی۔ جوش ملیح آبادی نے تو اس کو قابل گردن زدنی قرار دیا۔ بقول انور سدید ۱۹۹۶ء میں امریکہ سے ایک آواز اٹھی یعنی داؤد رہبر نے غزل کو "بے موسم کا راگ" کہا۔ ستیہ پال آنند جو آج کل امریکہ میں ہیں وہ بھی غزل کے سخت مخالف ہیں۔ چند سال پہلے جب وہ کراچی آئے تھے تو ڈاکٹر فہیم اعظمی کے گھر پر ان سے ملاقات ہوئی میں نے اپنی ایک غزل جو غزل کی تعریف میں تھی ان کو پڑھنے کے لئے دی جس اشعار یہ ہیں:۔

شیدا سبھی ہیں اس کے وہ صورت غزل کی ہے
اہل سخن کے دل میں حرارت غزل کی ہے

سکہ اسی کا چلتا ہے سارے جہان میں
ہاں کشورِ ادب میں حکومت غزل کی ہے
گلدستہ ایک حسین ہے فکرِ جمیل کا
کچھ بے سبب نہیں یہ حمایت غزل کی ہے

ستیہ پال آنند نے چند شعر ہی پڑھے ہوں گے کہ ایک ناگواری کی صورت میں وہ مطبوعہ غزل مجھے واپس کردی۔ مجھے اس وقت تک نہیں معلوم تھا کہ وہ غزل کے اس قدر مخالف ہیں بہر حال جادو وہی ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ غزل کی جادوگری اور سحر انگیزی آج بھی قائم ہے پہلے بھی کچھ لوگ اس کے مخالف تھے اور آج بھی بعض لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں مگر غزل وہ کنز صنفِ سخن ہے جس پر اس مخالفت کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔

بقول انور سدید ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس تحریک کی ادبی حکمت عملی تشکیل دینے والوں نے غزل کو اپنے پیغام کی ترسیل اور سیاسی مقاصد کی تکمیل میں معاونت کرنے والی صنفِ سخن کا درجہ نہ دیا اور زیادہ تر نظم کی سرپرستی کی جس میں نظریاتی تبلیغ نسبتاً آسان تھی اور نعرہ بازی کے امکانات زیادہ تھے چنانچہ ترقی پسند شعرا نے ایک عرصے تک غزل کو 'عاق' کیے رکھا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ غزل زندہ رہی اور ہر دور میں اچھی اور عمدہ غزلیں لکھی جاتی رہیں کیوں کہ غزل میں جو اشاریت' معنویت اور رمزیت ہے اس نے غزل کو مقبول عام بنایا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کا ایک شعر ایک نظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش کرنا چاہوں گا' سید ہاشم رضا صاحب جب سکریٹری اطلاعات تھے تو ایک شاعر ان کے پاس آئے اور ان سے کہا میری نظمیں ریڈیو والے نشر نہیں کرتے کیوں کہ ان کا موضوع سیاسی یا انقلابی ہوتا ہے۔ ہاشم رضا نے کہا کہ آپ یہی بات غزل میں لکھئے۔ انشاء اللہ آپ کا کلام نشر ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا غزل میں چونکہ تفصیل نہیں ہوتی اور شاعر اشاروں ہی اشاروں میں وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جو اس کا مدعا ہوتا ہے۔ غزل وہ کوزہ ہے جس میں دریا سما جاتا ہے۔ راجہ رام نارائن

موزوں صرف ایک شعر پر زندہ ہیں اور وہ شعر سیاسی ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

کلیم عاجز نے بھی ایک سیاسی شعر کہا ہے جو غزل کا شعر ہے جو ہندوستان کے فسادات سے متعلق ہے۔ یہ شعر انہوں نے اس وقت کی وزیر اعظم کو مخاطب کر کے پڑھا تھا۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

محسن بھوپالی کا یہ شعر بھی اکثر لوگ پڑھتے ہیں۔ سیاسی جلسوں میں بھی پڑھا گیا ہے

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

انسان کی بے رحمی اور اس کی صفت درندگی کا اظہار افسر ماہ پوری نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:۔

دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبت کے دیئے
کتنے انساں نے بجھائے ہیں ہوا نے کتنے

جبر کے عالم میں اور نا مساعد حالات میں جمیل یوسف نے اپنے اندیشے کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

آج مل بیٹھنا غنیمت ہے ☆ کل کو کیا ہو کسے خبر ہے یہاں

غزل وہ پیمانہ یا اظہار کا وہ ذریعہ ہے جس میں ہر طرح کے خیالات اور حقائق کو پیش کیا جا سکتا ہے یعنی سائنسی موضوعات کو بھی۔ برج نارائن چکبست کا یہ شعر تو سب کو یاد ہوگا۔

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

انسان کے اندر چاروں عناصر یعنی آب و آتش' خاک و باد کا کس خوبی اور عمدگی کے ساتھ ذکر کیا ہے اور زندگی اور موت کی تعریف سائنٹفک انداز سے کر دی۔

اس سے پہلے کہ ہم اردو غزل کا ایک مختصر جائزہ لیں مناسب ہے کہ غزل کیا ہے؟ اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے آگے چلیں۔

غزل کی معنوی تعریف:۔

غزل کے معنی "حرف زدن باز نان" یعنی عورتوں سے بات چیت کرنے کے ہیں مگر اصطلاح میں غزل ایسی شاعری کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق اور معاملات عشق کا ذکر کیا جائے بعد میں اس میں اخلاق اور تصوف کے موضوعات بھی شامل ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ اس کا دائرہ اتنا بڑھا کہ اس میں ہر طرح کے موضوعات اور مضامین کو شامل کیا جانے لگا۔ خاص طور پر عہد حاضر کی غزلوں اور جدید غزلوں میں نئے نئے موضوعات کو شامل کیا گیا مثلاً سیاسی' سماجی' اخلاقی' نفسیاتی' عمرانی' تاریخی اور سائنسی موضوعات پر بھی غزلیہ اشعار کہے گئے۔ اس طرح غزل کا دائرہ موضوعات کے لحاظ سے بہت وسیع ہو گیا اور غزل گویوں کو اس کی تنگ دامانی کی شکایت نہیں رہی۔

فنی تعریف:۔ پوری غزل ایک بحر میں ہوتی ہے۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اگر ایک مطلع کے بعد دوسرا مطلع آتا ہے تو اسے حسن مطلع کہتے ہیں۔ باقی اشعار میں دوسرے مصرعے میں قافیہ آتا ہے قافیہ کے بعد ردیف آتی ہے۔ بعض غزلوں میں ردیف نہیں ہوتی ایسی غزلوں کو غیر مردف غزلیں کہتے ہیں۔ شاعر کا تخلص آخری شعر یعنی مقطع میں آتا ہے مگر اب ایسا ضروری نہیں رہا ہے اس قید کو نہ صرف جدید شاعروں نے توڑا بلکہ پرانے شعراء نے بھی یہ قید شکنی کی ہے مثلاً میر کا یہ شعر دیکھئے۔ مطلع ہی میں انہوں نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی ☆ اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

اور غیر مردف غزل مرزا غالب نے کہی ہے۔اس طرح اس قید کو توڑنے کا کام مرزا غالب نے سب سے پہلے انجام دیا ہے۔ان کی بہاریہ غزل دیکھئے جس کا مطلع ہے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی ☆ کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

اردو غزل کا ارتقاء:۔

اردو غزل فارسی غزل کے ذریعے وجود میں آئی اور فارسی میں غزل عربی کے وسیلے سے آئی یعنی قصیدے کی تشبیب سے غزل معرض وجود میں آئی۔اردو غزل فارسی غزل کے شانہ بشانہ اور قدم بہ قدم چلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اور ترقی کرتی رہی پھر اردو غزل نے اپنی شناخت الگ بنائی اور فارسی غزل سے بھی آگے بڑھ گئی۔ابتدائی اردو شاعری کا عروج دکن میں ہوا۔محمد قلی قطب شاہ اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر گزرا ہے اس کے دیوان میں غزلیں بھی ملتی ہیں۔قلی قطب شاہ کے بعد اردو غزل کا ایک ممتاز شاعر ولؔی دکنی پیدا ہوا جسے ایک زمانے تک اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھا جاتا رہا اب اگرچہ اوّلیت کا سہرا اس کے سر سے چھن گیا ہے مگر فضیلت کی دستار آج بھی اس کے سر پر ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ با قاعدہ اور با اصول شاعری کی داغ بیل سترہویں صدی میں ولی دکنی کے ہاتھوں ہی پڑی۔ولؔی کی شاعری نے اس کے عصر کے شعرا کے لئے چراغ راہ کا کام انجام دیا۔

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ
کہ جوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

ولؔی دکنی نے جب یہ شعر یا یہ غزل کہی تو اس کے سامنے صائب تبریزی کا یہ شعر یقیناً رہا ہوگا:۔

اگر نام بلند از چرخ خواہی صبر کن صائبؔ
زیستی می تو آں رفتن بہ بام آہستہ آہستہ

پھر تو اس زمین میں بے شمار شاعروں نے طبع آزمائی کی' اس دور کے ایک شاعر نے بھی اس زمین میں خوبصورت اشعار نکالے ہیں۔میری مراد انجم شادانی سے ہے۔ان کا یہ شعر تجربے

اور مشاہدے کی ایک عمدہ مثال ہے۔

کسی کے ساتھ رہ کر ظرف کی پہچان ہوتی ہے
کھلا کرتے ہیں سب عیب و ہنر آہستہ آہستہ

یوں تو ولی دکنی کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
زندگی جان عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں
راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن

دبستان دہلی کے شاعروں نے بھی ولی کے کلام کی تقلید کو قابل فخر سمجھا۔شاہ حسین نے اپنے دیوان میں ان کی تقلید کی ہے۔ان کے زمانے میں ناجی' آبرو اور مضمون وغیرہ نے بھی وہی راہ اپنائی۔اس کے بعد ہی اردو غزل کا جو دور شروع ہوا وہ اپنی وسعت کی حقیقی شعریت کے لحاظ سے قابل ذکر دور ہے بلکہ اس دور کو امتیازی حیثیت بھی حاصل ہے۔اس دور کے ممتاز ترین شعراء میں میر تقی میر' مرزا سودا اور خواجہ میر درد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس دور کے شعراء اپنے زمانے سے اس قدر آگے نکل گئے اور انہوں نے اپنے شاعرانہ کمالات کے ذریعے وہ مقام حاصل کیا کہ اس کے فوراً بعد غزل کا جو دور شروع ہوا وہ اتنا پست ہے کہ اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔میر سودا اور درد کے چند اشعار دیکھنے کے بعد اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میر.........

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ہوگا کسی دیوار کے سائے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
☆
دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
☆
عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں اگلے زمانے والے
☆
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا
☆
آدمی سے ملک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میرؔ انسان کی
☆

سودا..............

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
☆
دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
☆
سوداؔ کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے
☆
کیفیت اس چشم کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

سوداؔ قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

☆

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

دردؔ..........

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

☆

اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن
جو شجر ہے وہ نخل ماتم ہے

☆

اس کے بعد اردو شاعری کے دور ظفر شاہی کا آغاز ہوتا ہے اور اس دور میں مومنؔ، غالبؔ اور ذوقؔ منظر عام پر آتے ہیں۔ اس دور کو اردو شاعری کا دور زریں (Golden Age) کہا جاتا ہے۔ مومنؔ اور غالبؔ ممتاز اور اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ ان دونوں شعراء نے تاثیر اور حسن بیان سے اردو غزل کو لبریز کر دیا۔ غالبؔ اپنی جدت فکر اور ادائے معانی کی وجہ سے بہت مشہور اور مقبول ہوئے۔ ذوقؔ کے یہاں خارجی مضامین کی کثرت ہے مگر زبان و بیان کا لطف موجود ہے ان شعراء کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

مومنؔ:۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
☆
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
☆
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
☆
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

غالب:۔ نقش فریادی ہے کس شوخیٔ تحریر کا
کاغذی پیرہن ہے ہر پیکر تصویر کا

☆
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
☆
رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
☆
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
☆

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

☆

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

☆

ذوقؔ:۔

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

☆

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

☆

احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑوں لنگر کو توڑ دوں

☆

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

☆

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

☆

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مرزا غالبؔ سے پہلے خواجہ حیدر علی آتشؔ بھی اپنی شاعری کا جادو جگا چکے تھے ان کے بہت سے اشعار نہ صرف یہ کہ مشہور ہوئے بلکہ مقبول بھی ہوئے۔ چند اشعار دیکھئے:۔

آتشؔ:۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

☆

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

☆

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

☆

خواب مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

☆

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

☆

آتشؔ ہی کے ساتھ لکھنؤ کے ناسخؔ کا بھی نام آتا ہے بعض لوگ تو ان کو دبستان لکھنؤ کا نمائندہ شاعر کہتے ہیں مگر میرے خیال میں نمائندگی کا حق آتشؔ ہی کو پہنچتا ہے۔ خواجہ وزیرؔ، برقؔ، سحرؔ، رندؔ اور صباؔ نے بھی لکھنؤ میں اپنی غزل گوئی کی بدولت شہرت حاصل کی لکھنؤ میں بعض ایسے اہل کمال شعراء پیدا ہوئے جنھوں نے غزل کی بنیاد تمام تر خارجی مضامین پر رکھی۔ آتشؔ کا شعری نمونہ پیش کر چکا ہوں۔ اب ناسخؔ کے بھی دو اشعار دیکھئے

کسی کا کب کوئی روز سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

☆

ساقی بغیر شب جو پیا آب آتشیں
شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا

امیرؔ، داغؔ اور جلالؔ کے بعد قدیم طرز کی غزل کے ساتھ جدید رنگ میں بھی غزلیں کہی گئیں مگر پرانے انداز کے شعرا مثلاً سائلؔ، جلیلؔ اور مضطرؔ وغیرہ اپنی پرانی وضع پر قائم رہے اس زمانے میں غلام صوفی مصحفیؔ جیسا اہم شاعر بھی موجود تھا وہ ۱۷۵۱ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال لکھنؤ میں ۱۸۲۴ء میں ہوا مگر نہ جانے کیوں ان کو ایک عرصے تک نظر انداز کیا جاتا رہا حالانکہ ان کا شمار بھی اردو غزل کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے۔ چند اشعار دیکھئے

مصحفیؔ..........

اپنی تو اس چمن میں نت عمر یونہی گزر گئی
یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا

☆

پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا

☆

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

☆

حسرت سے اس مسافر بے کس کی روئیے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

☆

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

دبستان دلی' دبستانِ لکھنؤ' دبستان حیدرآباد اور دبستانِ عظیم آباد کی طرح دبستان مرشد آباد کا بھی نام آتا ہے اس سرزمین سے ایک اہم شاعر پیدا ہوا جسے اردو دنیا انشاء اللہ انشاؔ کے نام سے جانتی ہے۔ اس شاعر کو بھی اتنی اہمیت نہیں دی گئی جس کا اس کو حق پہنچتا ہے۔ انشاء کی غزلوں میں کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جو انشاء کو شعرا کی اہم صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے اور خود ہی انصاف کیجئے۔

نزاکت اس گلِ رعنا کی دیکھیو انشاؔء
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

☆

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی ہیں جو تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے انکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

☆

یہ عجب مزا ہے یارو کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ہمارے ادبی ٹھیکیداروں نے داغ دہلوی کو بھی ایک اچھوت شاعر سمجھ رکھا ہے حالانکہ اس کی شاعری اچھوتی' نرالی اور دلکش ہے۔ خاص طور پر زبان وہ ایسی استعمال کرتے ہیں جس پر رشک آتا ہے۔ مرزا داغؔ دہلوی کو یہ بھی ایک اعزاز حاصل ہے کہ وہ علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر کے استاد تھے۔ داغؔ کے یہ اشعار اکثر لوگ موقع بہ موقع پڑھتے رہتے ہیں بلکہ یہ اشعار ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

☆

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

☆

غضب کیا ترے وعدے کا اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
نہ جانے کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

☆

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگادوں تو داغ نام نہیں

مرزا غالب کے شاگرد حالی نے بھی شعر گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ حالی کی وہ غزلیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو انہوں نے سرسید احمد خان کے زیر اثر آنے سے پہلے کہی تھیں مگر ان کا دیوان مرتب کرتے وقت لوگوں نے اس کا خیال نہیں رکھا اور نئے اور پرانے کلام کو ملا دیا ہے

دکھانا پڑے گا مجھے زخم دل
اگر تیر اس کا خطا ہوگیا

☆

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

☆

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

☆

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
☆
نیا ہے جب لیجئے نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں
☆
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

خواجہ الطاف حسین حالی کے بعد شاد عظیم آبادی نے غزل کو ایک نیا موڑ دیا۔ نیاز فتحپوری نے ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا "گزشتہ پچاس سال میں شاد عظیم آبادی سے بڑا غزل گو پیدا نہیں ہوا" ان کے چند اشعار دیکھیے

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا
☆
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں
☆
ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
☆
میں حیرت وحسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
☆

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
☆
خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

وحشت کلکتوی کا بھی اپنا غزل میں ایک مقام ہے۔ وہ دبستان کلکتہ کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے ابھرے، گو بعد میں ڈھاکہ آ گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ وہ علامہ جمیل مظہری کے استاد بھی تھے۔ ان کے کچھ اشعار دیکھئے

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے
وطن میں آنکھ چراتے ہیں ہم سے اہل وطن
تڑپتے رہتے تھے غربت میں ہم وطن کے لئے
☆
کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

علامہ جمیل مظہری کی زندگی کا ایک حصہ کلکتہ میں گزرا مگر بعد میں ملازمت کے سلسلے میں عظیم آباد آ گئے۔ ان کی شاعری کی ابتدا کلکتہ میں ہوئی اور قیام پٹنہ میں اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
☆
موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھودی
قطرے کے لئے بہتر تھا یہی قلزم بنتا دریا ہوتا
☆

گرا تو ہوں مگر اے چشم اعتبار دیکھ
کس بلندیٔ اعتبار سے گرا ہوں میں
☆

اجالے کے پجاری مضمحل ہیں کیوں اندھیرے سے
کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی اگلتے ہیں

علامہ اقبال نے تو ابتدا میں اپنے استاد داغ دہلوی کے رنگ میں غزلیں کہیں مگر بہت جلد ان کی غزل کا رنگ بدل گیا۔ ان کی وہ غزلیں جو بال جبریل میں شامل ہیں ان کو اردو غزل کا نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے تو عشق کا مفہوم ہی بدل دیا۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
☆

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
☆

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
☆

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
☆

مہینے وصل کی گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

☆

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

☆

واعظ ثبوت لاتے جوئے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

☆

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

☆

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

☆

عشق کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اکبرالہ آبادی طنز ومزاح کے بڑے اور اہم شاعر ہیں مگر ان کی غزلوں میں جو سنجیدہ اشعار ملتے ہیں وہ بھی بڑے غضب کے ہیں۔

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

☆

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گل تر
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا
☆
بنو گے خرد اقلیم تم شیریں زباں ہو کر
جہاں گیری کرے گی یہ ادا نور جہاں ہو کر
نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتیوں میں نہاں ہو کر

حسرت موہانی نے غزل کو ایک نئی زندگی بخشی۔ غزل کے تن مردہ میں جان ڈالنے والوں اور غزل کے گیسو سنوارنے والوں میں ان کا نام بھی آتا ہے۔

بھلاتا ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
☆
تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسم عاشقی
اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا
☆
دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
☆
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

مرزا یاس یگانہ چنگیزی بھی قصر اردو غزل میں ایک نئی آن بان سے آئے اور ایسی غزلیں

کہیں کہ لوگوں کی توجہ ان کی طرف بھی ہوئی اور ان کے لہجے کے تیکھے پن کو نہ صرف محسوس کیا گیا بلکہ ان کی داد بھی دی۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
گناہ زندہ دلی کہیے یا دلآزاری
کسی پہ ہنس لئے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا
☆
دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
☆
مجھے دل کی خطا پہ یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
وحشیو! کیوں تنگ دل ہو فصل گل آنے تو دو
غنچے غنچے میں بہار صد گریباں دیکھنا

اسی زمانے میں فانی، اصغر اور جگر مراد آبادی بھی اپنی غزلوں کا جادو جگا رہے تھے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار پیش کرتا ہوں تاکہ ان کی غزل گوئی کا بھی چہرہ آپ کے سامنے آ جائے۔

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی جا مردانہ وار مر جا
☆
خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسم گل آ گیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں
☆
فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

دل کا اجڑنا سہل سہی پر جینا ظالم سہل نہیں
بستی بسنا کھیل نہیں ' بستے بستے بستی ہے
(فانی)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے
☆
میں کامیاب دید بھی محروم دید بھی
جلوؤں کے اژدہام نے حیراں بنادیا
آلام روزگار کو آساں بنادیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنادیا
(اصغر)

جگرحسن وعشق کے پرستار تھے۔اوراس جذبے کی عکاسی کے لئے انہوں نے غزل کا سہارا لیا۔وہ خود کہتے ہیں" میری شاعری غزل تک محدود ہے کیوں کہ حسن وعشق ہی میری زندگی ہے"

عشق ہی کے ہاتھوں میں' کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشہ نقاب ان کا
☆
اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے
☆
جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
☆
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

کام آخر جذبہ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

☆

زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

اب بغیر کسی تبصرے کے کچھ اسی دور کے اہم شعرا کی غزلوں کے اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس صنف سخن میں کیسے کیسے اشعار کہے گئے ہیں جن کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی

بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں

☆

دوستو! تم پہ بھی گزرا ہے کبھی یہ عالم
نیند آتی نہیں اور خواب نظر آتے ہیں

☆

تم تو ہمیں کو کہتے تھے کہ یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو کنول کے پھولوں سے شبنم نہ چھلک جائے

☆

گو ہلے ہوا ہی سے پردۂ حریم ناز
دل یہی سمجھتا ہے شوق کار فرما ہے

☆

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

حفیظ جالندھری

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے

تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

☆

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

☆

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے

تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

☆

خاموش ہو کیوں دردِ محبت کے گواہو!

دعوے کو بنا ہو مرے نالو مری آہو

☆

احسان دانش

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو

تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

☆

نہ سیو ہونٹ نہ خوابوں میں صدا دو ہم کو

مصلحت کا یہ تقاضا ہے بھلا دو ہم کو

جرم سقراط سے ہٹ کر نہ سزا دو ہم کو

زہر رکھا ہے تو یہ آبِ بقا دو ہم کو

☆

یوں اس پہ مری عرضِ تمنا کا اثر تھا

جیسے کوئی سورج کی تپش میں گل تر تھا

نہ سر گزشت سفر پوچھ مختصر یہ ہے
کہ اپنے نقش قدم ہم نے خود مٹائے ہیں
☆
کچھ لوگ جو سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر
تہمت تراشتے ہیں وہ ہوا کے دباؤ پر

....

فراق گورکھپوری

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
☆
اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں
☆
دیکھو رفتار انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز
☆
آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں
دل وہی کار گہہ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
☆
مجھے گمرہی کا نہیں کوئی خوف
ترے گھر کو ہر راستہ جاتا ہے
☆
بے قصور منصور کو ناحق دار پہ تم سب کھینچو ہو
لوگو! کوئی اور نہیں یہ پردے سے ہم بولے ہیں

....

معین احسن جذبی

اس طرف آشیانے کی حقیقت کھل گئی
اس طرف اس شوخ کو بجلی گرانا آ گیا

☆

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

☆

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پہ ساحل کی تمنا کون کرے

....

اسرار الحق مجاز

تسکین دل محزوں نہ ہوئی وہ سعی کرم فرما بھی گئے
اس سعی کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے
اس محفل کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

☆

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشتر زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگ جاں بھول گئے

....

جسٹس آنند نارائن ملاّ

یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہوگئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی
ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظام چمن
فسردہ غنچوں کو جس سے شگفتگی نہ ملی

☆

ملاّ بنادیا ہے اسے بھی محاذ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اردو زبان بھی

فیض احمد فیض

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

☆

فریب آرزو یہ سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تیری آواز پا سمجھے

☆

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

☆

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

☆

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
☆
رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

....

سراج الدین ظفر

نہ جانے شب کو ہمارے سبو میں کیا شے تھی
سحر کو روح سبک سیر ہے ہوا کی طرح

☆

دن کو بحر و بر کا سینہ چیر کر رکھ دیجئے
رات کو پھر پائے گل رویاں پر سر رکھ دیجئے
☆
راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قد و گیسو سے چلے تو دار و رسن تک پہنچے
☆
ہمارے دوش پہ کھلتی تو تیری زلف سے ہم
نسیم صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے
☆
ساغر اٹھا کے زہد کو رد ہم نے کر دیا
پھر زندگی کے جزر کو مد ہم نے کر دیا
وقت اپنا زر خرید تھا ہنگام مے کشی
لمحے کو طول دے کے ابد ہم نے کر دیا

....

مجروح سلطان پوری

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
☆
میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے کارواں بنتا گیا
☆
حادثے اور بھی گزرے ہیں تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے، اب مری تصویر نہ دیکھ
دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا
☆
مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ، ہاتھ میں آ گیا چراغ راہ میں جل گئے

....

اقبال عظیم

منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو چکی
کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں
☆
ہجرت کو ہم نے منزلِ آخر سمجھ لیا
ورنہ وہ فیصلہ بھی غلط فیصلہ نہ تھا
☆
چمکے تو ہے سورج کی طرح روپ تمہارا
لیکن یہ سمجھ رکھو سورج بھی ڈھلے ہے
☆

دشمنوں سے بھی دوستی کر لی
ایسی صورت میں اور کیا کرتے

☆

اپنی مٹی پہ بھی چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

شاہد عشقی

ہم سے نفرت کرو کہ پیار کرو
کوئی رشتہ تو استوار کرو

ناصر کاظمی

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے
دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

رساؔ چغتائی

شرط غم گساری ہے ورنہ یوں تو سایہ بھی
دور دور رہتا ہے ساتھ ساتھ چلتا ہے

☆

عشق میں سیاستیں نکلیں
قربتوں میں بھی فاصلہ نکلا

☆

جن آنکھوں سے مجھے تم دیکھتے ہو
میں ان آنکھوں سے دنیا دیکھتا ہوں

احمد فراز

دیکھنا سب رقصِ بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون

☆

اب روشنی ہوئی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طوافِ در و دیوار کرے ہے

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکاں بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

☆

اب کے بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جیسے سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

....

احمد ندیم قاسمی

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں جہاں تک دیکھوں
حسنِ یزداں سے تجھے حسنِ بتاں تک دیکھوں

☆

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

☆

کوئی وعدہ اگر پورا نہ ہوگا
تو کیا اب حشر بھی برپا نہ ہوگا

☆

ابن انشاء

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا

☆

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا

حفیظ ہوشیار پوری

نہ پوچھ کیوں مری آنکھوں میں آ گئے آنسو
جو تیرے دل میں ہے اس بات پر نہیں آئے

☆

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

☆

دل سے آتی ہے بات لب پہ حفیظؔ
بات دل میں کہاں سے آتی

افسر ماہ پوری

کہی جائے گی محفل میں ہماری داستاں کب تک
رہو گے تم حسیں کب تک رہیں گے ہم جواں کب تک

☆

دھجیاں اوروں کے دامن کی لئے پھرتے ہیں
اس زمانے کے ہیں عشاق سیانے کتنے

☆

ان کے لبوں کو اب بھی تکلف ہنسی میں ہے
خوشبو بہت دنوں سے مقید کلی میں ہے

جانے کب راہ میں پڑ جائے ضرورت افسرؔ
ان کی یادوں کو بھی اسبابِ سفر میں رکھنا
☆
یہ دنیا ہے یہاں بے حوصلہ کچھ بھی نہیں ملتا
جسے مہتاب لینا ہو وہ دریا میں اتر جائے
☆
کیا بتائیں حالِ دل ان کی شناسائی کے بعد
حبس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پروائی کے بعد

....

عزیز حامد مدنی

صلیب و دار کے قصے رقم ہوتے ہی رہتے ہیں
قلم کی جنبشوں پر سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں
☆
چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خد و خال سے بھی گئے

....

رضی اختر شوقؔ

ہم روحِ عصر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ

....

سلیم احمد

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں گا
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں
☆

سائے کو سائے میں گم ہوتے ہوئے دیکھا تو ہوگا
یہ بھی دیکھو کہ تمہیں ہم نے بھلایا کیسا
☆
سوتے نہیں ہیں مدت سے مرے شہر کے بچے
جیسے ہوں کسی خوف سے بے خواب پرندے
☆
بے خیالی میں لکیریں کھینچتا رہتا تھا میں
جانے کیسے بن گیا خاکہ تری تصویر کا

....

شکیبؔ جلالی

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے
نہ اتنا تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے
☆
فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی
☆
آ کے گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
☆
ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

....

حسن نعیم

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا

☆

روح کا لمبا سفر ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایا گیا

☆

دانشوروں کے قحط میں سید حسن نعیم
بیدلؔ کی باؤلی پہ لگائیں سبیل کیا

حمایت علی شاعرؔ

پندارِ زہد ہو کہ غرورِ برہمنی
اس دورِ بت شکن میں ہے ہر بت شکستنی

☆

الزام اپنی موت کا موسم پہ کیوں دھروں
میرے بدن میں میرے لہو کا فساد تھا

☆

اکدوسرے کی زد میں ہیں مہرے کچھ اس طرح
ڈر ہے الٹ نہ جائے کہیں یہ بساط بھی

منیر نیازی

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

☆

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایا ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

کسی کو اپنے عمل کا حساب کیا دیتے
سوال سارے غلط تھے جواب کیا دیتے

....

جمیل الدین عالیؔ

کہتا ہے تمہارا دوش نہ تھا کچھ ہم کو بھی اپنا ہوش نہ تھا
پھر ہنستا ہے پھر روتا ہے پھر چپ ہو کر رہ جاتا ہے

☆

بھٹکے ہوئے عالی سے پوچھو، گھر کب واپس آئے گا
کب یہ در و دیوار نئیں گے کب یہ چمن لہرائے گا

☆

تا ابد ایک ہی چرچا ہوگا
کوئی ہم سا کوئی تم سا ہوگا

☆

یوں بھی کچھ کم تو نہ تھے اتنی بہاروں کے ہجوم
ان میں شامل ترے دامن کی ہوا اور سہی

....

اختر شیرانی

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں
جوانی ہو گر جاودانی تو یارب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

☆

کچھ لوگ آرزوؤں پہ جیتے ہیں عمر بھر
اِک ہم کہ ہیں ابھی سے پشیمان آرزو

....

عدؔم

ہم کو شاہوں سے عدالت کی توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

صباؔ اکبر آبادی

ویرانی مطلق کا اثر بول رہا ہے
میں گھر میں نہیں ہوں مرا گھر بول رہا ہے

☆

انبوہ خواہشات نے پسپا کیا مجھے
میں نے شکست کھائی ہے اپنی سپاہ سے

☆

اتنا بھی نہ ہو صحن کہ در تک میں پہنچ کر
در کھولوں تو درویش دعا گو ہی چلا جائے

....

قمر جلالوی

اب نزع کا عالم ہے مجھ پر تم اپنی محبت واپس لو
جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں

☆

قمرؔ تسبیح پڑھتے جا رہے ہیں سوئے میخانہ
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے بڑے اللہ والے ہیں

....

ادا جعفری

ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی برسر الزام ہی آئے
حیران ہیں لب بستہ ہیں دلگیر ہیں غنچے
خوشبو کی زبانی ترا پیغام ہی آئے

صدیوں سے مرے پاؤں تلے جنتِ انساں
میں جنتِ انساں کا پتا پوچھ رہی ہوں
تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

ڈاکٹر حنیف فوق

آہ و فریاد سے معمور چمن ہے کہ جو تھا
مائل جور وہی چرخِ کہن ہے کہ جو تھا
☆
کیا نظر کی ہوشیاری خود اسیر مستی ہے
جو نگاہ اٹھتی ہے محو خود پرستی ہے
☆
رات ڈھلتے ہی سفیران قمر آتے ہیں
دل کے آئینے میں سو عکس اتر آتے ہیں
☆
کبھی اپنی جوانی من چلی تھی
کبھی دنیا بھی سانچے میں ڈھلی تھی

اختر لکھنوی

سرزمین آب میں رکھے گئے بے آب ہم
ہم نے دیکھی ہیں مہینوں کربلا کی صورتیں
☆
کتنے محبوب گھروں کو گئے کس کو معلوم
واپس آئے ہیں جو اپنوں میں خبر کی صورت

رونے والا بھی نہیں کوئی رہا اے اختر
ڈوبنے والے تو یوں ڈوبے ہیں تم کیا ڈوبے
(اختر لکھنوی نے المیہ مشرقی پاکستان پر پوری پوری غزلیں لکھی ہیں)

....

اطہر نفیس

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال بتائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں' پھر سچا شعر سنائیں کیا
☆
مثل بادِ صبا تیرے کوچے میں اے جانِ جاں آتے ہیں
چند ساعت رہیں گے چلے جائیں گے سرگراں آتے ہیں
☆
اطہر تم نے عشق کیا کچھ تم بھی کہو کیا حال ہوا
کوئی نیا احساس ملا یا سب جیسا احوال ہوا

....

سرور بارہ بنکوی

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں
☆
ہے آسماں سے ایک سنگ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر' مانند آئینہ بکھر جائے گی رات
☆
جب ان کے دامن رنگیں پہ دسترس نہ ہوئی
جنوں نے میرے گریباں سے انتقام لیا

....

سحر انصاری

وصال و ہجر سے وابستہ تلخیاں بھی گئیں
وہ فاصلے بھی گئے اب وہ قربتیں بھی گئیں
دلوں کا حال تو یہ ہے کہ ربط ہے نہ گریز
محبتیں تو گئی تھیں عداوتیں بھی گئیں

☆

عجیب ہوتے ہیں آداب رخصت محفل
کہ اٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی

....

جمیل یوسف

آگ کے سیلاب نے گھیرا ہے سارے شہر کو
ایک رستہ بھی نظر آتا نہیں بچتا ہوا

......

میں اپنے شہر کے نقش و نگار بھول گیا
کسی نے لوٹ لیا مجھ کو چانگاؤں میں

....

محشر بدایونی

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

☆

نہ جاؤ گھر کے شب افروز روزنوں پہ کہ لوگ
دیا مکان میں جلتا بھی چھوڑ جاتے ہیں

☆

کلام کرتے ہیں در بولتی ہیں دیواریں
عجیب صورتیں ہوتی ہیں انتظار میں بھی

شان الحق حقی

اس نے یوں عرض محبت پہ سنبھل کر دیکھا
اس کے دل کو تو خبر ہو نہ گماں ہو جیسے

☆

تم سے الفت کے تقاضے نہ نبھائے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

....

زہرہ نگاہ

خوش جو آئے تھے پشیمان گئے
جا تغافل تجھے پہچان گئے
کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ امنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

....

پروین شاکر

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

☆

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بھی بولے گا اور لاجواب کردے گا

☆

کمال ضبط کو میں خود بھی آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

☆

ہارنے میں اک انا کی بات ہے
جیت جانے میں خسارہ اور ہے

وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اسے دیتی امیر ایسی تھی

....

پروفیسر شمی فاروقی

ہمیں سمیٹ کے رکھنا کہ مشت خاک ہیں ہم
ذرا سی تیز ہوا میں بکھرنے لگتے ہیں

تشکیل پاکستان کے بعد اردو غزل کی ایک نئی سمت متعین ہوئی ان میں سیف الدین سیف' عدم' ناصر کاظمی' سراج الدین ظفر' قتیل شفائی' احمد ندیم قاسمی' اطہر نفیس' تابش دہلوی' محشر بدایونی' شاعر لکھنوی' وفا براہی' جمیل الدین عالی' رئیس فروغ' عزیز حامد مدنی' شاہد عشقی' فرید جاوید' اظہر قادری' محسن بھوپالی' ظہیر کاشمیری' محبوب خزاں' ادا جعفری' محسن احسان' فارغ بخاری' خاطر غزنوی' احمد فراز' عارف عبدالمتین' ظفر اقبال' افسر ماہ پوری' جمیل یوسف مظفر حسین رزمی' سہیل غازی پوری' جمیل عظیم آبادی' شاہین بدر' شمی فاروقی' حسیر نوری' شفیق احمد شفیق' صدیق فتح پوری اور بہت سے دیگر شعرا نے نئی آن بان سے غزلیں کہی ہیں۔

شاعرات میں ادا جعفری' وحیدہ نسیم' سعیدہ عروج مظہر' شمیم نسرین' پروین شاکر' شاہدہ حسن' فاطمہ حسن' وضاحت نسیم' نجمہ خان' رخسانہ صبا' غزالہ خاکوانی' بشریٰ اعجاز' شاہین مفتی' منصورہ احمد وغیرہ ایسی شاعرات ہیں جنہوں نے غزل کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کاروان میں کچھ نئی شاعرات بھی شامل ہوگئی ہیں مجھے افسوس ہے کہ مضمون کی طوالت کے خوف سے کچھ شعرا اور شاعرات کے کلام پر مختصر تبصرے کے ساتھ ان کے اشعار بطور مثال پیش نہ کرسکا آخر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اردو غزل کی صورت حال بالخصوص پاکستان میں بہت اطمینان بخش ہے اور گلشن غزل کو آراستہ کرنے میں اس صنف سخن کو آگے بڑھانے میں شعرا اور شاعرات اپنا کردار بخوبی انجام دے رہے ہیں اور اس طرح اردو غزل کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے اور یہ صنف ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

شاد عظیم آبادی شعر کے آئینے میں

شاد عظیم آبادی دبستان عظیم آباد کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے اردو شعراء میں ایک منفرد اور نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ علامہ اقبال نے شاد کو ایک زبردست شاعر تسلیم کیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "اتنا بڑا نباض فطرت شاعر پیدا نہیں ہوا۔ علامہ اقبال کا یہ مقولہ بالکل حق بجانب ہے ان کی آواز میں بڑی صداقت اور خلوص ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قدرت نے شاد کو ایک اعلیٰ دل و دماغ بخشا تھا۔ مشاہدے کی زبردست قوت ودیعت فرمائی تھی۔ شاد نے مظاہر قدرت کا زبردست مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے تجربات اور مشاہدات کو انہوں نے حسین اشعار کے پیکر میں ڈھال دیا۔

علامہ نیاز فتح پوری نے بھی شاد کو ایک عظیم اور زبردست شاعر تسلیم کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ "گزشتہ نصف صدی میں اتنا بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا" اور یہ وہی شاد ہیں جن کو ایک محفل میں مخاطب کر کے سائل دہلوی نے ایک شعر پڑھا تھا۔

حاجب باب اثر معتقد شاد آیا
سائل آیا نہ کہو داغ کا داماد آیا

حسرت موہانی شاد کی شاعرانہ صلاحیت کی قدر کرتے تھے۔ وہ بڑے خلوص سے انہیں یاد کرتے ہیں:

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و فا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں اقبال بھی وحشت بھی

پروفیسر مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر فراق گورکھپوری نے بھی اپنے مضامین میں (جو غزل سے متعلق ہیں) شاؔد کو اردو غزل کی ارتقاء کی اہم کڑی تسلیم کیا ہے اور ان کے بہت سے اشعار بطور حوالہ پیش کئے ہیں۔

شاؔد عظیم آبادی کو اردو کے ہر مستند ادیب شاعر اور نقاد نے ایک بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود شاؔد کو ان کا اپنا صحیح اور جائز مقام نہیں مل سکا۔ حد تو یہ ہے کہ اسکول اور کالج کے نصابوں میں ان کی غزلیں نظر نہیں آتیں۔ میں اس کوتاہی کو ادبی بد دیانتی سے تعبیر کرتا ہوں جہاں دوسرے شعرا پر اس قدر لکھا جاتا ہے وہاں شاؔد پر کچھ نہیں لکھا جاتا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ شاؔد جامع حیثیت شاعر ہیں جنہیں زمانہ بھلانا بھی چاہے تو فراموش نہیں کر سکتا اور جب تک اردو ادب زندہ رہے گا آسمان ادب کا یہ درخشندہ ستارہ بھی چمکتا رہے گا۔ میں نے شاؔد فراموشی کا یہ عالم بھی دیکھا کہ جب شاؔد کا کوئی شعر پڑھا گیا تو لوگ چونک اٹھے۔ انہیں نہ معلوم کیوں اس بات پر تعجب ہوا کہ وہ شعر شاؔد کا ہے۔ بہر حال مجھے یہ قوی امید ہے کہ شاؔد ایک نہ ایک دن اپنا صحیح مقام ضرور حاصل کر لیں گے۔ آیئے ہم شاؔد کی شاعری پر ایک نظر ڈالیں تاکہ ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

شاؔد کی شاعری کا آغاز ۱۸۶۰ء سے ہوا۔ ابتدا میں انہوں نے فارسی میں اشعار کہے لیکن اس کے بعد انہوں نے مستقل طور پر اپنے خیال کا وسیلہ اردو کو بنالیا۔ شاؔد نے اصناف سخن میں سے تقریباً ہر صنف میں شعر کہے ہیں مگر ان کی تمام تر شہرت کا مدار ان کی غزلیں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو ہیں یہ حقیقت ہے کہ شاؔد کو عام طور پر غزل گو کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے علامہ نیاز فتح پوری ان کی غزل گوئی سے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہ اپنے رنگ تغزل کے لحاظ سے میرؔ و سوزؔ کے متبع تھے۔ بیان کی سادگی، نرم لب و لہجہ، سوز و گداز اور واقعیت جنہیں غزل کی جان کہا جاتا ہے ان کے یہاں اس قدر دل کش اور معتدل انداز میں پائی جاتی ہے کہ اس کی مثال اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کی

شاعری کے شباب کا زمانہ وہی تھا جو امیرؔ' داغؔ اور جلالؔ وغیرہ کا مگر جو سنجیدگی' متانت اور معنویت ان کے یہاں پائی جاتی ہے وہ کسی کے یہاں نظر نہیں آتی''

علامہ نیاز نے اپنے قول کی صداقت اور وضاحت کے لئے شادؔ کے جو اشعار پیش کئے ہیں میں ان میں سے چند اشعار پیش کرتا ہوں:۔

جب اہلِ شوق کہتے ہیں افسانہ آپ کا
ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

☆

جفائے یار کا دل میں خیال آ ہی گیا
ہزار دھیان کو ٹالا خیال آ ہی گیا

☆

مرے پہلو سے آخر اٹھ گیا غمخوار گھبرا کر
بہت مشکل ہے آ کر بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

☆

ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے ابھی سے وحشت برس رہی ہے
ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار اے آشیاں رہے گی

☆

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

☆

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

☆

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

☆

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی

اٹھا لے جو بڑھا کر ہاتھ میں مینا اسی کا ہے(۱)

(۱) اصل مصرع یوں ہے۔علامہ نیاز نے غلط لکھا ہے(جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے)

یہ سب درست کہ تم بت بھی ہو خدا بھی ہو

مگر نیاز کے قابل یہ دل ربا بھی ہو

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاد کی غزلوں میں تغزل کا بھرپور عنصر پایا جاتا ہے ان کی زبان بڑی سیدھی سادہ ہے اور اس میں زبردست روانی پائی جاتی ہے۔شاد کی غزلوں کا مطلع بھی خاص طور پر بڑا زبردست ہوتا ہے۔وہ الفاظ کا بڑا صحیح اور برمحل استعمال کرتے ہیں کہیں کہیں ان کے کلام میں بہار کے محاورات اور روزمرہ کی اچھی مثالیں بھی ملتی ہیں۔اس کے علاوہ ان کے کلام میں سہل ممتنع کی بھی عمدہ مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کریں:۔

اے دل نہ گھبرا کہ اک دن مقرر　　انصاف ہوگا تیرا ہمارا

آنکھوں پہ بیکار دامن نہ رکھیے　　امڈا ہوا ہے دریا ہمارا

لے پر کسی کو خم پر کسی کو　　ساقی پہ اپنے دعوا ہمارا

☆

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا　　کیے جاؤ میخوارو' کام اپنا اپنا

کہاں نکہت گل کہاں بوئے گیسو　　دماغ اپنا اپنا مشام اپنا اپنا

سمجھتا ہے اس دور میں کون کس کو　　کریں رند خود احترام اپنا اپنا

☆

کٹا زندگی کا زمانہ قفس میں　　یہی تھا چمن آشیانہ یہی تھا

☆

وعدۂ وصل پہ لگا رکھا تھا　　یہ بھی ان کی مہربانی تھی

شاد کا دور اطمینان اور چین کا دور نہیں تھا۔عجب خلفشار کا زمانہ تھا۔شاد نے اس پر آشوب

دور کا جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے۔ ناقدری زمانہ کی بھی انہیں شکایت تھی (گو شاؔد نہ رہے مگر یہ شکایت آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے) لیکن انہوں نے حالات کا بڑی مستقبل مزاجی اور صبر و شکر کے ساتھ مقابلہ کیا بلکہ آلام روزگار نے ان کے کلام کو زبردست سوز عطا کیا۔ ان کے کلام میں بھی میرؔ کی دردمندی کا عنصر پایا جاتا ہے مگر شاؔد کے اظہار بیان کا طریقہ جدا ہے۔ ناکامی اور محروی شاؔد کے حصے میں بھی آئی مگر انہوں نے داستان الم سنانے کے لئے نرم لہجہ اختیار کیا۔ وہ اپنے شعروں میں صرف اپنا غم بیان نہیں کرتے بلکہ اسے وہ ایک عالمگیر فلسفے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ شاؔد نے '' آدم وحوا سے ملاقات '' میں زمانہ کی سردمہریوں اور تشدد کا بڑے موثر و دلنشیں پیرایہ میں ذکر وشکوہ کیا ہے۔ وہ عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں:۔

کہیں روٹی کی فکر میں سرگرم — کہیں کپڑوں کا دھیان جاں فرسا

گر پڑا گھر مرمت اس کی ضروری — نہ وسیلہ ہاتھ میں نہ پیسا

☆

سر پہ قسطیں کلکٹری کی الگ — چاہے پیدا ہو یا ناپیدا

شاؔد کی آپ بیتی پر بھی جگ بیتی کا گمان ہوتا ہے وہ اپنا غم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس میں ہمہ گیری اور تنوع کا احساس پیدا ہو جاتا ہے:۔

بے رخی کا گل و بلبل کی عبث شکوہ شاؔد — آخر اس باغ میں تھا کون جو تیرا ہوتا

☆

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا — چشم تر نے مجھ کو کھو دیا

☆

کیا غلط ہے زعم ہے بعد اپنے کسے غم اپنا — ہاتھ قابو میں ہیں کر لے ابھی ماتم اپنا

☆

شاؔد کیا کہے دیکھا نہیں جاتا مجھ سے — چہرہ اترا ہوا ' بہتا ہوا آنسو تیرا

لیکن شاؔد کبھی ہمت نہ ہارتے بلکہ ان حالات میں زندہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور وہ اس تاریک اور مایوس فضا میں بھی کوئی نہ کوئی خوشی اور امید کی کرن حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح

زندہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ٹال دیں ہنس ہنس کے غم کو تو سہی
ہم بھی اپنے نام کے ہیں شاؔد ہیں

دبستان عظیم آباد کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہاں مایوسی کا عالم ملتا ہے بلکہ خودداری کے پہلو کو شعرائے عظیم آباد نے زیادہ برتا ہے۔ شاؔد کے یہاں یہ بات بھی ملتی ہے۔ چنانچہ شاؔد دنیا کے رنج والم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ستم ہائے روزگار کو ادائے محبوبی سے موسوم کرتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں:۔

ہنسانا اور رلانا بے وفا دنیا کی خصلت ہے
ہم اس انداز کو انداز معشوقانہ کہتے ہیں

مکتب عشق میں سب برابر ہیں۔ سب کو ایک سبق ملتا ہے مگر کچھ آزمائشوں سے گھبرا جاتے ہیں اور بسا اوقات لوگ رنج وغم سے تنگ آ کر آنسو بہانے لگتے ہیں۔ مگر کچھ ہمت والے ایسے بھی ہیں جو اس حال میں شکر بجالاتے ہیں۔

سبق تو مکتب الفت میں سب کا یکساں تھا　　　کسی کو شکر کسی کو فقط گلہ آیا

شاؔد غم والم کو ایک وقتی چیز سمجھتے ہیں وہ اسے حوادث زمانہ یا انقلاب زمانہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

صدمہ و درد و رنج وغم، طول فراق کا الم　　　ہیں یہ حوادث چند ان کی بقا کی وجہ کیا

شاؔد کے یہاں استغنا اور اپنی مدد آپ کی مثالیں بھی اکثر ملتی ہیں یہ ان کی غیور طبیعت کا پرتو ہے۔ ان کو خود اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ دوسروں کا کیا بھروسہ ساتھ دیں یا نہ دیں۔

چارہ گر گون زمانے میں ہے چارا کس کا
آپ تو اپنا سہارا ہے، سہارا کس کا

غالب نے کہا تھا کہ ''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں''
اس میں جو نفسیاتی نکتہ ہے اس سے شاؔد بھی کماحقہ واقف تھے بلکہ ہر وہ دل جو محرم غم ہے

اس کو اس حقیقت کا کم و بیش احساس ضرور ہوگا کہ درد و غم' رنج و الم سے شاؔد کا حوصلہ اور بڑھ جاتا ہے اور اس سے ان کی روح کو تقویت پہنچتی ہے۔

درد الفت سے قوی ہوتی ہیں روحیں تن میں
اور بڑھتا یہ مرض شاؔد تو اچھا ہوتا

شاؔد مصیبت اور پریشانی کو ایک امتحانی دور سے تعبیر کرتے ہیں بلکہ وہ اسے بلندی طبع کی آزمائش سمجھتے ہیں۔ عالی طبع لوگ پریشانیوں سے تنگ آ کر بھی نااہلوں کی خوشامد نہیں کرتے۔

مصیبت میں خموشی مقتضائے طبع عالی ہے
بیان حال نااہلوں کے آگے زار نالی ہے

شاؔد کمال کے قائل ہیں۔ وہ اس پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اگر انسان کے اندر کوئی جوہر ہے تو آج نہیں تو کل اس کی قدر ضرور ہوگی۔

ہماری قبر پر ہے بھیڑ خوش جمالوں کی
یہ گل کھلاتی ہے مٹی کمال والوں کی

شاؔد کے کلام میں دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کا عنصر بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ طنز و مزاح روایتی نہیں (یعنی صرف شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ) بلکہ ان میں ان کے مشاہدے کا گہرا رنگ اور ایک نیا انداز ہے۔

اقرباء کہتے ہیں یہ ہم میں نہیں
شاؔد کی رسوائی کی حد ہوگئی

☆

برا کہتے ہیں تجھ پیر کو اے شاؔد کیا شکوہ
جوانوں کی طبیعت کچھ نہ کچھ رنگین ہوتی ہے

☆

کاہلی' خود غرضی' دل میں سودا کہ منم
شاؔد انہیں باتوں کو اب شان ریاست سمجھو

شادؔ سخن کی جان ہیں بادہ نغمہ و سرور
آپ تو شعر کہتے ہیں آپ کو احتراز کیوں

☆

تھکے ماندے لحد میں ہم تو مر رہنے کو آئے ہیں
فرشتے کہتے ہیں اٹھیئے تو کچھ کہنے کو آئے ہیں

☆

کسی کو حسن اور کسی کو مال دیا
غریب جان کے اس نے مجھی کو ٹال دیا

☆

کسی کے ہم نہ کام آئے نہ کوئی اپنے کام آیا
تعجب ہے کہ تو بھی زمرۂ انساں میں نام آیا

شادؔ صوفی شاعر تو نہ تھے مگر صوفیانہ مسائل اور موضوعات بھی انہوں نے بطرزِ احسن اپنے شعروں میں پیش کئے ہیں' شادؔ صوفی نہ سہی لیکن عاجزی' انکساری' صبر و رضا ان کی فطرت میں داخل تھی۔ بہرحال جہاں جہاں موقع ملا انہوں نے ان موضوعات کو بڑے حسین پیرائے میں پیش کیا ہے:۔

صانع کو دیکھنا ہے تو عالم پہ کر نظر
آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا
دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

☆

جنت سے خوش نہیں ہے طلبگار آپ کا
ہے اصل مدعا وہی دیدار آپ کا
دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کے ڈوب گیا

شاؔد نے جہاں دیگر موضوعات کو اپنی غزلوں میں بڑی کامیابی سے برتا ہے وہاں حسن وعشق، ہجر ووصال کے تذکرے، محبوب کی شوخیاں، کج ادائیاں، غم جاناں وغیرہ کے موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ نہایت دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ چند مثالوں پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

میں جو حاصل ترے کوچے کی گدائی کرتا
بندگی کہتے ہیں کس شے کو خدائی کرتا

☆

تھے وہ سرہانے جلوہ گر محو تھا دل نیاز میں
تو نے تھپک کے اے اجل مفت ہمیں سلا دیا

☆

گرہ میں باندھ لاتی بوئے کاکل
بگڑتا اس میں کیا بادِ صبا کا

☆

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
پاؤں پھیلا ہماری وحشت کا

☆

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے
بدلی وہ وضع طور سے بے طور ہو گئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

☆

شب فراق میں ہمسائے ڈر کے کہتے ہیں
غضب یہ رات ڈراونی ہے جاگتے رہنا

☆

نہیں وجود کسی جا اسی لئے میں نے
وفا کا لفظ کتابوں سے بھی نکال دیا

تجھی کو آگے ترے جا کے بھول جاتے ہیں
جو نام صبح سے رٹتے تھے تا بہ شام تیرا

☆

اسی کوچے کے جانے پر نہیں کچھ منحصر اے دل
یہی ہوگی مصیبت ہم تجھے لے کر جدھر جائیں

شاؔد نے طویل بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور سب سے بڑا کمال تو یہ ہے کہ اس کی روانی اور بندش میں فرق نہیں آنے پایا۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

شاؔد کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں تجربے اور مشاہدے کی بڑی گہری چھاپ ملتی ہے۔ وہ اشعار اکثر موقعوں پر استعمال کیے جاتے ہیں بلکہ ان کی حیثیت ضرب المثل ہوگئی ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں:۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم
میں خود آیا نہیں ' لایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجاز مے کا
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں
کجا میں اور کجا یہ شاؔد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

☆

لے کے پیرِ مغاں ہاتھ میں مینا آیا
مے کشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

☆

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

☆

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

☆

جس نے دیکھا اس نے سمجھا کہ مخاطب ہیں ہمیں
واہ مصور تو نے کیا رکھا ہے رخ تصویر کا

☆

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی
خم آئے گا صراحی آئے گی تب جامِ آئے گا

گو شادؔ کی قدر و منزلت ان کے زمانے میں خاطر خواہ نہ ہو سکی مگر انہیں اپنی عظمت کا احساس تھا۔

اے شادؔ قدر شعر اس دل سے پوچھیے
جس کو صحیح ذوق کے ساتھ امتیاز ہو

☆

چشم باطن صاف کرلو، دل کا دھو ڈالو غبار
کچھ سمجھ لینا ہے آساں شادؔ کی تحریر کا

یہ اردوئے معلی فارسی پر اب ہے چشمک زن
بلاغت کا فصاحت کا ترقی اے شاد کیا کہنا

بہر حال ان کے اشعار کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا درد ان کی حسرت اپنے اندر ایک فنی قوت اور اجتماعی قدر رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں جمالیاتی حسن کی نزاکت اور رعنائی اور اخلاقی احساس کی صلابت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے یہاں حسین و جمیل استعارے بڑی فراوانی کے ساتھ اور فطری انداز میں استعمال ہوتے ہیں۔ شاد نے اپنے شعروں میں جو ماحول کی تصویریں پیش کی ہیں ان میں بڑی تازگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو شاد کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

علامہ جمیل مظہری شخصیت اور فن کے آئینے میں

علامہ جمیل مظہری کی شاعری سے متعلق نیاز فتح پوری نے کہا تھا کہ ان کے قلم سے کبھی دوسرے درجے کا شعر نہیں نکلتا۔ مجھے نہ تو اس فقرے کی صداقت پر شبہ ہے اور نہ جمیل صاحب کی شاعرانہ عظمت پر، مگر اس کے باوجود پاک و ہند کے بعض علاقوں میں یہ باور کیا جاتا ہے کہ انہیں وہ شہرت اور مقبولیت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کا احساس بڑی حد تک فراق گورکھپوری کو بھی ہے کیوں کہ انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ ''شاعری تو کریں جمیل مظہری اور نشور واحدی اور نام ہو جگر مراد آبادی کا۔'' اس بات میں کسی حد تک صداقت تو ضرور ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں سے بھی ملا ہوں اور جب بھی جمیل مظہری کا ذکر آیا ہے تو ان لوگوں نے جمیل مظہری کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اور بالخصوص لوگوں کو ان کا یہ شعر پڑھتے سنا ہے:۔

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اس شعر کے بارے میں میرا اپنا ایقان یہ ہے کہ جمیل مظہری اس کے علاوہ کوئی اور شعر نہ کہتے یا ان کا سارا کلام ضائع بھی ہو جائے اور صرف یہ شعر باقی رہ جائے تو وہ زندہ رہیں گے یعنی صرف یہ شعر شاعر کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

علامہ جمیل مظہری کا شمار اردو کے ان چند ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جنہیں شہرت کے ساتھ ساتھ مقبولیت بھی ملی ہے۔ میرے نزدیک صرف شہرت مقبولیت کی دلیل نہیں نیز مشاعرے کی کامیابی کسی شاعر کی اصلی کامیابی ہرگز نہیں ہے جمیل مظہری کو جو بھی شہرت حاصل ہوئی اور انہیں

جس قدر بھی مقبولیت ملی ہے اس میں صرف ان کی اپنی ذاتی صلاحیت اور شعر گوئی کا کمال ہے ورنہ تو وہ زندگی بھر ان تمام مواقع اور طریقوں سے گریز کرتے رہے۔ کسی بھی شخص کو کم از کم شہرت کے دروازے پر ضرور لا کھڑا کرتی ہے جو جمیل مظہری کو جانتا ہے وہ انہیں مانتا بھی ہے اور وہ جس قدر مشہور ہیں اسی قدر مقبول بھی ہیں اور یہ سعادت صرف اسے نصیب ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے نوازتا ہے۔ اس فرق کو میں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے:۔

شرف قبولیت جو ملے بات ہے بڑی
کیوں روگ اپنے ساتھ شہرت کا پالئے

علامہ جمیل مظہری نہ تو مشاعروں میں جاتے' نہ باقاعدگی کے ساتھ اپنا کلام چھپواتے اور نہ اپنے کلام کی حفاظت کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا بہت سے کلام ضائع بھی ہو گیا۔ اس کے باوجود جس قدر ان کا کلام شائع ہوا اس کی تعداد کافی ہے۔ کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جس کا ذکر آگے چل کر کروں گا۔ کسی بھی شاعر کا مکمل تعارف اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس شاعر کے حالات زندگی پر ایک نظر نہ ڈال لی جائے۔ چنانچہ یہاں ان کی سوانح حیات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ان کے کلام کا جائزہ لیں گے۔

جمیل مظہری کا اصل نام سید کاظم علی تھا اور جمیلؔ تخلص کرتے تھے اپنے دادا سید مظہر حسن کے نام کی مناسبت سے آپ مظہری کہلاتے تھے۔ ان کے والد کا نام سید خورشید حسنین تھا جو خود بھی شاعر تھے اور خورشیدؔ تخلص فرماتے تھے۔ [ڈاکٹر سید صفدر حسین نے 'عرفان جمیل کے تعارف میں جمیل مظہری کے والد کا نام خورشید حسن لکھا ہے جو غلط ہے ان کے حقیقی بھائی رضا مظہر نے اپنے مجموعہ ''خاروخس'' میں خورشید حسین لکھا ہے جو صحیح ہے۔ ا۔ا۔ شاہینؔ]۔ اس طرح جمیل مظہری کو شاعری ایک طرح سے ورثے میں ملی۔ جمیل مظہری اس خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس خاندان کے چشم و چراغ سید علی عباس حسینی تھے۔ بقول علی عباس حسینی اور جمیل مظہری اس شجرہ

طیبہ کی ایک شاخ بارآور ہیں جس کی ایک سوکھی ڈالی میں میں بھی ہوں۔ ماہنامہ ' سہیل' (گیا) جمیل مظہری نمبر)

جمیل مظہری کا آبائی وطن بہار کا مشہور قصبہ کھجوہ ہے مگر ان کی پیدائش مغل پورہ پٹنہ سٹی میں ۲؍ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو ہوئی۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم بہار میں ہوئی اس کے بعد وہ کلکتہ چلے آئے جہاں نویں جماعت سے لے کر ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں جامعہ کلکتہ سے فارسی میں ایم اے کیا اس کے بعد اسلامی تاریخ میں بھی ایم اے کا امتحان پاس کیا۔

علامہ جمیل مظہری کی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوتا ہے' الہند' اخبار کی ادارت سے منسلک ہوئے جس سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ ' الہند' کے بند ہوجانے کے بعد سے آپ کے تعلقات مولانا شائق احمد عثمانی مدیر' عصر جدید' سے ہوئے اور ان کے اخبار میں کالم نگاری شروع کردی۔ اس میں فکاہیہ کالم بھی لکھتے۔ کبھی نظم و افسانہ بھی لکھ کر دیتے اور کبھی کبھار اداریہ بھی لکھ ڈالتے۔ یہ تمام کام وہ فرضی ناموں سے انجام دیتے رہے۔ کبھی اشتر صحرائی کے نام سے لکھا تو کبھی علامہ جلاد و القلم کے نام سے' جم' کا نام استعمال کیا۔ فلمی دنیا میں انہیں جوش ملیح آبادی بمبئی لے گئے جہاں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک رہے مگر وہاں کی آب و ہوا ان کی صحت کو راس نہ آئی اور کسی طرح سے جان چھڑا کر بھاگ آئے۔ فلمی دنیا کے تاثرات کو' بھاگ رے شاعر بھاگ'، ' تول اپنے کو تول'' والی نظموں میں پیش کیا۔ فروری ۱۹۴۷ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر (فلم سیکشن) حکومت بہار بنا دیئے گئے اور اس طرح عظیم آباد واپس آ گئے۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی ملازمت پٹنہ کالج میں منتقل کردی گئی۔ پٹنہ کالج و پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ جامعہ پٹنہ میں ان کا تقرر مین آف دی لیٹرز کی حیثیت سے ہوا اور ایم اے کی وجہ سے نہیں (وہ اردو میں ایم اے تھے بھی نہیں)

جمیل مظہری اپنی شاعری کی ابتدا کے بارے میں خود کہتے ہیں کہ'' والد صاحب سے سنا ہے کہ ۶۔۵ برس کی عمر میں اتفاقاً کبھی کبھی مصرعے موزوں ہوجایا کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں والد

مرحوم نے ایک غزل لکھ کر مشاعرے میں پڑھنے کو دی جس میں دو اشعار میرے بھی تھے۔ ایک مصرع یاد ہے ''ہم اٹھ کے بیٹھ گئے میر کارواں کی طرح''۔

۱۹۲۲ء میں جمیل مظہری کی پہلی نظم 'بادل کی بیٹی' شائع ہوئی۔ [میرے خیال میں اسے ۱۹۲۳ء ہونا چاہئے تھا یا پھر ۱۹۲۲ء کے آخری ایام ہوں گے۔ا۔اشا ہین] جمیل مظہری نے ابتدا میں چھوٹے چھوٹے افسانے مختلف رسالوں میں لکھے۔ انشائیے بھی لکھے جس میں ایک 'حسن شاعر کی نگاہ میں'' ماہنامہ ندیم (گیا) میں شائع ہوا۔ فکاہی مضامین عصر جدید کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوئے جس میں ''آل طوائف کانفرنس'' کافی مشہور ہوا۔ ایسی ہی شہرت ان کے ان دونوں مضامین کو ملی جو انہوں نے ''راؤنڈ ٹیبل کی ناکامی پر اور پھر 'پھرتی بارات اور خالی ڈولا' کے عنوان سے تحریر کئے تھے اور جو وہاں کے مزاحیہ اخبار 'پونچ' کے سالنامہ میں شائع ہوئے تھے۔ جمیل مظہری نے ایک ناولٹ ''فرض کی قربان گاہ پر'' کے نام سے لکھا جو ندیم (گیا) میں شائع ہوا تھا مگر جب یہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو اس کا نام انہوں ''شکست و فتح'' رکھ دیا۔

جمیل مظہری ۱۹۶۰ء میں پچپن سال کی عمر میں جامعہ پٹنہ کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن اس کے بعد فوراً ہی جامعہ نے پانچ سال کے لئے اپنے شعبۂ اردو کے لئے آپ کو دوبارہ مقرر کرلیا جب یہاں سے دوبارہ سبکدوش ہوئے تو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے دو سال کے لئے آپ کو ریسرچ فیلوشپ دے دیا۔ چنانچہ آپ اسی حیثیت سے ''اردو مراثی اور اس کے تہذیبی اثرات پر کام کررہے تھے۔ آپ کا انتقال ۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء میں مظفرآباد ضلع کے قصبہ بھیکن پور میں ہوا۔ لکھنے پڑھنے اور شعر گوئی سے آخری عمر تک آپ کو شغف رہا۔ چنانچہ ان کے مرنے کے بعد ان کے بستر مرگ سے جو نظم ملی ہے اس سے اس بات کا یقیناً ثبوت ملتا ہے یہاں پر نامناسب نہ ہوگا کہ ان کی آخری نظم ''گور رسیدہ'' کے دو بند قارئین کے سامنے پیش کردیئے جائیں۔

کب سے ہے شوق سفر ذہن پہ طاری اے دوست
چار کاندھوں کی کب آئے گی سواری اے دوست
کیا سوال اپنے جنازے کے سبک ہونے کا
زندگی ہی میں میری لاش ہے بھاری اے دوست

جذبہ زحمت خاموش سے ان کے پوچھو
جو اٹھائیں اسے دوش سے ان کے پوچھو

☆

وہی بتلائیں گے کتنی ہے گرانی میری
ذہن طفلانہ طبیعت ہے خفقانی میری
مختصر یہ ہے کہ بچپن تو پلٹ آیا ہے
اور پلٹی نہ گھڑی بھر کو جوانی میری
ایسی عادات سے دیدہ نہ شنیدہ ہوں میں
قبر بستر ہے مرا گور رسیدہ ہوں میں

منشی پریم چند نے اپنی ادبی وابستگی سے متعلق یہ کہا تھا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ادبی خدمت کرنے سے عبادت پوری ہو جاتی ہے۔ اس قول کا اطلاق جمیل مظہری کے فن پر جس قدر ہوتا ہے اتنا شاید ہی ان کے کسی ہم عصر شاعر یا ادیب پر ہوتا ہو۔ شعر و ادب کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ نہایت خلوص اور لگن کے ساتھ شعر گوئی کے فن کو اپنائے رہے اور جیسا کہ تحریر کر چکا ہوں یہ سلسلہ تادم مرگ جاری رہا۔

جمیل مظہری کا شمار اردو کے چند ممتاز ترقی پسند شعراء میں بھی ہوتا ہے۔ وہ نام نہاد ترقی پسند نہیں تھے بلکہ صحیح معنوں میں اور اور عملی طور پر ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ وہ ان ترقی پسندوں میں نہیں تھے جو بیرون ملک سے درآمد نظریہ پر عمل کرتے تھے۔ ترقی پسندی کا نعرہ انہوں نے کبھی نہیں لگایا بلکہ خاموشی کے ساتھ انسان دوستی اور بھائی چارگی کے مشن کو آگے بڑھاتے رہے وہ نہایت استواری سے ترقی پسند تحریک سے وفاداری نبھاتے رہے۔ کچھ لوگ تو صرف نام کے ترقی پسند تھے اور جو نظریہ تو اشترا کی رکھتے ہیں مگر سرمایہ دار بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ خود تو بڑے بنگلوں میں رہتے ہیں عیش کی زندگی گزارتے ہیں مگر اپنے فن پاروں میں

غریب عوام کے دکھ درد کا رونا روتے رہتے ہیں۔ جمیل مظہری کے قول اور فعل میں تضاد نہیں تھا ان کی تنخواہ کا بیشتر حصہ غریب عزیزوں اور ناداروں میں تقسیم ہو جاتا۔ خود بہت سادہ بلکہ کسی حد تک تکلیف میں زندگی گزارتے۔ جس دن انہیں تنخواہ ملتی وہ بہت خوش ہوتے اور جامعہ کے شعبۂ اردو کے کسی طالبعلم کو یہ کہتے کہ لو اتنے اتنے روپے فلاں فلاں شخص کو منی آرڈر کر دو۔ کئی یتیم، بیوہ اور نادار طالب ان کی تنخواہ پر پلتے اور پڑھتے رہے۔ جمیل مظہری ان ترقی پسندوں میں سے بھی نہیں تھے جو نماز اور روزہ وغیرہ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ پابندی سے نہ سہی مگر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اگرچہ شریعت سے زیادہ طریقت کے پابند تھے۔ عرفان جمیل / مجموعہ مراثی وقصائد ان کی مذہب سے وابستگی کی زندہ اور روشن دلیل ہے۔

جمیل مظہری کبھی کبھی تشکیک کی منزل میں بھی بھٹکتے نظر آتے ہیں۔ تشکیک ان کے فن اور ان کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو بن گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

یہ مسلّم کہ نہ ہونے سے ہے ہونا بہتر
ہو گئے ہم تو یہ ہونا بھی ہے شفقت تیری
مگر اس بحث میں یہ نکتہ تشکیک یہ ہے
جس سے مشکوک نظر آتی ہے رحمت تیری
جس طرف دیکھئے ہے ایک سواد تشکیک
مری عقل کی آنکھوں میں ہے دنیا تاریک

☆

ہماری ہر آن آگہی میں یقیں کیا ہے گماں کی شدت
جو شک کی آغوش میں پلا ہوا اصولاً ایمان بھی وہی ہے

جہاں تک فن کا تعلق ہے اور جوان کا فنی نظریہ ہے وہاں بھی تشکیک کی کارفرمائی نظر آتی ہے اپنے ایک مضمون میں ''میرا نظریہ اور میری شاعری'' جو دو قسطوں میں 'نگار پاکستان'

میں شائع ہوا ہے۔ میں لکھتے ہیں کہ "ایک فن کار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے فن کے سلسلے میں اپنے نقادوں کی صحیح رہنمائی کرے۔ اس لئے یہ بھی عرض ہے کئے دیتا ہوں کہ علاوہ نظموں اور غزلوں کے میں نے مراثی' قصائد اور مثنوی میں بھی اپنی طبیعت کا حتی الوسع امتحان لیا ہے۔ اور بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ ان اصناف میں جس فنکارانہ صلاحیت کی ضرورت ہے۔ وہ مجھ میں شاید موجود نہیں اپنی شاعری کے سلسلے میں میرے اندر احساس کمتری ہے شاید وہ میرے معیار کی بلندی کا نتیجہ ہو' اپنے معیار کی بلندی سے جب میں نے اپنے کلام کو دیکھا تو مجھے اس کی پستی کا ایماندارانہ احساس ہوا' جینے کے لئے بہر حال تھوڑے سے غرور کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے مجھے بجھنے دیجئے کہ ارتقاء کی راہ میں میرا ذوق اس تیزی سے آگے بڑھا کہ میری ذہنی صلاحیت اس کا ساتھ نہ دے سکی اور پیچھے رہ گئی۔' اب سوال یہ ہے کہ ہر شعبے میں ناکامی کے باوجود میں بھی شعر کہتا ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ میرا ایک نفسیاتی مرض ہے جس کے دورے مجھ پر کبھی کبھی پڑتے ہیں مگر جمیل مظہری کے مندرجہ بالا قول سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ واقعی ہر شعبۂ فن میں ناکام ہو گئے تھے یہ ایک طرف تو ان کی تشکیک کا عالم ہے اور دوسری طرف اسے ایک بڑی حد تک ان کی انکساری پر محمول کر سکتے ہیں۔ ورنہ نظم ہو یا غزل یا نثر ہر صنف کے میدان میں جس میں ان کا اشہب قلم دوڑا اور کامیاب اور کامران رہا۔

جمیل مظہری نے جن لوگوں سے ابتدا میں اثرات قبول کئے ان میں وحشت کلکتوی (جن کی شاگردی اختیار کی تھی) آغا حشر کاشمیری' ناطق لکھنوی' آرزو لکھنوی' نواب نصیر حسین خیال اور ابوالکلام آزاد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جمیل مظہری کو جوش ملیح آبادی کی صحبت بھی ملی جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں۔ فلمی دنیا میں جوش ہی انہیں لے گئے تھے۔ جمیل مظہری کے یہاں جو خدا سے بیباکانہ شوخی کا انداز ملتا ہے۔ وہ یقیناً جوش کا اثر ہے اور بقول شخصے یہ نقص ان کے یہاں جوش کے وسیلے سے آیا ہے۔ یوں تو اللہ سے شکایت علامہ اقبال نے بھی کی ہے مگر شکوہ کرتے وقت بھی انہوں نے آداب اور شائستگی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ علامہ اقبال سے متاثر

ہونے کے باجود جمیل مظہری نے اقبال کا یہ شیوہ نہیں اپنایا بلکہ جوش کا انداز اور لہجہ قبول کرلیا۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

حیرت ہے نظام حکمرانی پہ ترے
پھٹکار ہے اس جہانِ فانی پہ ترے
یہ غنچہ نا شگفتہ کھلتا کیا ہے
ہنستا ہے کمال باغبانی پہ ترے

☆

اے عالم کیف وکم کی رونق انساں
ہے کون سنے جو تیری ہوحق انساں
یہ کس کو پکارتا ہے رو رو کر تو
احمق انساں ہائے احمق انساں

(فریب دعا)

بچہ ترا نزع میں سسکتا ہوتا
کچھ اس نے بلک بلک کے مانگا ہوتا
اس وقت غرور کبریائی تیرا
تخلیق کی لعنتوں کو سمجھا ہوتا

مندرجہ بالا آخری رباعی علامہ جمیل مظہری نے اپنی بچی کی وفات پر لکھی تھی۔ شفقت پدری اپنی جگہ مگر یہ انداز جوش کا کہا جاسکتا ہے ہوش کا ہرگز نہیں۔

اس سلسلے میں جمیل مظہری کا یہ شعر توجہ طلب ہے

سارے جھگڑے ہیں جمیل اپنے خدا سے
منکر میں آئمہ کا نہ منکر ہوں نبی کا

کہا جاتا ہے کہ جمیل مظہری کسی حد تک تناسخ کے بھی قائل تھے جیسا کہ فکر جمیل کے مرتب

نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے اور اس مجموعہ کے اس قطعہ پر نوٹ لگایا ہے کہ'' شاعر کسی نہ کسی شکل میں تناسخ کا بڑی حد تک قائل ہے'' دیکھئے ان کا مجموعہ فکر جمیل۔

جو تھی تصور میں تیرے پستی تو پھر کھینچتی روح سوئے ہستی
عدم میں جی کس طرح بہلتا کہ نفس تھا زندگی کا بھوکا
فنا میں راز بقا یہی ہے مزاج نشو ونما یہی ہے
ہوا وہ نخل وجود بڑھ کر جو تخم تھا تجھ میں آرزو کا

اس خیال کو کسی حد تک تقویت ان کی آخری نظم 'گور رسیدہ' کے اس بند سے بھی ہوتی ہے:۔

کیوں ڈروں موت سے یہ سرِ نہاں کیا ہے جمیلؔ
آگ دوزخ کی پئے سوختہ جاں کیا ہے جمیلؔ
جو بلندی کا مسافر ہو نظریں اس کی
اک خیاباں ہے سرراہ نہاں کیا ہے جمیلؔ
چن کے کچھ پھول نکل آئیں گے اس گلشن سے
کیا مسافر کو تعلق ہو کسی مسکن سے

ان چند مستثنیٰ باتوں کے جمیل مظہری کے یہاں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس کی رُو سے ان پر کوئی الزام عائد کیا جائے۔ وہ ایک اچھے مسلمان اور اچھے انسان تھے۔ علامہ جمیل مظہری علامہ اقبال سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ علامہ اقبال کے افکار اور ان کے فلسفے کا عکس ان کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔ مگر کہیں کہیں ان کے فلسفے اور فکر سے اختلاف بھی کیا ہے۔ کبھی تو اقبال کے اس طرح ہم خیال نظر آتے ہیں:۔

فغفوریت کا کفر تو ٹوٹا مگر جمیلؔ
جمہوریت ہے فتنۂ دوراں ابھی تلک
میری فغاں سے شکایت ہے سونے والوں کو
میرا گناہ یہی ہے کہ جاگتا ہوں میں

اجالے کے پجاری مضمحل ہیں کیوں اندھیرے سے
کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی اگلتے ہیں

....

کیا آخری شعر پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن میں اقبال کا یہ مصرع نہیں آ جاتا (کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا)

مگر جمیل مظہری یہ کہہ کر ''اپنے مرشد فن علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ'' ایسے اشعار بھی کہہ ڈالتے ہیں۔

سورج کا جلال آب و گل سے پوچھے
ذروں کے مزاج منفعل سے پوچھے
شاہین کی عظمت سے کسے ہے انکار
لیکن کوئی کنجشک کے دل سے پوچھے

....

موتی سے ہے ایک بوند آنسو بہتر
غولانِ بیاباں سے جگنو بہتر
عصفور کا خون تو اس کی چنگل میں نہیں
ہے آپ کے شاہیں سے تو الّو بہتر

جمیل مظہری کی رباعیات پر بالخصوص جوش کا اثر واضح اور نمایاں ہے۔ خیالات میں بھی جوش کی ہمنوائی نظر آتی ہے اور لہجہ بھی جوش سے ملتا جلتا ہے مگر بحیثیت مجموعی جمیل مظہری کا بیشتر کلام منفرد رنگ کا حامل ہے۔ جمیل کی شاعری جوش کی شاعری سے بلند اور بہتر ہے۔ جمیل مظہری کے یہاں جوش ملیح آبادی کے کلام کی طرح حشو وزوائد اور افراط و تفریط کے نقص سے پاک ہے نیز جمیل مظہری کے یہاں نعرہ بازی نہیں ہے جمیل مظہری۔ کبھی کھو کھلے انقلاب کا نعرہ

نہیں لگاتے۔

جہاں تک جمیل مظہری کے اشعار کی قدردانی اور ان کی شہرت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ سب سے پہلے جمیل مظہری کو ادبی دنیا میں ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی نے بھر پور طریقے سے روشناس کرایا۔ اس طرح انہوں نے وہی کام انجام دیا جس طرح حالیؔ نے ''یادگار غالب'' لکھ کر غالبؔ کی عظمت لوگوں سے منوالی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے بعد بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی جمیل مظہری کے فن اور ان کی شخصیت پر مقالے اور مضامین لکھے۔ ان میں چند خاص لوگ یہ ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی' احتشام حسین' مولانا سعید احمد اکبرآبادی' علی جواد زیدی' پروفیسر ارشد کاکوی' ڈاکٹر علی اکبر نقوی' پروفیسر نظیر صدیقی' اختر علی تلہری' ارشاد فاطمی' ڈاکٹر صفدر حسین' ڈاکٹر اختر قادری' رضا کاظمی وغیرہ۔

مجنوں گورکھپوری نے اپنی کتاب ''افسانہ'' کا انتساب جمیل مظہری کے نام کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے جمیل مظہری کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

جمیل فکر جمیل تیری فلک سے تاروں کو توڑ لائی
اگر کہیں شعر کے جبیں ہو تو ڈھونڈ لے تیرا آستانہ

جوش ملیح آبادی نے ایک بار پٹنہ کالج (پٹنہ) کے مشاعرے میں یہ کہا کہ جب آپ کے شہر میں جمیل مظہری جیسا عظیم شاعر موجود ہے تو مجھے کیوں بلاتے ہیں۔ ایک شعر میں جوش ان کی عظمت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:۔

بحمد اللہ کہ جوشؔ اس بد مذاق زمانے میں
جمیل مظہری سا قدرداں بخشا گیا مجھ کو

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جمیل مظہری نے غزلیں بھی کہیں ہیں اور نظمیں بھی۔ اور ان دونوں اصناف سخن پر انہیں یکساں قدرت حاصل تھی' مجموعہ نقش جمیل' ان کی نظموں کا شاہکار

ہے تو فکر جمیل ان کی بہترین غزلوں کا آئینہ ہے۔ نقش جمیل میں ان کا شعری سرمایہ مختلف عنوانات کے تحت اس طرح درج ہے:۔

(۱) تفکرات و تاثرات (۲) سیاسیات و عمرانیات (۳) رومانیات شبابیات (۴) متفرقات (۵) باقیات۔

اسی طرح 'فکر جمیل' میں بھی انہوں نے کئی ابواب قائم کئے ہیں جو اس طرح واقع ہیں۔

(۱) ۴۰ء کے بعد کی غزلیں (۲) آہنگ نو (ترقی پسند رجحانات کے زیر اثر لکھی گئی غزلیں) (۳)۔ پریم گیتا (رومانی' جذباتی غزلیں نیز اردو تغزل کو ایک سانچے میں ڈھالنے والی تجرباتی غزلیں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک کی غزلیں جو بجائے خود اپنی جگہ غزلیں ہیں۔

جہاں تک جمیل مظہری کی غزلوں کا تعلق ہے وہ ایک بلند پایہ غزل گویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جمیل مظہری کی غزلیں اردو غزل کی تاریخ میں اس لئے بھی اہمیت کی حامل ہیں کہ انہوں نے غزل میں نت نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ کہیں زبان کا تجربہ ہے تو کہیں ہیئت کا تجربہ ہے۔ غزل کے موضوعات میں بھی انہوں نے جدت سے کام لیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بڑا تنوع ہے۔ ان کی غزل گوئی کا ایک دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا رہا ہے جسے پریم گیتا کے عنوان سے انہوں نے اپنے مجموعہ کلام میں شامل کیا ہے۔ اس حصے میں رومانی اور جذباتی انداز کی غزلوں کے علاوہ وہ غزلیں بھی شامل ہیں جن میں ہندی اور اردو تغزل کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا تجربہ شاعر نے کیا ہے اور بقول شاعر'' ان افکار اور خیالات کا ایام شباب سے تعلق ہے''

'' یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا'' اس دور کی غزلوں میں ایک نام بار بار آتا ہے وہ نام عذرا کا ہے جس کا اصل نام کچھ اور تھا) جو شاعری کی محبوبہ تھی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

سنا عذرا تمہاری چوڑیوں سے آج وہ نغمہ
جوانی جس کو سنتی آ رہی تھی دل کی دھڑکن سے

☆

تم اے عذرا مرے دل کی طبیعت کو کہاں سمجھیں
کہ ہر دھڑکن کو اپنے ہی نظر کی شوخیاں سمجھیں

☆

ہمارا سورج ہو تمہیں عذرا تمہیں سے یہ سوز شاعری ہے
تمہارے شاعر کی زندگی بھی غریب ذرّوں کی زندگی ہے

اور یہی عذرا عشق و رومان کا وہ سہارا تھی جو جمیل مظہری سے اس قسم کے اشعار کہلواتی رہی۔

جمیل اپنی سخنوری بھی فسوں گری ہے مصوری ہے
بنا کے تصویر مہ جبینوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا

عرق جبیں پہ لٹیں پریشاں
جھکی ہیں نظریں کھلا ہے دیواں
وہ زیر لب مسکرا رہی ہیں
جمیل کو داد مل رہی ہے

☆

سمو رکھی تھیں جن میں مظہری نے دھڑکنیں دل کی
تم ان غزلوں کو بھی شاعر کا انداز بیاں سمجھیں

اسی دور میں ہندی اردو تغزل کا نیا تجربہ کیا تھا اس کی بھی چند مثالیں دیکھئے۔

یہ میرے جیون کی راگنی کیا پریم کی یہ میٹھی بانسری کیا
یہ دان تم نے دیا ہے جن نے ملا ہے من کو یہ راگ تم سے

☆

نہا نکھر کر ہماری رادھا نے آج پہنی ہے دھانی ساری
لٹیں ہیں شانوں پہ بھیگی بھیگی کہ کھیت پر اَبر جھومتا ہے

☆

وہ اور ان کی انیلی سکھیاں ندی کی نہروں سے کھیلتی ہیں

گھنیرے پیپل کی ڈالیوں میں شریر عاشق چھپا ہوا ہے

اسی دور میں انہوں نے گیت بھی لکھا اور ریختی بھی کہے۔ ان کی ایک ایک مثال دیکھئے:۔

روپ بھی مایا رنگ بھی مایا

مایا من کی جیت

چلتی پھرتی چھاؤں میں دونوں

کیا جیون کی پیت

یہ ہے نیند اور وہ ہے سپنا پھول پہ جیسے سیت

پیت یہی ہے پیت

ریختی

سوتے میں چونک اٹھتی ہوں سکھی اندر والا گھبراتا ہے

اٹھ اٹھ کر آدھی راتوں کو یہ جنسی کون بجاتا ہے

۱۹۴۰ء کے بعد کی غزلوں میں جمیل مظہری کے ذہن کی پختگی اور شاعر کا شعری شعور پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے:۔

کچھ بھی نہ ملا ہاتھ کو کشکول بنا کے

یہ دست دعا کاسۂ خالی ہے خودی کا

نہ گھبرا جوانی کی بے رہروی سے

یہ دریا بنا لے گا خود ہی کنارا

تمناؤں کے گھر میں ناامیدی آ نہیں سکتی

محبت نے تصور کو بٹھا رکھا ہے پہرے پر

☆

مٹاتے کیوں ہو نقشِ پائے رہبر
بہت سے لوگ پیچھے آ رہے ہیں

☆

دل سائل پہ عتاب آج بھی منعم بھی سبک
طبع منعم پہ سکوت لب سائل بھاری

☆

جب خاک ہی ہونا تھا مجھ کو خار رہ صحرا ہوتا
اک کوشش پیہم تو ہوتی اٹھتا ہوتا گرتا ہوتا
موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھودی
قطرے کے لئے بہتر تھا یہی قلزم بنتا دریا ہوتا

☆

ہے روح کی تاریکیوں میں حیران بجھا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سر راہ یہ مسافر پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

اسی دور میں وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے۔ ایسی غزلیں جو بیشتر جدید ترقی پسندانہ رجحان کے زیر اثر لکھی گئیں انہیں شعر نے ''آہنگ نو'' کے زیر عنوان ایک علیحدہ باب میں شامل کیا ہے۔ اس دور تک آتے آتے شاعر کا ذہن اور بھی زیادہ ماہرانہ اور استادانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے اور ان کا فن اپنے عروج پر پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے

غبار کارواں ہم ہیں نہ پوچھو اضطراب اپنا
کبھی آگے چلتے ہیں کبھی پیچھے بھی چلتے ہیں

گرا تو ہوں مگر اے چشمِ اعتبار یہ دیکھ
کہ کس بلندی معیار سے گرا ہوں

☆

اے مرے وطن تجھ میں دل غریب شاعر کا
جھونپڑی میں مفلس کی جیسے سرد چولہا ہو

☆

اے شوق سلامت رہیں یہ وقت کے دھارے
تنکوں کا سفر ہے انھیں موجوں کے سہارے

☆

لکھے نہ کیوں نقشِ پائے ہمت قدم قدم پر مرا فسانہ
میں وہ مسافر ہوں جس کے پیچھے ادب سے چلتا رہا زمانہ

☆

اجالے کے پجاری مضمحل کیوں ہیں اندھیرے سے
کہ یہ تارے نکلتے ہیں تو سورج بھی اگلتے ہیں

اس کے بعد جمیل مظہری کی تازہ ترین غزلوں کے کچھ اشعار اس خیال سے نقل کر رہا ہوں تاکہ آج اور کل کے فرق کا اندازہ کیا جاسکے۔

تمہیں سب کچھ ہو تمہارے لئے ہنستا ہوں
کھیل لو مجھ سے تمناؤ کھلونا ہوں میں

☆

جمیل بند ہیں آنکھیں چل رہے ہیں لوگ
اسی کا نام ہے چلنا تو چل رہے ہیں لوگ
ادھر بھی دھوپ کڑی ہے ادھر بھی دھوپ کڑی
خود اپنے سائے کے اندر ٹہل رہے ہیں لوگ

☆

کیا آ کے سیو گی اس چاک گریباں کو
جس ہاتھ سے پھاڑا تھا اسی ہاتھ سے سیتے ہیں

☆

بھگوانوں کے پیارے ہیں دھنوانوں کی مت پوچھو
اندر کے دُلارے ہیں اندرا کے چہیتے ہیں

☆

اب جیت کہو اس کو یا ہار کہو اس کو
تم جیت کے ہارے ہو ہم ہار کے جیتے ہیں

☆

عکس میرا ہے یہ کہ تیرا ہے
آئینہ کیا کہے کہ گونگا ہے

☆

نہ زباں اپنی بدیسی نہ پرایا ہے دیس
ہے مگر بات کچھ ایسی کہ گونگا ہوں میں

☆

گھپ اندھیرا جدھر نظر جائے
بھاگ کر آدمی کدھر جائے

☆

تم دیکھو بلندی آسماں کی
میں اس کا جھکاؤ دیکھتا ہوں

سقوط ڈھاکا کا اثر بھی ان کے دماغ پر پڑا اس واقعے سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی جس میں

اپنے احساسات کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

آہ بنگلہ نے میری ہنسی چھین لی
تھی جو چھوٹی بڑی ہر خوشی چھین لی
بے بسی چھوڑ دی مفلسی چھوڑ دی
تیرگی چھوڑ دی روشنی چھین لی

جمیل مظہری نے نہ صرف اردو میں شعر کہے ہیں بلکہ فارسی میں بھی شعر گوئی کا کمال دکھایا ہے۔ فارسی غزل کے چند اشعار دیکھئے:۔

بہ نیرنگ جہان تو جہان من نمی گنجد
بیاباں عالمے نہ ارد کہ در گلشن نمی گنجد
خوشا ایں جشن نوروزی کہ شد پیر مغاں ساقی
مئے نکہت بجام گل دریں گلشن نمی گنجد

☆

فغاں اوبگوش صاحب محمل نمی آید
مگر آواز مجنوں مظہری از دل نمی آید

☆

من ایں دانم کہ ساحل عافیت گاہیت درطوفاں
ولے دل ناخدائے من سوئے ساحل نمی آید

☆

فروغ حسن تو آدم بہ قلب ماو بیرون شد
فغاں بر حال خرمن برق در خرمن نمی گنجد

غزل کے علاوہ جمیل مظہری نے نظمیں، رباعیات، قطعات، مسدس، مخمس، ترجیع بند اور

ترکیب بند غرضیکہ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے میں بعض اصناف سخن کی مثالیں پیش کرنے سے گریز کر رہا ہوں ہاں مختصراً ان کی نظم نگاری کا تذکرہ ضروری ہے کیوں کہ نظم گو کی حیثیت سے وہ ایک بلند اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں ان کی نظموں کا مجموعہ 'نقش جمیل' ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت نظمیں شامل کی گئی ہیں جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی پہلی نظم 'بادل کی بیٹی' شائع ہوئی۔ جمیل مظہری کی سیاسی نظموں میں 'برادران نو جوان بڑھے چلو' کافی مشہور ہوئی اور خود جمیل مظہری اس نظم کو اپنی سیاسی نظموں میں شاہکار سمجھتے ہیں۔ رومانی نظموں میں ان کی نظم "ذرو خدا سے ذرو" کی بہت زیادہ شہرت ہوئی اور اس نظم کو اپنی رومانی نظموں میں شاہکار قرار دیتے ہیں۔ نظم نگاری سے متعلق جمیل مظہری اپنے مضمون 'میرا نظریہ شعر اور میری شاعری' (نگار پاکستان) میں کہتے ہیں کہ "زیادہ سے زیادہ اقبال کی تقلید کی لیکن میری ذہنیت کا سانچہ علامہ موصوف کے سانچے سے جداگانہ تھا اس طرح تقلید کا حق بھی پوری طرح ادا نہ ہو سکا اور کلام کا یہ رنگ ہو گیا۔

فسانہ چاہیے اس چشم سحرفن کے لئے　　غرور خودگری ناز خودشکن کے لئے
کرے جوخوں سے فراہم نموچمن کے لئے　　دلوں میں سوز بھرے گرمیٔ سخن کے لئے
ہزار شمعیں جلائے اک انجمن کے لئے

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جمیل مظہری کی نظموں پر اقبال کے فکر ان کے خیالات اور ان کے انداز بیان کی گہری چھاپ موجود ہے اور فرق بھی ہونا چاہیئے کیوں کہ دو شخصیتیں ہیں ایک ترقی پسند کہلاتے ہیں تو دوسرے کو شاعر اسلام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ انہوں نے اقبال کی شاعری سے استفادہ کیا ہے مثلاً یہ اشعار دیکھئے:۔

کس سے پوچھوں یہ ہنگامہ ہستی کیا ہے　　یہ جنوں کیا ہے یہ فسوں کیا ہے مستی کیا ہے
برق یہ ابر کی ہر چیز پہ ہنستی کیا ہے　　جب بلندی کی یہ فطرت ہے تو پستی کیا ہے

چہرۂ نور پہ یہ پردہ ظلمت کیوں ہے — یہ اُجالے کو اندھیرے کی ضرورت کیا ہے
قبلہ احساس کی یہ سلسلہ بندی کیسی — ثوئے تخلیق کی افسانہ پسندی کیسی
جبکہ پستی میں اتارا تو بلندی کیسی — شرط انصاف ہے یہ حوصلہ مندی کیسی
جن کا کچھ جرم نہیں ان کا ستانا کیسا — مشت ذرات کو حس دے کے رُلانا کیسا

کیوں نہ بلبلوں کہ تخیل ہے پریشاں میرا — عشق کیا عقل نے پھاڑا ہے گریباں میرا
کشتۂ ناز خرد ہے دل ناداں میرے — ابھی تشکیک کی منزل میں ہے ایماں میرا
ہوشیار اس کا بھی مالک مری نادانی میں — جو میں گستاخ ہوں آئین غزلخوانی میں

کیا اس نظم 'فریاد' پر جس کے تین بند میں نے نقل کیے ہیں شکوہ کا اثر نہیں ہے۔ عنوان بھی ہم معنی ہے یعنی 'شکوہ' کی جگہ 'فریاد' رکھا ہے' بعض مصرعے تو صاف اعلان کرتے ہیں کہ اقبال کا اثر نمایاں ہے جیسے دوسرے بند کا مصرع ۴ 'شرط انصاف ہے ....' یا پھر آخری مصرع جو میں گستاخ........'' بلکہ پوری نظم پر اقبال کے شکوے کی چھاپ موجود ہے۔

جمیل مظہری کی نظموں سے دو اور اقتباس پیش کرتا ہوں تاکہ ان کی نظم نگاری کا کسی حد تک صحیح اندازہ ہو سکے۔

نہ ہو سوال این و آں نہ ہو تمیز بحر و بر — عبث ہے خوف تیرگی ستارے چھپ گئے اگر
چمک رہی ہیں بجلیاں بڑھے چلو بڑھے چلو — برادران نوجوان بڑھے چلو بڑھے چلو

(نوائے جرس)

یہ تم جو مجھ کو تصور میں پیار کرتے ہو — نام لے لے کے مرا آہ سرد بھرتے ہو
تمہیں خبر بھی ہے کیا مجھ پہ کر گزرتے ہو — نہ جذب دل کو بڑھاؤ ڈرو خدا سے ڈرو
یہ کیا کہ دل میں کسی کے سمائے جاتے ہو — رگوں میں خوں کا تموج بڑھائے جاتے ہو
ہر اک بوند کو آنسو بنائے جاتے ہو — کسی کو یوں نہ گھلاؤ ڈرو خدا سے ڈرو
جھکا کے سر کو جو بیٹھوں تو تم نظر آؤ — کبھی کتاب جو کھولوں تو تم نظر آؤ

انھا کے آئینہ دیکھوں تو تم نظر آؤ   نہ یوں نظر میں سماؤ ذرو خدا سے ڈرو

بقول حسین الحق (ماہنامہ سبیل۔ جمیل مظہری نمبر) اقبال کے بعد کسی کے یہاں اگر مکمل اور جامع نظم ملتی ہے تو وہ مختار صدیقی، فیضؔ، جمیل مظہری اور نشور واحدی ہیں جوشؔ، اختر شیرانی، مجاز، اختر الایمان کے یہاں مکمل نظمیں نہیں ملتیں۔ جوشؔ کے یہاں خطابت ہے مجاز اور اختر الایمان کے یہاں نیم رومانیت اور نیم خطابیت ہے'' یہ رائے حسین الحق کی ہے مگر اس میں اس قدر اضافہ کرنا چاہوں گا کہ جمیل مظہری کی نظموں میں جو توازن پایا جاتا ہے وہ ان کے ہم عصر شعراء کے یہاں مفقود ہے۔ جمیل مظہری کی نظم برابر متوازن رہی ہے ان کے اشعار کبھی شتر گربگی کا شکار نہیں ہوئے۔ فیض کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ آرائش حسن نہیں کرتے وہ بندش پر بھی توجہ نہیں دیتے ان کے یہاں محنت اور ریاضت کی کمی ہے۔

جمیل مظہری کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر اکبر نقوی کی رائے بھی بڑی وقیع اور صداقت پر مبنی ہے وہ کہتے ہیں کہ '' وہ (جمیل مظہری) ایک ایسے شاعر ہیں جن کو اپنے تجربات وافکار کی سچائی کا اس شدّت سے احساس ہے کہ وہ اپنے فن کو زندگی کا ترجمان بنا لیتے ہیں۔

جمیل مظہری کی شاعری خلوص وصداقت کی آئینہ دار ہے۔ جمیل مظہری جس طرح خود بھی خلوص وصداقت کے مظہر تھے اسی طرح خلوص اور صداقت ان کی شاعری کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اسی لئے میں جمیل مظہری کو سچائی کا شاعر کہتا ہوں۔ جمیل مظہری نے نثری نظم کا بھی مطالعہ کیا تھا اگر وہ اسے قابل اعتنا سمجھتے تو اس صنف میں بھی شعر ضرور کہتے۔ انہوں نے خود ایک نثری نظم لکھ کر اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میں طوالت کے خوف سے اس سے اقتباس پیش کرر ہا ہوں۔

نظم نما (نثری نظم لکھنے والوں سے معذرت کے ساتھ)

اس سایہ نشینان نہال تقلید، پاؤں میں کتنے سلاسل ہیں قدیم اور جدید کتنے
رنگین دھند لکے ہیں، ایک طوفان کے گرد ایک چھوٹی سی کڑی ان کی نہ توڑی تم نے

اور توڑ دی تو فقط قید عروض اور اس کے بعد اور جو توڑا تو وہ رشتہ توڑا لفظ و معنی میں جو تھا، صبح ازل سے قائم جس کو آدم نے یہاں سیکھ کے علم الاسماء بڑے پندار بڑے ناز کے ساتھ باندھا تھا۔ جمیل تم نے یک لخت اسے توڑ دیا۔ توڑ دیا ذہن خالی کو خلاؤں کی طرف موڑ دیا۔ تف بہ وجدان سخن، حیف بہ ایمان سخن، مرجان سخن، گریہ سخنداں نرسد۔ (جمیل مظہری ۴ جنوری ۱۹۷۹ء)

☆......☆

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی غزل گوئی

غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اور ڈاکٹر عندلیب شادانی سابق مشرقی پاکستان میں اردو غزل کی آبرو تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا وہ مشرقی پاکستان کے شعر و ادب کی آبرو تھے۔ ان کی ذات ایک انجمن کی حیثیت رکھتی تھی۔ انہیں کے دم سے وہاں کے شعر و ادب کی محفلوں میں رونق اور زندگی تھی۔ وہ دبستان ڈھاکا کے منفرد' ممتاز اور مقبول ترین شاعر تھے۔ وہ اس سرزمین کے شعر و ادب کے نمائندے تھے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ۱۹۲۸ء میں ہی ڈھاکہ آ گئے تھے اور ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے تھے اور ۱۹۶۹ء تک یعنی اپنے انتقال کے وقت تک اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی بڑی جامع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت شاعر' افسانہ نگار (سچی کہانیوں کے موجد) نقاد' محقق' مورخ' مدیر اور ایک کامیاب اور مقبول معلم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''نشاط رفتہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ بھی ترتیب دے چکے تھے جس کا نام 'نشاط رفتہ کے بعد'' رکھا تھا مگر وہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ اب پتہ نہیں وہ مسودہ کس کے پاس ہے اگر وہ مجموعہ بھی شائع ہو جاتا تو اچھا ہوتا۔ نشاط رفتہ میں ان کی نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ مگر ڈاکٹر عندلیب شادانی کا غالب رجحان غزل گوئی ہی کی طرف تھا۔ اسی لئے پروفیسر نظیر صدیقی نے کہا تھا ''موضوع ماحول اور فضا کے اعتبار سے دونوں ایک ہی نوع کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں'' ڈاکٹر عندلیب شادانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور وہ ایک کامیاب اور مقبول غزل گو ہی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں یا یہ کہنا بہتر ہوگا

کہ ان کی غزلیں ہی ان کی وجہ شہرت ہیں۔ وہ جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ غزلیں کہتے تھے وہ بات دیگر اصناف سخن میں نظر نہیں آتی۔ شادانی صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں بلکہ آزاد نظمیں بھی کہیں مگر ان کی تمام تر شہرت اور مقبولیت کا راز ان کی غزل گوئی ہی میں ہے۔

وہ بلاشبہ سابق مشرقی پاکستان ہی کے نہیں بلکہ اپنے دور کے ایک اہم اور مقبول ترین شاعر تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کا آغاز نظم گوئی سے ہوا مگر وہ غزل گو کی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہوئے۔ ان کے دلی جذبات اور قلبی واردات غزل کے مزاج سے ہم آہنگ تھے وہ طبعاً غزل کی طرف مائل تھے یعنی وہ غزل کے لئے تھے اور غزل ان کے لئے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا تعلق انہیں غزل گو شعراء سے ہے جن پر لوگ روایت پرستی کا الزام بھی لگاتے ہیں حالانکہ یہ بات درست نہیں بلکہ میں اسے ایک سطحی بات سمجھتا ہوں کیوں کہ غزل روایتی ہو یا جدید اگر اس میں تغزل نہ ہو تو ایسی غزل قابل توجہ نہیں ہوتی۔ جہاں تک عندلیب شادانی کا تعلق ہے انہوں نے اردو غزل کو ایسا حسن اور رنگ بخشا جس کی چمک دمک آج بھی قائم ہے اسی لئے آج بھی لوگوں کو ان کے درجنوں اشعار یاد ہیں اور ان کو موقع کے لحاظ سے سناتے بھی ہیں۔ شادانی صاحب کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو غزل کو زندہ رکھا ہے یعنی اسے نئی زندگی دی ہے اور اسے پروان چڑھایا ہے۔ عندلیب شادانی نے اردو غزل کے معاملات حسن وعشق اور رومان کے تذکرے نئے انداز، نئے لب ولہجہ میں اور نئے ... سے چھیڑے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی شاعری میں نفسیاتی رموز ونکات اس خوبصورتی سے پیش کئے ہیں کہ جس کی وجہ سے ان کو اردو غزل گویوں میں منفرد مقام ملا اور انہوں نے غزل گو کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کی۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے انسانی فطرت کا بڑا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے مشاہدے اور تجربے میں جو باتیں آئیں ان کو نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں اپنے اشعار پیش کر دیا وہ ایک زبردست نباض فطرت تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار کے مطالعے سے اس حقیقت کا

ثبوت مل جائے گا۔ ان اشعار میں نفسیاتی رموز اور حقائق کی نہایت روشن اور عمدہ مثالیں ملتی ہیں

بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے
تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں

☆

خود سوچتا ہوں میں کہ یہ کیا ہو گیا مجھے
وعدہ نہیں کسی کا مگر انتظار ہے

☆

دوستو! تم پہ بھی گزرا ہے کبھی یہ عالم
نیند آتی نہیں اور خواب نظر آتے ہیں

☆

دل سے اک دھواں اٹھا آنکھ ڈبڈبا آئی
انتظار کی آخر کوئی انتہا بھی ہے

☆

نہ سن میری محرومیوں کا فسانہ
تجھے ضبط غم اور دشوار ہوگا

☆

تم تو ہمیں کو کہتے تھے یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

☆

میں اس کو بھولا ہی کب تھا نفس کا یہ بھی دھوکا تھا
سچ سچ جس کو بھول گئے ہوں کیا وہ یونہی یاد آتا ہے

☆

دل جدھر جھکا جھکا اور جدھر رکا رکا

کوئی بے وفا نہیں کوئی با وفا نہیں

اس آخری شعر کی تشریح شادانی صاحب نے خود مجھ سے کی تھی۔ انہوں نے ایک نفسیات کی کتاب کا حوالہ دیا جس کا مطالعہ انہوں نے ان دنوں کیا تھا انہوں نے کہا کہ یہ انسان کی عادت اور اس کی فطرت ہے کہ کبھی وہ کسی کے قریب آ جاتا ہے پھر کسی دوسرے کے قریب' یعنی جیسے جیسے ملاقات ہوتی جاتی ہے تعلقات قائم ہوتے چلے جاتے ہیں اس طرح بعض پرانے ملنے والوں کے یہاں آنا جانا کم ہو جاتا ہے اور نئے لوگوں کے یہاں آنا جانا بڑھ جاتا ہے۔ ایسا غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اس لئے کسی کو مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایمائیت' اشاریت' اختصار اور اجمال اور تغزل غزل کی بنیادی خصوصیات ہیں اور شادانی صاحب نے ان خصوصیات کو اپنی شاعری میں بدرجہ اتم برتا ہے۔ تغزل کی چند مثالیں دیکھئے:۔

میں کہوں تو شاید ہی تم کو اعتبار آئے

شب کا ماجرا پوچھو آستین و بالش سے

☆

رات کچھ ایسا تصور نے ترے بیخود کیا

ڈال کر اپنے گلے میں اپنی بانہیں چوم لیں

☆

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں

انہیں کی یاد میری زندگی ہے

☆

مجھے بھول جانے والے مجھے یاد آنے والے

تجھے اپنی خلوتوں کا کوئی یاد ہے فسانہ

☆

تم دور تھے نظر سے اور چاندنی کھلی تھی
آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کیے ستارے

☆

گو بلے ہوا ہی سے پردۂ حریم ناز
دل یہی سمجھتا ہے شوق کارفرما ہے

☆

سنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہے
کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے

☆

اڑی بازوؤں سے مرے جو شمیم مشک و عنبر
کئی دوست کچھ نہ سمجھے کئی دوست مسکرائے

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے آخری مصرع پہلے اس طرح کہا تھا جسے بعد میں بدل دیا۔

''اڑی بازوؤں سے میرے جو بھینی بھینی خوشبو''

حسن محو خواب تھا شب یا مرے آغوش میں
بوستاں بھر پھول تھے اور آسماں بھر چاندنی

اس آخری شعر کے بارے میں پروفیسر نظیر صدیقی کہتے ہیں ''میرا خیال ہے کہ آخری شعر کے دوسرے مصرع کا انداز بیان اتنا نادر ہے کہ اس کی مثال اردو شاعری میں شاید ہی کہیں مل سکے''

ڈاکٹر شادانی کے اشعار میں تشبیہات اور استعارات کا بہت خوبصورت' دلنشیں اور پر اثر انداز ملتا ہے۔ ان کے استعارات اور تشبیہات میں تازگی بھی ہے اور جدت بھی۔

تم دور تھے نظر سے اور چاندنی کھلی تھی
آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کیے ستارے

☆

کشش بدر سے چڑھتا ہوا دریا دیکھا
اللہ اللہ وہ عالم تری انگڑائی کا

☆

بنا گوش میں اس کے الماس پارہ
درخشندہ جیسے شفق میں ستارہ

☆

تارے سے شفق میں جھلکے تھے شبنم میں پھول نہایا تھا
وہ کتنا دلکش منظر تھا جب تم کو پسینہ آیا تھا

☆

آنسو جو ہوئے خشک تو جلنے لگیں آنکھیں
گہوارۂ شبنم میں شرر دیکھ رہا ہوں

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ان غزلوں میں خلوص اور جذبے کی صداقت کا بھرپور اظہار پایا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک بار خود مجھ سے کہا تھا کہ میرے ہر شعر کا پس منظر صداقت ہے اور شعر سچا ہے۔ گویا ان کے اشعار ''حسن صداقت ہے اور صداقت ''حسن'' (Beauty is Truth, Truth is Beauty... (Keats) کی تصویر نظر آتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ شادانی صاحب کو قدرت نے ذوق جمالیات (Aesthic Sense) سے نوازا تھا اس لئے حقیقت بیانی کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار جمالیات کا پیکر بھی ہوتے ہیں۔ بقول نظیر صدیقی ''ان کے نزدیک غزل نام ہے روداد محبت بیان کرنے کا'' آگے چل کر نظیر صدیقی لکھتے ہیں کہ

> ''شادانی صاحب کی محبت مجازی ہے ماورائی نہیں پھر بھی ان کے عشق یا عشقیہ شاعری میں جتنی پاکیزگی، جتنی معصومیت اور جتنی طہارت ہے اتنی اوروں کے یہاں مشکل ہی سے نظر آئے گی''

مجھے تو اس سلسلے میں شادانی صاحب مومنؔ اور حسرتؔ موہانی سے کسی حد تک قریب تر نظر آتے ہیں۔ اگر عشقیہ جذبات اور معاملات میں حسن و عشق کے حقائق کو شاعرانہ انداز میں اور دلنشیں پیرائے میں پیش کیا جائے تو اشعار میں حسن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد" جذبات کی صداقت نے ان کے اشعار میں زبردست حسن اور تاثیر پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شادانی صاحب کے بہت سے اشعار پڑھنے والوں اور سننے والوں کو متاثر کرتے ہیں اور ہر شعر پر گمان ہوتا ہے کہ "دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" اچھے شعر میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ Travel کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار نہ صرف پاکستان میں بطور حوالہ پیش کئے جاتے ہیں بلکہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں ان کی شاعری کا چرچا ہوتا ہے۔ آخر میں چند اشعار بطور حوالہ پیش کرنا چاہوں گا جن کی شہرت دور دور تک پہنچی ہے ایسے اچھے اشعار کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے اس قبیل کے کچھ اور اشعار دیکھئے:۔

عشق سے ہوتا ہے آغاز حیات
اس سے پہلے زندگی الزام ہے

☆

تم آئینے میں اپنے لب چوم لینا
یہی دور افتادہ کا پیار ہوگا

☆

وہ الم کشوں کا ملنا وہ نشاط و غم کے سائے
کہیں رو پڑا تبسم کہیں اشک مسکرائے

☆

تم جبر و محبت کیا جانو اچھا یہ بتاؤ تم نے کبھی
ہنستی ہوئی آنکھوں کے پیچھے اشکوں کا سمندر دیکھا ہے

نہیں جو لطف مسلسل دلِ حزیں نہ تڑپ
تمام رات کہیں چاندنی نہیں ہوتی
☆
شوق کی رات ہے ناز کی رات ہے
اور تقدیر سے چاندنی رات ہے
☆
اک پہیلی ہے بوجھو تو جانیں کہ ہاں
آج کیوں اس قدر مہتی رات ہے
☆
خود ہی گن لو مری عمر کی ساعتیں
آج تم سے ملے کون سی رات ہے
☆
رو چکے آؤ ہنس بول لیں دو گھڑی
جو نہ آئے گی پھر یہ وہی رات ہے
☆
دردِ دل کہتے کہتے سحر ہوگئی
کیا خبر تھی کہ یہ آخری رات ہے
☆
میں تجھے بھول گیا ہائے تری سادہ دلی
کوئی طائر کبھی بھولا ہے نشیمن اپنا
☆
دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو
آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا ویسے ہم گھبرائے تو
☆

شفق دھنک مہتاب گھٹائیں بجلی تارے نغمے پھول
اس کے دامن میں کیا کچھ ہے وہ دامن ہاتھ آئے تو

☆

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھئے
اک پھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

☆

چوٹ پڑی ہے دل پر تو آہ لبوں تک آئی ہے
یونہی چھن سے بول اٹھنا تو شیشے کا دستور نہیں

ان کا ایک شعر ہے جس میں اس مقولے سے فائدہ اٹھایا ہے کہ History Repeats Itself تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اس غزل کے چند اشعار دوسرے اشعار اوپر درج کر چکا ہوں۔ اسی غزل کا یہ شعر ہے:۔

جھوٹ ہے سب تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے
اچھا میرا خواب جوانی تھوڑا سا دہرائے تو

غرض یہ کہ ایسے بہت سے اشعار ہیں جو قارئین کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں مگر طوالت کے خوف سے ان کا درج کرنا ممکن نہیں۔ ان کی شاعری کی اور بھی دیگر اہم خصوصیات ہیں جن کا ذکر اس مضمون میں مناسب نہیں ہے ایسے بعض پہلوؤں پر میں نے الگ سے لکھا ہے یا لکھنے کا ارادہ ہے۔ مثلاً ان کے یہاں چاند کا بہت ذکر ہوا ہے اور اس لئے پروفیسر عطا کاکوی نے ان کو ماہتابی شاعر یا Poet of Moon بھی کہا ہے میں نے بھی اس موضوع پر بعنوان شاعر ماہتاب لکھا ہے المختصر میں یہ کہوں گا کہ شادانی صاحب اپنے دور کے ایک ممتاز غزل گو شاعر تھے اور اب بھی ان کی شاعری کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

☆......☆

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ تحقیق کے آئینے میں

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی شخصیت بڑی متنوع اور جامع ہے۔ وہ ایک جید عالم، انشاء پرداز، شخصیت نگار، خاکہ نگار، محقق، نقاد، ماہر زبان اور ماہر لسانیت کی حیثیت سے شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے جس خلوص، لگن اور تندہی سے اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دی ہیں وہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ قدرت نے انہیں صرف اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے ہی پیدا کیا تھا۔ ان کی ان ہی گراں قدر خدمات کے پیش نظر قوم ان کو "بابائے اردو" کے نام سے یاد کرتی ہے۔

تحقیق جو زبان و ادب کا ایک مشکل اور صبر آزما شعبہ ہے' اس میدان میں بھی بابائے اردو نے اپنی بے پناہ صلاحیت اور بصیرت کا مظاہرہ کیا۔ اگر چہ انہوں نے تنقید کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں اور ان کے بہت سے تنقیدی مضامین اردو کے تنقیدی ادب میں گراں بہا سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میرے خیال میں تحقیق تنقید سے زیادہ مشکل کام ہے کیوں کہ ایک پڑھا لکھا اور ادبی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص کسی بھی ادب پارے پر رائے زنی کر سکتا ہے جو باقاعدہ تنقید نہ سہی مگر اس کی آراء کو تنقید کے دائرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح تحقیق تنقید سے زیادہ مشکل کام یا فن ہے محقق کا کام صرف پسند یا ناپسند یا شخصی رائے زنی تک محدود نہیں ہے' اس کا دائرہ اور جائزہ بہت وسیع ہے۔ محقق کا کام آثار قدیمہ کے ماہرین سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے جس طرح آثار قدیمہ کا

ماہر مدفون اشیاء کی کھدائی اور ان کی بازیافت کے بعد ہمہ تن ان اشیاء اور اس چیز کے مطالعہ اور مشاہدے میں مصروف ہو جاتا ہے اور ہر ہر زاویئے سے ان اشیاء یا اس چیز کا جائزہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ اس کام کے لئے اسے تاریخ' عمرانیات' جغرافیہ' علم الاصنام' اور اس سے متعلقہ دوسرے علوم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ سائنسی اصولوں اور عقل و استدلال کے ذریعے اس کی حقیقت جاننے اور اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات اسے لسانیات کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے یا ماہرین لسانیات سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ تقریباً یہی حال محقق کا بھی ہے یعنی اسے تلاش اور جستجو کے بعد جب کوئی نسخہ اس کے ہاتھ آ جاتا ہے تو اسے (محقق کو) کامیابی وہیں پر حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ اسے تو کامیابی کا آغاز یا پہلا زینہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد محقق اس نسخے' مسودے' بیاض' تحریر یا اس کتاب سے متعلق معلومات کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ کسی محقق نے اگر کسی نایاب کتاب کا سراغ لگا لیا تو وہ اس سے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے مثلاً یہ کتاب کیسی ہے؟ یہ کتاب کب لکھی گئی؟ اس کتاب کا موضوع کیا ہے؟ اس کتاب کا مصنف کون ہے؟ یہ کتاب کس زمانے میں لکھی گئی؟ اس کتاب کی کیا اہمیت ہے؟ اس کی کوئی تاریخی حیثیت یا اہمیت ہے کہ نہیں۔ یہ کتاب مصنف کی اپنی اپج ہے یا کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہے۔ مصنف کی علمی و ادبی حیثیت کیا ہے؟ اگر یہ کتاب مصنف کی اپنی تصنیف نہیں ہے تو اس کا ماخذ یا ماخذات کیا ہیں اور کن کن کتابوں سے مصنف نے مدد لی ہے۔ اس کتاب کی فی زمانہ کیا اہمیت اور حیثیت ہے؟ غرضیکہ اس طرح کے بے شمار سوالات اس کے ذہن میں آتے ہیں جن کے جوابات وہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ ان سوالات (یا ان میں سے بیشتر سوالات) کے جوابات حاصل کر لیتا ہے تب جا کر وہ کامیابی کی منزل پر قدم رکھتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شعر' نظم' غزل یا نثر پارے کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ اس کا شعر یا مصنف کون ہے؟ ایسے حالات میں محقق کو بڑی تحقیق' جستجو' چھان پھٹک اور موشگافیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ تحقیقی مضامین یا مقالے کا لکھا جانا محنت و مشقت' چھان بین محاکے' مقابلے اور تنقیدی صلاحیت اور بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تحقیق کا کام بڑا صبر آزما' مشکل اور محنت طلب ہے اور اس حیثیت سے جب ہم مولوی عبدالحق کی تحقیق نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ مولوی صاحب کے اندر یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جس کا اندازہ ہمیں ان کے تحقیقی مضامین کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے قیام حیدر آباد (دکن) کے دوران جو تحقیقی کام انجام دیئے وہ محتاج تعارف نہیں' وہاں بہت سی پرانی گم گشتہ' کم یاب اور نایاب کتابوں کا پتہ لگایا اور ان پر بیش قیمت مقدمات لکھ کر شائع کروائے اس کے بعد وہ ۱۹۳۸ء میں دہلی آ گئے اور پھر قیام پاکستان کے بعد کراچی ہجرت کر گئے اور کراچی میں بھی ان کا تحقیقی سلسلہ تادم مرگ جاری رہا' اس دوران انہوں نے بہت سی پرانی 'نسخوں بیاضوں اور ملفوظات کا سراغ لگایا' اور ان پر تعارفی مضامین لکھ کر ان کو کتابوں یا رسالوں میں شائع کرایا' اس طرح انہوں نے حیدر آباد اور کراچی میں بہت سی نادر اور نایاب کتابوں کی بازیافت کی اور ان پر تنقیدی حواشی اور تعارف کے بعد ان کو زیور طباعت سے آراستہ کرایا اردو زبان و ادب پر بابائے اردو کا یہ بڑا احسان ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے یوں تو بہت سے اور بے شمار تحقیقی کام کیے مگر میر امن کی سدا بہار کتاب ''باغ و بہار'' ان کی تحقیق کا ایک اعلیٰ نمونہ اور شاہکار ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ (جو انہوں نے نہایت کاوش اور تحقیق سے لکھا ہے) میں یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ کتاب فارسی کا ترجمہ نہیں ہے جیسا کہ ایک عرصے تک سمجھا جاتا رہا۔ ایسا کہتے وقت انہوں نے نہ صرف اپنی ذاتی رائے سے کام لیا ہے بلکہ تحقیق' تقابل' دلائل اور براہین سے اپنے دعوے کو سچ کر دکھایا ہے۔

بابائے اردو کا شمار اردو کے اوّلین اور اہم ترین محققین میں ہوتا ہے۔ ان کے تحقیقی رجحانات کے شواہد ان کی ابتدائی زندگی بلکہ طالب علمانہ زندگی میں ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''نرگس عظیم'' نے اپنے ایک مقالے میں جس کا عنوان مولوی عبدالحق کی ادبی زندگی کا تاریخی

جائزہ ہے (مطبوعہ'قومی زبان' اگست ۱۹۸۷ء) میں لکھتی ہیں کہ

''طالب علمی کے دوران جو مضامین دستیاب ہوئے ہیں البتہ اس عہد میں ان کی توجہ تاریخی تحقیق کی طرف تھی۔ دراصل انجمن ترقی اردو سے باقاعدہ وابستہ ہونے کے بعد ان کی تمام تر توجہ ادبی تحقیق کی طرف مبذول ہوگئی''

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بابائے اردو جب انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوگئے تو انہوں نے اپنی تمام تر توجہ زبان وادب کی تحقیق پر صرف کی اس طرح ان کی تحقیق کا رجحان تاریخ کے دائرے سے نکل کر ادبی دائرے میں داخل ہوگیا اور اس میدان میں انہوں نے ایسے ایسے معرکے سر کئے کہ ان کے ان تحقیقی کاموں کو آج ان کے اہم کارناموں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے بعض تحقیقی کارنامے اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں' اس سلسلے میں نرگس عظیم صاحبہ نے لکھا ہے کہ ان کا پہلا جو خاکہ دستیاب ہوا ہے وہ ''گندم'' ہے جو ۱۹۸۲ء میں سرمور گزٹ میں شائع ہوا اور بعد میں ہم قلم کراچی کے بابائے اردو نمبر (اگست ۱۹۶۲ء) میں نقل کیا گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے وہ تمام تحقیقی مضامین (تاریخی وادبی) جو کتابی صورت میں آنے سے بچ رہے اور ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں انہیں کتابی صورت میں شائع کردیا جائے تاکہ ان کے تحقیقی کارناموں کا ہر چہار گوشہ قارئین کے سامنے آجائے۔ محترمہ اپنے مضمون میں بابائے اردو کے تحقیقی مقالوں کی جو ترتیب وار اشاعت کے اعتبار سے فہرست دی ہے وہ یقیناً قابل قدر اور قابل ذکر ہے اس ترتیب سے بابائے اردو کے تحقیقی سفر کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔ یہ فہرست کچھ یوں ہے پہلے مقالے کا تذکرہ میں سطور بالا میں کرچکا ہوں اب اس کے بعد شائع ہونے والے تحقیقی مقالوں کی کیفیت کچھ یوں ہے۔

☆...... قاہرہ کی مسجد عمرو جو پہلے رسالہ حسن ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا پھر اشاعت مکرر کے طور پر ماہنامہ 'ہم قلم' کراچی کے بابائے اردو نمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔

☆...... ''ہلال اور تارا'' اور سنہ ہجری' رسالہ افسر' میں شائع ہوئے۔

☆ ...... دیوان رنگین رسالہ اردو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا
☆ ...... کلیات قطب شاہ رسالہ اردو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا
☆ ...... سب رس (تصنیف ملا وجہی) رسالہ اردو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا
☆ ...... سب رس۔ منظوم پر تحقیقی مضمون رسالہ اردو میں ۱۹۲۴۵ء میں شائع ہوا
☆ ...... مثنوی ''خواب وخیال'' (میراثر) ۱۹۲۶ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوا
☆ ...... شمس العشاق شاہ میرانجی ۱۹۲۷ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوا
☆ ...... ''شرح تمہید ہمدانی ۱۹۲۸ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوا
☆ ...... شاہ امین الدین اعلیٰ اور شاہ علی جیوگام دہنی اسی سال شائع ہوئے۔
☆ ...... چمنستان شعراء ۱۹۲۹ء میں رسالہ اردو میں شائع ہوا۔
☆ ...... باغ و بہار سے متعلق تحقیقی مقالہ ۱۹۳۰ء میں رسالہ اردو میں شائع ہوا
☆ ...... حیدرآباد کا ایک شاعر خاندان ۱۹۳۱ء میں رسالہ اردو میں شائع ہوا
☆ ...... مرحوم دلی کالج (چار قسطوں میں) ۱۹۳۲ء میں رسالہ اردو میں شائع ہوا' اور ۱۹۳۳ء میں یہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔
☆ ...... مقدمہ تذکرہ ہندی از مصحفی' مقدمہ مخزن شعراء از فائق اور مقدمہ تذکرہ ریختہ گویاں بھی اسی سال شائع ہوئے۔
☆ ...... ولی کے سن وفات کی تحقیق ۱۹۳۴ء میں چھپا۔
☆ ...... ملک الشعراء بیجاپور ۱۹۳۵ء میں چھپا اس کے بعد مقدمہ دیوان تاباں دہلوی مقدمہ دریائے لطافت شائع ہوئے۔
☆ ...... مقدمہ گل عجائب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔
☆ ...... پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے رسالہ اردو میں ۱۹۳۷ء میں چھپے۔
☆ ...... اردو زبان کا ایک قدیم کتبہ۔ رسالہ اردو میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

☆......مقدمہ قطب مشتری (وجہی) ۱۹۳۹ء میں چھپا۔

☆......گجرات کا ایک قدیم شاعر ۱۹۴۰ء رسالہ اردو میں شائع ہوا۔

☆......اسی سال یعنی ۱۹۴۰ میں دکنی اردو میں شاہنامے کی داستانیں اکتوبر کے مہینے میں چھپا۔

☆......شاہنامے کی چند داستانیں ۱۹۴۹ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوا۔

☆......مثل خالق باری ۱۹۵۲ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوا۔

اس طرح صرف تحقیق کے میدان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا اتنا زیادہ اور اہم کام ہے کہ ہم ان کو فراموش نہیں کر سکتے۔ مولوی عبدالحق بڑے دور اندیش ہوش مند اور پختہ کار محقق تھے۔ وہ جلد بازی یا غفلت سے کام نہیں لیتے تھے وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ تحقیق اور عجلت میں کوئی مطابقت' موافقت یا مفاہمت نہیں ہے۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں' محنت اور غور وفکر ان کی عادت بن گئی تھی جو محقق کے لئے ایک لازمی شرط ہے اس سلسلے میں خود ان کا کہنا ہے کہ

> ''بعض نوجوان انشا پردازوں کو مصنف بننے کی اس قدر عجلت ہوتی ہے کہ ان کے کارناموں میں ایسی قابل افسوس خامیاں رہ جاتی ہیں جو صرف محنت اور غور وفکر کرنے ہی سے رفع ہو سکتی ہیں''

بابائے اردو کا یہ قول صداقت اور حقیقت پر مبنی ہے اور اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ جلد بازی میں غلطی کا احتمال یقیناً رہتا ہے اور خاص طور پر تخلیقی اور تحقیقی کاموں میں تو سرے سے اس کی گنجائش ہے ہی نہیں۔ مولوی عبدالحق اپنے موضوعات پر کامل عبور رکھتے تھے وہ جب تک بات کی تہ تک نہیں پہنچ جاتے اس پر رائے زنی نہیں کرتے تھے۔ ان کے اندر وسعت نظری تھی اور مغربی ادب کے بھی کسی نہ کسی وسیلے سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ تحقیق کے مغربی اصولوں سے بھی واقف تھے۔ انہیں جزئیات سے خاص لگاؤ تھا جس کے نتیجے میں وہ معمولی سی

معمولی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ بعض الفاظ کو گمنامی کی دنیا سے نکال کر کام میں لانے کا مشورہ دیتے تھے الفاظ و محاورات صرف ونحو میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں اس سلسلے میں بھی انکی خدمات وقیع ہیں۔ بحیثیت مجموعی بابائے اردو کے تحقیقی کارنامے بڑے باوزن اور گراں قدر ہیں بلکہ تحقیق کی راہ میں ایسے نقوش ہیں جو دوسروں کے لئے بھی مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم پر اور اردو زبان پر بابائے اردو کا یہ عظیم احسان ہے کہ انہوں نے اردو ادب کے بہت سے گمشدہ اوراق کو اپنی انتھک کوششوں سے ڈھونڈ نکالا جو ہر لحاظ سے اردو زبان و ادب کا قیمتی علمی وادبی ورثہ ہیں۔

☆......☆

بابائے اردو خاکہ نگاری کے آئینے میں

اب تک اردو زبان و ادب میں خاکہ نگاری کا واضح تصور قائم نہیں ہوسکا اس کا واضح تصور نہ تو قارئین کے پیش نظر ہے اور نہ ہی اس کی واضح تعریف خاکہ نگاروں کے سامنے ہے۔جس طرح انشائیہ کی واضح تعریف یا ایسی تعریف جس پر سب متفق ہوں نہیں ملتی۔انشائیہ کی تعریف کے سلسلے میں بھی ادیبوں اور نقادوں میں اختلاف پایا جاتا ہے بلکہ خاکہ نگاری کا حال تو اس سے بھی بدتر ہے اب تک لوگ سوانح عمری' شخصیات نگاری (شخصیت نگاری) سیرت نگاری یا دداشتوں اور مرقع نگاری کو خاکہ نگاری کے ذیل میں شمار کرتے رہے ہیں۔دور کیوں جائیں صرف بابائے اردو کی خاکہ نگاری پر جن تین بڑے ادیبوں اور نقادوں (لکھا تو اوروں نے بھی مگر صرف تین مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں) نے لکھا ہے ان کے مضامین کے عنوانات سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ تمام لوگ شخصیت نگاری' سیرت نگاری اور مرقع نگاری کو ایک ہی قبیل کی چیزیں سمجھتے ہیں۔ بابائے اردو اس قسم کی تحریروں کو مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ڈاکٹر ابن فرید نے جب بابائے اردو کی اس قسم کی تحریروں کا جائزہ لیا تو اس کا عنوان 'شخصیات کی پردۂ زنگاری' میں رکھا۔ جب کہ اسلوب احمد انصاری نے مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری پر مضمون لکھا ہے۔اور پروفیسر وقار عظیم نے اپنے اس قسم کے مضمون کا عنوان ''بابائے اردو کی سیرت نگاری'' رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان ادیبوں اور نقادوں کا بھی زیادہ قصور نہیں ہے کیونکہ بابائے اردو کے اس قسم کے مضامین جو'' چند ہم عصر'' میں شامل ہیں سب کے سب خاکہ نگاری کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے ہاں ان میں سے چند عمدہ خاکوں کے ذیل میں ضرور آتے ہیں اور اسی حوالے سے ان پر بات بھی کرنی چاہیے تھی۔ان کے بیش تر مضامین میں خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری یا یادداشتوں کی ملی

جلی خصوصیات یا اوصاف پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے لوگ انہیں مختلف نام دے دیتے ہیں اس لیے ڈاکٹر صابرہ سعید اپنے مضمون ''خاکہ نگاری'' (مطبوعہ افکار' کراچی) کے اختتام پر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ خاکہ کی کوئی ایسی جامع تعریف کرنا ممکن نہیں ہے جو اس کے تمام ادبی اور فنی پہلوؤں پر حاوی ہو۔ محترمہ آمنہ صدیقی بھی اپنے مضمون میں خاکہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔:

> سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں ان میں سے ایک شخصی خاکہ ہے یہ دراصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے جس میں کسی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے جس کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخصی خاکہ کسی فرد کی مکمل داستان حیات نہیں ہوتا بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے اس میں تفصیل سے زیادہ ابہام ہوتا ہے اور ایسے اشارے کیے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتا ہے۔''

شخصیت نگاری بڑی حد تک خاکہ نگاری سے قریب تر صنف ہے مگر شخصیت نگاری میں خاکہ نگاری والی بات پیدا نہیں ہوتی دراصل خاکہ نگاری کے لئے انگریزی میں PEN PORTRAIT کا لفظ استعمال ہوتا ہے مگر بقول ڈاکٹر بشیر سیفی خاکہ پورٹریٹ کا نہیں بلکہ اسکیچ کا درجہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس فرق کو اور زیادہ اس طرح واضح کر دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''مصوری کی زبان میں بات کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سوانحی مضمون رنگین پورٹریٹ ہے...... جبکہ خاکہ پنسل اسکیچ ہے جس میں کم سے کم لائینوں میں چہرے کا تاثر واضح کیا جاتا ہے۔ اب یہ مصور کا اپنا وجدان اور فنی شعور ہے کہ وہ تاثر کو ابھارنے کے لئے چہرے کے کن خطوط کو نمایاں کرتا ہے۔''

ہم خاکے کی مختصر تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ وہ مختصر مضمون ہے جس میں خاکہ نگار اپنے مطلوبہ خاکہ (شخصیت) کے تمام خد و خال نمایاں نہیں کرتا بلکہ مخصوص الفاظ اور مخصوص انداز میں

اس شخصیت کے انھیں خدوخال کی تصویر پیش کرتا ہے جس سے اس کے مخصوص اور مطلوبہ ظاہری اور باطنی نقوش موثر انداز میں ابھر کر سامنے آ جائیں۔ اس طرح جب ہم بابائے اردو کے ''چند ہم عصر'' پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں شامل سارے مضامین تو خاکے کے ذیل میں نہیں آتے مگر چند شخصی مضامین ایسے ضرور ہیں جنہیں ہم خاکہ کہہ سکتے ہیں بلکہ ان کا شمار اردو کے چند اہم خاکوں میں کر سکتے ہیں۔ ان کے کامیاب خاکوں میں ''گدڑی کا لال'' نور خان، ''نام دیو مالی''، مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، محسن الملک، مولانا محمد علی مرحوم، سر سید راس مسعود، ڈاکٹر محمد اقبال، عبدالرحمٰن صدیقی اور ڈاکٹر بجنوری وغیرہ ان مؤخر الذکر دو خاکوں کے علاوہ دیگر شخصی مضامین جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان میں ۸۰ فیصد سے زائد خاکہ نگاری کی خصوصیات موجود ہیں اس لیے ہم ان کو خاکہ نگاری کی ذیل میں رکھیں گے۔

ڈاکٹر بشیر سیفی نے اپنی کتاب ''خاکہ نگاری فن و تنقید'' میں تمام قابل ذکر اور اہم خاکہ نگاری کی کتابوں کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

> ''خاکہ نگاری کے مجموعوں کے اس تنقیدی جائزے سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ اردو میں اس صنف کے واضح تصور کے تحت بہت کم خاکے لکھے گئے ہیں۔''

اور بالعموم شخصیات پر لکھے گئے ہر قسم کے مضامین کو خاکہ سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے' اس سلسلے میں انہوں نے مشفق خواجہ کا خیال بھی پیش کیا۔ بقول مشفق خواجہ اس غلط فہمی کا سبب یہ مروجہ خیال ہے کہ اگر کسی فرد کے بارے میں کتاب لکھی جائے تو وہ سوانح عمری کہلاتی ہے اور مضمون لکھا جائے تو وہ شخصی خاکہ ہوگا ہے۔ مشفق خواجہ خاکہ نگاری سے متعلق کہتے ہیں ''شخصی خاکہ صرف شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے'' اس رو سے جب ہم بابائے اردو کے خاکوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کے بیشتر مضامین شخصی خاکوں کی عمدہ مثالیں ہیں ان کی واحد شخصی مضامین کی کتاب ''چند ہم عصر'' میں چند شخصی مضامین ایسے ہیں کہ جو نہ صرف طویل ہیں بلکہ ان میں مذکورہ شخصیت کے حوالے سے بہت سی ایسی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو خاکے کی

تعریف میں نہیں آتیں مثلاً سرسید احمد خان پر ان کا شخصی مضمون جو اس عنوان سے اس میں شامل ہے۔۲۳۲ صفحات سے لے کر ۳۵۳ صفحات پر مشتمل ہے یہ اس کتاب کا سب سے طویل مضمون ہے۔ اسے ہم خاکہ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ طوالت ہے بلکہ یہ خاکہ نگاری کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اس مضمون میں انہوں نے سرسید کے علمی اور زبان و ادب کی خدمات (بالخصوص اردو زبان) کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ہندو مسلم اتحاد' کانگریس اور مسلم لیگ کا ذکر بھی تفصیل سے ملتا ہے غرضیکہ سرسید اردو کانگریس اور مسلم لیگ ہندو اور مسلمانوں کے حوالے سے بے شمار تفاصیل اس میں شامل ہیں' تہذیب الاخلاق کے لمبے لمبے اقتباسات دیئے گئے ہیں ان کے علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی تالیف و تصنیف کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ دراصل یہ سرسید کی مجملہ خدمات کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اسے ہم سرسید سے متعلق ایک بھرپور مضمون تو کہہ سکتے ہیں مگر اسے خاکہ نہیں کہہ سکتے۔ اس طرح نواب عماد الملک پر ان کے تحریر کردہ شخصی مضمون کو خاکہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں خاکہ نگاری کی بنیادی خصوصیات نہیں ملتیں اور یہ بھی دوسرا طویل مضمون ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ اسے ہم ایک اچھا شخصی مضمون تو کہہ سکتے ہیں مگر خاکہ نہیں کہہ سکتے۔ اردو میں فرحت اللہ بیگ کے شخصی مضمون ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کا بڑا شہرہ ہے اور بلاشبہ یہ ایک عمدہ شخصی مضمون ہے جسے لوگ خاکہ کہتے ہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مضمون کے اندر خاکہ تو ہے مگر یہ بہ ذات خود خاکہ نہیں ہے کیوں کہ اس میں خاکہ نگاری کے برخلاف ایسی تفاصیل ہیں جو خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتیں۔

حلیہ نگاری اور مرقع نگاری اور مختلف واقعات کا ذکر خاکہ نگاری کے جملہ خصوصیات میں آتے ہیں مگر یہ خصوصیات شخصی مضامین' سوانحی مضامین' سیرت نگاری میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اسے ہم یوں سمجھ لیں کہ شاعری کی بہت سی خصوصیات نظم میں پائی جاتی ہیں اور غزل میں بھی مگر بعض ایسی بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی بنا پر ہم ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ یعنی وہ واضح فرق جس کی بنا پر ہم مختلف اصناف سخن کو علاحدہ کرتے ہیں انہیں بنیادی فرق کے باعث ہم

بابائے اردو کے ہر شخصی مضمون کو خاکہ کہنے سے قاصر ہیں۔

خاکہ نگار کو کس قسم کے واقعات کو اپنے خاکوں میں پیش کرنا چاہیئے اس سلسلے میں بھی کوئی واضح اصول متعین نہیں ہے اس سلسلے میں حفیظ صدیقی نے (نقش طفیل نمبر) لکھا ہے کہ ''موضوع خاکہ کی شخصیت کی روشنی میں لانے کے لئے تین قسم کی باتوں کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔

(۱) وہ باتیں جنہیں اخلاقی محاسن سمجھا جاتا ہے جیسے حیا' خلوص' معصومیت' رواداری' ایثار' تحمل' خوش معاملگی اور تبحر علمی وغیرہ۔

(۲) وہ باتیں جنہیں اخلاقی معائب سمجھا جاتا ہے جیسے مغلوب الغضبی' خود غرضی' الحاد' بدزبانی اور جنسی بے راہروی وغیرہ۔

(۳) وہ باتیں جنہیں نہ اخلاقی خوبیاں سمجھی جاسکتی ہیں' نہ خامیاں جیسے ایک خاص قسم کا لباس پہننا' کرسی پر اکڑوں بیٹھنا' ایک خاص انداز میں چلنا' بلند آہنگ قہقہے لگانا' بلیاں یا کبوتر پالنا' پتنگ اڑانا' ہجوم میں بدحواس ہوجانا' چٹپٹی چیزیں کھانا' حقے یا پان سے رغبت' یادوں سے بہلانا' خیالی پلاؤ پکانا وغیرہ۔

یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن میں سے بیشتر باتوں کا ذکر ایک خاکہ نگار اپنے خاکوں میں کرتا ہے مگر ان کو قاعدہ یا کلیہ نہیں بنایا جاسکتا کیوں کہ ان باتوں کا ذکر کوئی شخص اپنے شخصی یا سوانحی مضامین میں بھی کرسکتا ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کہ خاکہ نگاری میں بھی ان خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے ہاں لکھنے کا انداز علاحدہ ہوتا ہے۔

اردو میں شخصی مضامین زیادہ تر مرحومین پر لکھے گئے ہیں یعنی ان کے مرنے پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے رقم کیئے گئے ہیں مگر اس سلسلے میں بابائے اردو بہت سے دوسرے شخصی مضامین لکھنے والوں سے منفرد نظر آتے ہیں' انہوں نے اپنے شخصی مضامین اور خاکوں میں زندہ شخص کے منفی پہلوؤں اور معائب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اپنے خاکوں میں اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی غلطیوں' کوتاہیوں' اور ان کے معائب کا ذکر بھی کیا ہے جبکہ مرحومین کی یاد میں لکھے گئے شخصی

مضامین یا خاکوں میں لوگ ان کے معائب سے چشم پوشی کرتے ہیں اوران کا ذکر مناسب نہیں سمجھتے۔اسی سلسلے میں ڈاکٹر ابن فرید لکھتے ہیں کہ:۔

''انسان کے بارے میں بابائے اردو کا ایک واضح تصور ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان آدمی ہونے کی بنا پر اپنے اندر کچھ کمزوریاں رکھتا ہے (بے عیب ذات خدا کی' کون ہے جس میں عیب نہیں؟)

وہ اپنے ممدوح کو ایک فرشتہ بنا کر پیش کرنا نہیں چاہتے...... اس سلسلے میں وہ حالی کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ'' بابائے اردو نے حالی کی منکرانہ اور ہمدردانہ شخصیت میں بھی ان کی بشری کمزوریوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

بابائے اردو کی خاکہ نگاری کی اس خصوصیت کا ذکر امجد کندیانی (اردو میں خاکہ نگار' نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء) میں کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ'' محمد علی جوہر کی تعریف کرتے کرتے ایک دم ان کے خلاف لکھنا شروع کر دیتے ہیں اس سے لہجے کا توازن تو کچھ مجروح ہوتا ہے مگر رائے کا توازن اجلا ہو جاتا ہے۔محمود' مسعود' سید علی بلگرامی وغیرہ کے حال میں یہ توازن پورا ہے جیسا کہ ان کی اکثر تحریروں میں ہونا چاہیے۔امجد کندیانی ''چند ہم عصر'' کے مضامین کو خاکہ تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اپنے مواد اور تکنیک کے اعتبار سے اس کتاب کو خاکہ نگاری کے ضمن میں لانا بہت مشکل ہے مگر مجھے امجد کندیانی کے اس قول سے اتفاق نہیں ہے۔میں چند ہم عصر کے بیشتر مضامین کو خاکہ ہی سمجھتا ہوں کیوں کہ ان میں تکنیک اور مواد خاکہ نگاری ہی کا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق اپنے موقلم سے شخصیتوں کی ایسی کامیاب' پر اثر اور دل نشیں تصویر بناتے ہیں کہ ان میں جان ڈال دیتے ہیں اوران کی یہ تصویریں ہمیں چلتی پھرتی یعنی متحرک نظر آتی ہیں ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ اور اکثر خاکوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے پین پورٹریٹ نہیں بلکہ پنسل اسکیچ کا کمال کر دکھایا ہے۔اکثر اپنے خاکوں اور شخصی مضامین کو ایسے جملوں سے شروع کرتے ہیں کہ جن سے اس شخصیت کا چہرہ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے جس کے بارے میں وہ لکھنے جا رہے ہیں۔اس

کے علاوہ اپنے خاکے میں جگہ جگہ ایسے پُر معنی اور وقیع جملے استعمال کرتے ہیں جس کی تفصیل اگر کوئی لکھنی چاہے تو اسے اس مقصد کے لئے کئی اوراق درکار ہوں گے۔ یہ بابائے اردو کے خاکوں کی ایک اہم اور بنیادی خصوصیت ہے میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں جس سے اس حقیقت کی وضاحت ہو جائے گی۔

''نواب عظیم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ وثروت لیاقت وفضیلت حاصل کی اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔''

(مولوی چراغ علی مرحوم)

''آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں لیکن ایسے شخص کی موت سے دس بیس سال نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کی بہبودی وابستہ ہو' جس قوم کی رہبری اور سرداری کے لیے ملک کی نظر انتخاب ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی ہوئی نظر نہ آتی ہوں ہزار حسرت وافسوس کے قابل ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔''

(مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم)

''وہ اپنے فن اور رنگ میں ایک تھا۔ اگر چہ طبیعت کا کمزور اور لا ابالی تھا مگر دوستی کا سچا اور دشمن کا پکا۔ یہ سچ ہے وہ دنیا کے کام کا نہ تھا مگر خیال میں اس نے ایک عالم بنا رکھا تھا کہ عالم مثال بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔ اس میں ہر بات انتہائی تھی۔ محبت تھی تو انتہا درجے کی۔ عداوت تھی تو انتہا درجے کی۔''

(حکیم امتیاز الدین)

''مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے۔ یہاں تک کے بعض اوقات ظرافت

میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت' سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں۔''

(مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی)

''لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں' میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید یہ کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں اور امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی بھی ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے۔''

(گدڑی کا لال۔ نور خان)

''قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں کاش ہم میں بہت سے نور خان ہوتے۔''

(نور خاں)

''ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے۔''

(نور خاں)

''سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں بعض اوقات اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔''

(نور خاں)

''دوسرے روز مقبرے میں آئے۔ باغ کا رجسٹر منگایا اور نور خاں کے نام پر اس

زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔''

(نور خاں)

''نواب محسن الملک اس شاہراہ پر گامزن رہے جس کی داغ بیل سر سید ڈال گئے تھے۔ سید کے بعد محسن الملک نے ان کے کام کو جس طرح سنبھالا اور بڑھایا یہ انھیں کا کام تھا۔ ان کے بعد کوئی ان کی یادگار بنائے یا نہ بنائے محسن الملک کا کام ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔''

(محسن الملک)

''ہندوستان جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے مولانا محمد علی مرحوم ''عجیب وغریب شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر سے تشبیہ دی جائے تو تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا ان دونوں میں عظمت اور شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی ہے۔''

(مولانا محمد علی مرحوم)

''گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے ہاں شاعر کے لیے جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز و بے پروا دنیا کے معاملات سے بے خبر 'لاابالی' اگر چہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔ پہروں عالم خیال میں غرق آپ ہی آپ گنگناتا رہتا تھا۔ اس وقت جو دیکھتا سچ مچ دیوانہ سمجھتا گھر کا حال گھر والی جانے اور باہر کا حال باہر والے جانیں۔ وہ اپنے شعر میں مگن رہتا تھا۔''

(شیخ غلام قادر گرامی)

''قوموں کا امتیاز مصنوعی رفتہ رفتہ نسلی ہوگیا ہے۔ سچائی' نیکی حسن کسی کی میراث نہیں یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔''

(نام دیومالی)

''وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا' ان کو پیار کرتا' جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔''

(نام دیو مالی)

''تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔''

(نام دیو مالی)

ضرورت تو اس بات کی تھی کہ چند اور مثالیں پیش کی جاتیں مگر طوالت کے خوف سے انہیں چند چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی عبدالحق چند جملوں میں وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جسے بیان کرنے کے لئے دوسروں کو کئی صفحات درکار ہوں گے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ان چند جملوں میں یا چند الفاظ میں اپنی پسندیدہ شخصیات کی خصوصیات اور ان کے اوصاف کی ایسی واضح اور مکمل تصویر پیش کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے اس شخص کا واضح تصور اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا ہے اور وہ اپنے چشم باطن سے ایسی شخصیتوں کو چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ بابائے اردو کی خاکہ نگاری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔''

''چند ہم عصر'' میں کل ۲۴ شخصی مضامین پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک شخصی مضمون پروفیسر مرزا حیرت 'مولوی صاحب کا لکھا ہوا نہیں ہے اس طرح ۲۳ شخصی مضامین مولوی عبدالحق کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں جن میں سے کچھ طویل ہیں اور کچھ مختصر کچھ کو ہم بلا تامل خاکہ کہہ سکتے ہیں اور کچھ کو خاکہ کہنے میں مجھے تامل ہے جس کا اظہار مضمون میں پہلے کر چکا ہوں۔ بہر حال ان کے چند خاکوں اور کامیاب خاکوں کی وجہ سے انھیں اردو کا ایک اہم اور منفرد اور ممتاز خاکہ نگار تسلیم کرتا ہوں۔ آخر میں ابن فرید صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ان کے مضمون کے ایک اقتباس پر اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں:۔

''بابائے اردو نے ''چند ہم عصر'' لکھ کر صرف اپنے معاصرین ہی کی شخصیت کا جائزہ لیا نہیں ہے بلکہ اپنی شخصیت کے اکثر گوشے بھی پیش کر دیئے ہیں انھوں نے جو کچھ بھی دوسروں کی ذات میں دیکھا ہے جو کچھ پسند کیا ہے یا ناپسند کیا ہے وہ ایک طرح سے اس انسان کی آرزو تمنا یا احتراز ہے جو صرف دوسروں کی گلی کے موڑ پر کھڑے ہو کر دیکھتا نہیں رہتا بلکہ انسانی سرشت کا فریضہ بھی انجام دیتا رہتا ہے۔''

سراج الدین ظفؔر

یادش بخیر سراج الدین ظفر سے میری ملاقات چاٹگام کے ایک کل پاکستان مشاعرے میں ۱۹۶۸ء میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں انہیں کے علاقے کے رہنے والے میرے دوست جمیل یوسف بھی چاٹگام میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے جو خود بھی ایک اچھے شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ میں جمیل یوسف کے ساتھ سراج الدین ظفر سے ملنے ہوٹل شاہ جہاں گیا جہاں آ کر وہ ٹھہرے تھے۔ وہ بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مخلص اور اچھے انسان بھی ہیں۔ کافی دیر تک ان سے شعر و ادب کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ ان کے اشعار سن کر ان کا کلام پڑھنے کا مزید اشتیاق پیدا ہوا۔ جمیل یوسف سے ان کا مجموعہ کلام لے کر پڑھا۔ اس کے مطالعے سے یہ بات مجھ پر واضح ہوگئی کہ شعر گوئی میں سراج الدین ظفؔر اپنا مخصوص لب ولہجہ رکھتے ہیں جو ان کو ہم عصر شعراء سے ممیز اور منفرد کرتا ہے۔ شعر گوئی کا یہ انداز اور مخصوص لب ولہجہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا کرتا ہے بقول شاعر:۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میرے نزدیک کسی بڑے شاعر یا ادیب کی ایک پہچان اس کا اپنا نیا اور منفرد لب ولہجہ بھی ہوا کرتا ہے۔ یہی اس کی انفرادیت اور یہی اس کی شاعری کی شناخت بھی ہے۔ ایسا شاعر فرسودہ راہ پر چلنے کے بجائے اپنا جادہ خود متعین کرتا ہے۔ اپنے فن کے اظہار کے لئے نئے نئے اسالیب تراشتا ہے۔ غالؔب کے کلام کی یوں تو بہت سی خصوصیات بتائی جاتی ہیں مگر بقول مولانا حالؔی ''یہ دو خصوصیات جدتِ ادا اور جدتِ فکر ہیں''۔ انہیں دو خوبیوں کی وجہ سے مرزا غالؔب دوسرے

شاعروں پر غالب ہیں' اسی طرح سراج الدین ظفرؔ نے بھی اپنے شعری پیمانے الگ بنائے۔ اپنے اسلوب میں جدت طرازی سے کام لیا ہے۔

ڈھونڈو کوئی نئی روشِ شاعری ظفرؔ
اسلوب دوسروں کا گوارا نہیں مجھے

سراج الدین ظفرؔ خود اپنے فن کے متعلق کہتے ہیں کہ'' جس طرح میرے خیالات بیشتر لوگوں سے جدا ہیں' میرا اسلوب شاعری بھی جدا ہے۔ میں نے غزل کے روایتی قالب کے حدود میں رہ کر غزل کی دوسری سب سے بڑی روایت کے تانے بانے کو توڑ کر رکھ دیا ہے'' یہ حقیقت ہے کہ ظفر نے ایسا ہی کیا ہے۔ ظفرؔ پرانے موضوعات کو بھی نئے انداز سے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً شراب و سبو' رند و زہد' کا وہ اکثر اپنی غزلوں میں تذکرہ کرتے ہیں مگر ان فرسودہ اور روایتی موضوعات کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ان میں ایک تازگی اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی روایت کا سلسلہ روایت سے جوڑتے ہیں اور کبھی موجودہ ماحول اور عصری تقاضوں سے۔ اس لئے ان کی شاعری میں ایک تازگی اور بالیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے:۔

نہ جانے شب کو ہمارے سبو میں کیا شئے تھی
سحر کو روح سبک سیر ہے ہوا کی طرح

☆

سلسلہ سرمد و منصور کا منسوخ نہیں
اور فہرست میں کچھ نام ابھی باقی ہیں

☆

اے قبائے تنگ خوباں کھول دے اسرار حق
ہم سے کیا پردہ کہ ہم آگاہ ریشہ ریشہ ہیں

☆

دن کو بحر و بر کا سینہ چیر کر رکھ دیجئے
رات کو پھر پائے گل رویاں پہ سر رکھ دیجئے

☆

یوں سر راہ بھرے بیٹھے ہیں میکش کہ بہار
اب کے آئے تو سلامت یہ چمن تک پہنچے

☆

فرش گل بچھوائیں رنگ و بو کی ارزانی کریں
آؤ بلقیسان دوراں سے سلیمانی کریں
زاہد و بہٹ جاؤ رستے سے کہ ہم بادہ گسار
کوئی سامان نجات نوع انسانی کریں

☆

میخانے کو چلا ہے تو منصور وار چل
یہ راستہ بھی تا رسن و دار جائے گا

☆

ہوگی مرے سبو سے نمود ہزار صبح
ابھریں گے اس افق سے ابھی آفتاب اور

☆

اب کیا کہوں طلسم سلیماں تھی یا شراب
میں ایک سبو میں شہر سبا تک پہنچ گیا

اس کے بعد ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے۔ ان اشعار میں کس قدر جوش و ولولہ سرمستی

اور سرخوشی ہے۔ ان میں ندرت بھی ہے اور رعنائی خیال بھی۔ ایک عجب بانکپن ہے جوان اشعار میں جلوہ گر ہے۔ عزم وجذبات کا حسین پیکر بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر ظفر کا منفرد لہجہ اپنی پوری آن بان کے ساتھ ان اشعار میں موجود ہے۔

ساغر اٹھا کے زہد کو رد ہم نے کردیا | پھر زندگی کے جزر کو مد ہم نے کردیا
وقت اپنا زر خرید تھا ہنگام مے کشی | لمحے کو طول دے کے ابد ہم نے کردیا
بادہ تھا یا عروس فراست تھی جام میں | جو کہہ دیا بہک کے سند ہم نے کردیا
پہنچے کسی کے عشق میں ماہ ونجوم تک | حد سما کو شوق کی حد ہم نے کردیا

☆

لاصراحی کہ کروں وہم وگمان غرق شراب
اس سے پہلے کہ میں خود وہم گماں ہو جاؤں

☆

یارب سراب اہلِ ہوس سے نجات دے
مجھ کو شراب دے انہیں آب حیات دے

معاملات حسن وعشق اور واردات قلب اور ان جیسے دیگر موضوعات کو بھی ظفر نہایت موثر، دلنشیں اور دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی انفرادیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

ہم آہوان شب کا بھرم کھولتے رہے
میزان دلبری میں انہیں تولتے رہے

☆

پھر ہے کسی کی زلف کو کھلنے کی آرزو
اجمال بے قرار ہے تفصیل کے لئے

☆

آدم سی چاہتا ہوں کوئی لغزش عظیم
اپنے گناہ شوق کی تکمیل کے لئے

☆

کھل گئے کل رات وہ ہم سے تو ان کے روبرو
ایک فہرست ہزاراں آرزو کھولی گئی

☆

مرے ان کے درمیان کل رات بھر
اک غزل آمیز خاموشی رہی

☆

کارِ دنیا ہو تو طوفاں ہے مرادستِ دراز
ان کا گیسو ہو تو اندازِ صبا رکھتا ہوں میں

☆

پھر ہوائے زلف شب گوں باندھیے
سحر بنگالہ کے مضموں باندھیے
پھر کسی لیلیٰ صفت سے عہد شوق
زیر شاخ بید مجنوں باندھیے

☆

پھول بھجوائے گئے خطِ سبو کھولی گئی
اس طرح پھر ان سے راہ گفتگو کھولی گئی

سراج الدین ظفر کے بعض اشعار تو اتنے مشہور ہوئے کہ وہ زبان زد ہر خاص و عام ہو گئے اور میرا اپنا خیال ہے کہ بعض شاعر تو ایک ہی دو اشعار کی وجہ سے زندگیٔ جاوید حاصل کر لیتے ہیں۔ ظفر کے یہ اشعار بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔

راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قد و گیسو سے چلے دار و رسن تک پہنچے
☆
ہمارے دوش پہ کھلتی تو تیری زلف سے ہم
نسیم صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے

ظفؔر نے نہ صرف غزلیں کہی ہیں بلکہ مثنوی، رباعیات، قطعات اور نعتیں بھی لکھی ہیں۔ نظموں میں ان کی قومی نظمیں ان کے ملی اور قومی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں ایک محب وطن پاکستانی کا دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی قومی نظموں میں 'وطن'۔ 'سیالکوٹ'۔ 'مجاہد' اور 'اے وطن کے جیالو' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ظفر نے جو ایک مثنوی 'لاجونتی' کے نام سے لکھی ہے وہ قابل ذکر ہے۔ اس میں ظفؔر نے لاجونتی کی بے مثال اور بے لوث محبت اور اس کی قربانی کا ذکر نہایت دلنشیں اور موثر انداز میں کیا ہے۔

سراج الدین ظفؔر کو رسول اکرمؐ سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ چنانچہ سرکار دو عالمؐ کے حضور جو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں اس میں ان کی عقیدت کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کا نیا انداز اور اسلوب بھی نمایاں ہے۔ چند نعتیہ اشعار کے حوالے سے قول بالا کی وضاحت ہو جائے گی۔

سبوئے جاں میں چھلکتا ہے کیمیا کی طرح
کوئی شراب نہیں عشق مصطفے کی طرح
وہ جس کا جذب تھا بیداری جہاں کا سبب
وہ جس کا عزم تھا دستور ارتقا کی طرح
☆
جلا جو دل میں چراغِ جمالِ مصطفوی
سیاہ رو شجر طور کا جواب ہوئے
اس کے درسِ جلالی کا معجزہ ہے کہ ہم
حریفِ سیف ہوئے، صاحبِ کتاب ہوئے

☆

رشتہ ہماری ذات کا یزداں سے استوار
جس نے کیا وہ پرتوِ یزداں تمہیں تو ہو
ہر مسئلے میں رشد و ہدایت تمہیں سے ہے
ہر فیصلے میں عدل کی میزاں تمہیں تو ہو

☆

نام احمدؐ مختار کا پھر زینتِ لب ہے
جھک اے فلکِ پیر کہ ہنگامِ ادب ہے

مندرجہ بالا اشعار کے حوالے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ظفر ایک صاحب اسلوب اور منفرد لب لہجے کے شاعر تھے۔ وہ ذوق جمال رکھتے تھے اور اس کا فیاضی کے ساتھ مظاہرہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔ ان کے اشعار میں ان کے مشاہدات اور تجربات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ احسان دانش ان کی شاعری سے متعلق کہتے ہیں کہ ''بہت کم شاعر ہیں جو مضامین کے تنوع کے ساتھ ایسی یکسانیت کے ساتھ شعر کہتے ہیں''

ممتاز نقاد اور ادیب پروفیسر وقار عظیم کا خیال ان کی شاعری سے متعلق یہ ہے کہ ''غزل کی روایت میں جس جوش، سرمستی، وارفتگی اور سرخوشی کی طرح حافظؔ نے ڈالی اور جسے غالبؔ، آتشؔ، اصغرؔ اور یگانہؔ نے اپنے طرز خاص میں زندہ رکھا تھا اس کی تکمیل سراج الدین ظفرؔ کے ہاتھوں ہوئی ہے''

مالک رام کا کہنا ہے کہ ''غزل کی ایمائیت ایک مسلمہ چیز ہے انہوں نے اسے وسیع کر کے انفس و آفاق کے مسائل کے لئے استعمال کیا ہے اور اس میں بہت کامیاب رہے ہیں'' نامور نقاد و ادیب پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتحپوری سراج الدین ظفر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''سراج الدین ظفر غزل کے ازلی ادا شناسوں میں تھے، انہوں نے اس کی جملہ رعنائیوں اور کج

ادائیوں کے ساتھ اسے آغوش میں لے لیا ہے اور اس انداز خاص سے کہ اس کی چھب ہی کچھ اور ہو گئی ہے"

سراج الدین ظفر اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے اور ان کا انگریزی کلام "نیو ورلڈ رائمنگ' (New world Writing) 'نیویارک میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ظفر کے دو شعری مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ پہلا مجموعہ 'زمزمہ حیات' اور دوسرا 'غزال وغزل" ہے۔ ظفر کو جب ان کے دوسرے شعری مجموعے غزال وغزل' پر آدم جی ادبی انعام ملا تو انہوں نے اس کی رقم جامعہ کراچی کو دے دی جس سے اردو آنرز میں اول آنے والوں کو طلائی تمغہ دیا جاتا رہا۔

ظفر نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ وہ ایک معلم' تاریخ داں' ماہر روحانیات اور ماہر علم نجوم بھی تھے۔ زائچہ بنانے میں بھی خاص شغف تھا۔

پھر زائچے نئے سر میخانہ کھینچئے
تحریر بخت پر خط پیمانہ کھینچئے

سراج الدین ظفر نے سقوط ڈھاکہ سے ایک روز قبل پیش گوئی کی تھی اور کہا تھا کہ اگلے چوبیس گھنٹے بڑے آزمائشی ہیں اگر اس آزمائش میں پاکستان پورا اترا تو ٹھیک ہے ورنہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جائے گا۔ اپنی موت سے متعلق بھی پیش گوئی کی تھی اور کہا تھا کہ اکسٹھ سال کی عمر بڑی خطرناک ہے اگر اس سے گزر گئے تو بہتر سال جئیں گے مگر افسوس کہ وہ ۶۱ سال کی عمر سے آگے نہ بڑھ سکے اور اردو شاعری کا یہ تابندہ ستارہ اور اختر شناس ۶ مئی ۱۹۷۱ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا مگر ظفر شاعری کا جو چراغ جلا گئے ہیں وہ آج بھی روشن ہے:-

شہرت مری غزل کی زمانے میں ہے ظفر
یہ مشکِ خاص دستِ صبا تک پہنچ گیا

سراج الدین ظفر یہی نہیں کہ غزل کے ایک اچھے شاعر تھے بلکہ کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ انہوں نے نثر میں بھی اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ "آئینے" کے نام سے ان کے

مزاحیہ اور طنزیہ افسانوں (افسانوی مضامین) کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کا مقدمہ اردو کے ممتاز مزاح نگار شوکت تھانوی نے لکھا ہے وہ اس سلسلے میں کہتے ہیں "سراج الدین ظفر نے اپنی شاعری سے اکتا کر یا محض منہ کا مزہ بدلنے کے لئے نثر لکھنا شروع کی مگر ان کی دشوار پسندی نے نثر نگاری میں بھی ایک نہایت خطرناک وادی میں قدم رکھا ہے۔ خدا خیر کرے۔ مزاح نگاری کو مذاق سمجھ لینا بجائے خود ایک عبرت انگیز لطیفہ ہے"

"آئینے" میں آٹھ مزاحیہ اور طنزیہ افسانے ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں 'تنازعہ' مولانا' شکاری کتا' شاعر' قاضی' ہندوستان زندہ باد' اپنا اپنا ظرف' راکھشش'۔ اس کتاب کا انتساب بھی دلچسپ انداز میں کیا ہے "اس خرابیٔ دماغ کے نام جس کا نتیجہ یہ افسانے ہیں" اس کا ہر افسانہ اگر چہ افسانے کی تعریف پر پورا نہیں اُترتا مگر موضوع کے لحاظ سے ان کو ہم دلچسپ' طنزیہ اور مزاحیہ کہانی ضرور کہہ سکتے ہیں اس طرح طنزیہ اور مزاحیہ افسانے آج کل انور گل کامیابی کے ساتھ لکھ رہے ہیں مگر اس سلسلے میں اولیت سراج الدین ظفر کو حاصل ہے 'شکاری کتا' کے نام سے دراصل انہوں نے ایک تمثیل لکھی ہے اور اس میں باقاعدہ کرداروں کے نام ابتدا میں درج کئے ہیں جس طرح یک بابی ڈرامے یا ڈراموں میں کرداروں کے نام رقم کئے جاتے ہیں۔ بعض افسانوں میں مکالمے کا انداز اپنایا گیا ہے۔ ان کا مذکورہ بالا افسانوی مجموعہ حال ہی میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ سراج الدین ظفر کے اس تخلیقی پہلو کا ذکر بھی اختصار سے کردوں۔

عطا کاکوی بحیثیت محقق

تحقیق تنقید سے مشکل فن ہے۔ محقق کا کام آ ثار قدیمہ کے ماہرین سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ جس طرح آ ثار قدیمہ کا ماہر مدفون چیزوں کی کھدائی اور اس کی بازیافت کے بعد ہمہ تن اس کے مطالعے میں مصروف ہو جاتا ہے اور ہر ہر زاویئے سے اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے لئے تاریخ، عمرانیات، علم الاصنام اور اس سے متعلق دیگر علوم سے بھی واقفیت رکھنی پڑتی ہے۔ وہ سائنس کے اصولوں اور عقل و استدلال کے ذریعہ اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے بسا اوقات اسے لسانیات کا ماہر بھی بننا پڑتا ہے یا ماہرین لسانیات سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ تقریباً یہی حال محقق کا ہے اگر اسے کوئی نایاب نسخہ مل گیا تو اس کی کامیابی وہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ تو کامیابی کا صرف آغاز ہے' اس کے بعد وہ اس نسخہ سے متعلق دیگر معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر اسے کسی نایاب کتاب کا نسخہ ملا ہے تو وہ اس سے متعلق ہر طرح کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا یعنی یہ کتاب کب لکھی گئی؟ اس کتاب کا موضوع کیا ہے؟ اس کا مصنف کون ہے؟ مصنف کی ادبی حیثیت کیا تھی؟ مصنف کس عہد سے تعلق رکھتا ہے؟ اس نے کہاں تک اور کہاں سے کسب علم کیا؟ اس کے معاصرین کون کون لوگ تھے؟ یہ کتاب ترجمہ ہے یا مصنف کی اپنی اپج ہے؟ یہ کتاب اس نے خود لکھی تھی یا کسی کے ایما پر لکھی گئی تھی؟ اس کتاب کی اہمیت کیا ہے؟ اس کی زبان کیسی ہے۔' اگر یہ کتاب کسی فن سے متعلق ہے تو اس فن پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔ الغرض اس قسم کے بہت سے سوالات اس کے پیش نظر

رہتے ہیں اور جب تک اسے ان سوالات کے خاطر خواہ جواب نہیں مل جاتے تب تک اس کا ذہن مطمئن نہیں ہوتا۔ جب وہ ان مسائل کو حل کر لیتا ہے تو وہ کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر، غزل، نظم وغیرہ میں سے کسی پر اختلاف رائے ہو جاتا ہے کہ اس کا کہنے والا دراصل کون ہے؟ ایسے حالات میں بھی اس محقق کو بڑی موشگافیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں کہ کسی چیز کی بازیافت ہی محقق کی اصل کامیابی نہیں بلکہ وہ کامیاب تو اس وقت ہوتا ہے جب اس سے متعلق پیدا ہونے والے سوالوں کا تسلی بخش جواب مہیا کر دے۔ بقول پروفیسر کلیم الدین احمد ''محقق کی راہ میں ایک خطرناک مقام آتا ہے۔ اگر وہ ہوشیاری سے کام نہیں لیتا تو اس مقام پر پھنس جاتا ہے''۔ بات یہ ہے کہ محقق کافی محنت، جستجو، دماغ سوزی، صرفہ، وقت کے بعد کسی چیز کی تحقیق کرتا ہے یا کسی گمشدہ تصنیف کا سراغ لگاتا ہے اپنی کامیابی سے خوش ہوتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے کہ وقتی طور پر صحیح معیار کی تنقید کو بھول جاتا ہے جس قدر اس نے محنت کی ہے اسی قدر یہ چیز اسے عزیز اور قیمتی معلوم ہوتی ہے۔

یہ خطرناک مقام ہر ماہر محقق کی راہ میں آتا ہے مگر جو ثابت قدم رہ کر اپنے کام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں وہی کامیاب اور کامران ہوتے ہیں۔ بعض لوگ تو کسی تصنیف کا سراغ لگانے کے بعد اتنے خوش ہوتے ہیں کہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے اور پھر اس کتاب کی حد سے زیادہ تعریف کر دیتے ہیں اس کی خوبیوں کو مبالغے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایسی ایک غلطی عبدالحق سے بھی سرزد ہو گئی یعنی جب انہوں نے مثنوی 'خواب و خیال' کا پتہ لگایا تو اس کی تعریف اس کی قدر و قیمت سے بہت زیادہ کر گئے۔

میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ تحقیق بہت ہی مشکل فن ہے۔ اور تنقید سے زیادہ مشکل۔ لیکن اس سے میرا مقصود یہ نہیں کہ تنقید کوئی آسان چیز ہے بلکہ آج کل کی تنقیدی روش کو دیکھ کر مجھے یہ کہنا پڑا۔ آج کل تنقید نگاروں کی صف میں بیشتر نقاد ایسے ہیں جو صرف رائے زنی کو تنقید

سمجھتے ہیں اور یہ کام بقول کلیم الدین احمد ''ہر غیر ذمہ دار شخص آسانی سے کرسکتا ہے'' اور آج کل ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ آج کل تو بیشتر لوگ اپنے تاثرات پیش کردینے کو تنقید سمجھتے ہیں یا صرف چند نظریوں کے تحت جمالیاتی تاثراتی ادب پاروں کو پرکھتے ہیں ان نظریوں کے تحت اگر کوئی چیز پوری اُتری تو اچھی ہوئی ورنہ بری۔ اس دور میں کچھ لوگ تاثرات اور تعصبات کو بھی تنقید کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کر دیا بس اس کو تنقید کا سرمایہ سمجھنے لگے۔ ان کے خیال میں جو چیز آئی وہی تنقید ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس فن کو نہ صرف رائے زنی سمجھتے ہیں جو بہت آسان چیز ہے۔ اس طرح وہ سہل پسندی سے کام لے کر سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے یہ کام کرتے رہتے ہیں۔

میں ایک بات کی اور وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ تنقید اور تحقیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیوں کہ محقق کو جب تک تنقیدی بصیرت حاصل نہ ہوگی وہ اچھے برے کی تمیز نہیں کر سکے گا۔ اور اس کی ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اور بقول پروفیسر کلیم الدین احمد ''اس کی حالت اس گم کردہ راہی کی ہوگی جو کسی صحرا میں بھٹکتا پھرے اور جس کو اس کی خبر نہ ہو کہ وہ بھٹک رہا ہے''

عطا کاکوی محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے نقاد بھی ہیں۔ ان کے اندر تنقید کا مادہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے اور وہ اپنی اس صلاحیت سے تحقیقی کاموں میں مدد لیتے ہیں۔ غور و فکر، محنت، جاں سوزی عطا کاکوی کی وہ خصوصیات ہیں جو تحقیقی کاموں میں ان کی مدد اور ہمت افزائی کرتے ہیں، چونکہ تحقیق کا کام بڑا صبر آزما اور دشوار ہے اس راہ میں بہت سے دشوار اور مشکل مرحلے آتے ہیں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ محقق کو کچھ دور جانے کے بعد راہیں مسدود نظر آتی ہیں اگر وہاں پر وہ عزم و استقلال سے کام نہ لے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ محقق ان دشواریوں پر محنت، صبر، صرفہ وقت دماغ سوزی اور عدم عجلت سے قابو پالیتا ہے۔ عطا کاکوی تحقیقی کاموں میں اپنی ان صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کرتے ہیں۔

تحقیق کے دوران کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس موضوع پر تحقیق جاری ہے اس موضوع پر

کوئی نسخہ یا تصنیف مل جاتی ہے مگر وہ مکمل نہیں ہے اس کے کچھ اوراق غائب ہیں۔ اب محقق کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے دوسرے نسخے کی تلاش ہوتی ہے۔ شہر کے دوسرے کتب خانوں کے علاوہ ملک کے دوسرے کتب خانوں کا چکر لگانا پڑتا ہے یا ان سے رابطہ قائم کرنا ہوتا ہے کبھی کبھی دوسرے ممالک کے کتب خانوں سے بھی پوچھ گچھ کرنا پڑتی ہے وہاں سے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں منگانی پڑتی ہیں۔ ایسے مرحلے پر عطا کاکوی کے ساتھ بھی پیش آئے وہ کہیں گئے تو نہیں لیکن رابطہ قائم کیا اور پیہم اس چیز کی جستجو اور تلاش کرتے رہے۔

عصر حاضر میں اردو کے چند ہی محقق ملیں گے جن کے اندر یہ خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ عطا کاکوی ان چند خوش نصیب محققین میں ہیں جن کی ذات ان خوبیوں سے متصف ہے۔ آج کل اچھے محققوں کی بڑی کمی ہے۔ محققین اتنے کم ہیں کہ انہیں با آسانی انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف تنقید نگاروں کی اتنی بڑی تعداد نظر آتی ہے کہ انکا شمار بھی مشکل ہے۔

عطا کاکوی کے تحقیقی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ انہوں نے نہ صرف بہار کے شعراء اور ادباء پر تحقیقی کام کیا بلکہ دوسرے مقامات کے شعراء اور ادباء پر گراں بہا تحقیقی مقالے اور مضامین لکھے جن کی افادیت اور قدر و قیمت اپنی جگہ مسلّم ہے ان مضامین کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوعات کے ساتھ بھرپور انصاف کرتے ہیں۔ مضامین لکھتے وقت بڑی عرق ریزی، جانفشانی، لگن اور ادبی موشگافیوں سے کام لیتے ہیں۔

عطا کاکوی کی تصنیف ''حیرت زار'' ان کی تحقیق اور تنقید کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی سے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی اس کتاب نے بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ حکومت ایران نے اس کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے وہاں کے نصاب میں بھی شامل کیا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان تحقیقی کاموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ انہوں نے بہت سے تحقیقی مضامین لکھے جن میں سے بیشتر مضامین پاک و ہند کے مقتدر رسالوں میں شائع

ہوئے اور پسند کئے گئے۔ انہوں نے بہت سے نادر تذکروں اور تصانیف کا سراغ لگایا اور ان پر مقالے لکھ کر ادارۂ تحقیقات عربی/ فارسی پٹنہ سے شائع کئے۔ ان کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ''تحقیقی مطالعے'' کے نام سے دو حصوں میں شائع ہوا۔ ان مجموعوں میں ایسے تحقیقی مضامین ہیں کہ جن کے مطالعہ کے بعد ان کی صلاحیت کا لوہا ماننا پڑتا ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عطا کاکوی ان محققوں میں سے نہیں جو سرسری طور سے گزر جاتے ہیں بلکہ وہ کچھ لکھتے وقت پوری چھان بین، لگن اور ادبی موشگافیوں سے کام لیتے ہیں۔ ''تحقیقی مقالے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نگار پاکستان (شمارہ جنوری وفروری ۱۹۶۸ء) میں لکھتے ہیں۔

''عطا کاکوی صاحب ہمارے ادب کے ان گنے چنے مایہ ناز بزرگوں میں سے ہیں جو متعدد نظریوں کے شناسا اور علوم وفنون کے نباض و غواص ہیں۔ ان کی تحریریں جن کی نظر سے گزری ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع اور انکی نظر کتنی باریک بیں ہے۔ زیر نظر کتاب دراصل ان کے اسی وسیع مطالعہ اور باریک بینی کا نشان ہے۔ اس میں انیس مضامین شامل ہیں۔ ہر چند مضامین بہت مختصر ہیں لیکن جب ان کا مطالعہ کیجئے تو سمجھ میں آ جاتا ہے کہ 'ہاتھی کو حرام اور بکری کو حلال'' کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں کیسے کیسے اہم اور پیچیدہ مسئلوں کو سلجھایا گیا ہے اس پر تبصرہ کی یہاں گنجائش کہاں۔ پھر بھی عنوانات ہی سے آپ کو کچھ نہ کچھ اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ چند عنوانات دیکھئے ''ذوق کا کچھ نایاب کلام'' میرؔ کے مفروضہ اشعار'' غالبؔ کے اردو دیوان کی اشاعتیں''۔ ''مولانا آزاد کے عہد طفولیت کے ادبی نمونے''۔ ''دیوان ذوق کی پہلی اشاعت''۔ ''دلی کا نایاب کلام''۔ ''تذکرہ نادر''۔ ''مصحفی کا کچا چٹھا'' ان عنوانات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کتاب کے تحقیقی مضامین میں کیسی کیسی کام کی باتیں ہوں گی''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بڑا بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ وہ تنقید کے فن سے واقف ہیں۔ وہ ایک اچھے اور سلجھے ہوئے نقاد ہیں۔ انہوں نے عطا کاکوی کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے ان کی اساس صداقت پر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ جملہ خصوصیات عطا کاکوی کی تحریروں میں باآسانی

دیکھی جا سکتی ہیں۔ عطا کاکوی اپنے موضوعات پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ یہ جب تک بات کی تہ تک نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک اپنے خیال کا اظہار نہیں کرتے۔ ذوقِ صحیح کے مالک ہیں اور کھرے کھوٹے اور اچھے برے کی تمیز کرنے کی پوری صلاحیت ان کی ذات میں پائی جاتی ہے۔ ان کی نظر وسیع ہے۔ مغربی اصولوں سے بھی یہ واقف ہیں۔ جزئیات کی تہ تک پہنچ کر باتیں کرتے ہیں۔ یہ معمولی سی معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ یہ کسی سے متعلق رائے دیتے وقت تحقیق، دلائل اور مقابلہ سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتے ہیں۔

عطا کاکوی کے تحقیقی مضامین میں معقولیت، استدلال اور براہین بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں وہ ایسی ایسی ٹھوس دلیلیں دیتے ہیں کہ قاری کو ان کا ہم نوا بننا ہی پڑتا ہے۔ وہ موازنے اور مقابلے سے پیچیدہ گتھیوں کو آسانی سے سلجھا دیتے ہیں۔ ان کی دلیلوں اور مقابلوں کا پیرایہ منطقی ہوتا ہے چونکہ عطا کاکوی ایک اچھے نقاد بھی ہیں اس لئے وہ تحقیقی کاموں میں قدم اٹھانے سے پہلے اس کی اہمیت پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

☆......☆

عطا کاکوی شعر کے آئینے میں

عطا کاکوی، شاد عظیم آبادی کے ان چند خوش قسمت اور ذہین شاگردوں میں سے ہیں جنہوں نے شعروادب کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا اور خاص مقبولیت حاصل کی۔ یوں تو سرزمین بہار میں ہر دور میں ممتاز ادباء اور شعرا پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے گیسوئے اردو کو اپنے شعر وادب سے سنوارا ہے بالخصوص دورِ حاضر میں اس سرزمین سے ایک سے ایک مستند شعراء واد باء، نقاد اور محققین پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے افکار وخیال کی روشنی سے نہ صرف خطۂ بہار کو پُرنور کردیا بلکہ اردو زبان وادب کے دامن کو بیش بہا موتیوں سے مالا مال کردیا۔ انہیں ممتاز اور خال خال لوگوں میں پروفیسر عطا کاکوی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ عطا کاکوی نے بے شمار کتابیں لکھیں اور مرتب کی ہیں۔ بہت سے نایاب تذکرے بھی مرتب کئے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''حیرت زار'' جو بیدلؔ عظیم آبادی کے کلام کے انتخاب اور حالات پر مشتمل ہے کو حکومت ایران نے تعلیمی نصاب میں شامل کرلیا ہے۔ ان کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے 'پدم بھوشن' جیسے اعلیٰ خطاب سے نوازا ہے۔ عطا کاکوی ایک اچھے محقق اور خوش گو شاعر ہیں۔

عطا کاکوی کو شعر گوئی پر بڑی قدرت اور مہارت حاصل ہے۔ بڑی موزوں طبیعت پائی ہے اس کے علاوہ علمِ عروض اور علمِ بلاغت پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ یہاں میرا مقصد یہ نہیں کہ شعر کہنے کے لئے عروض کا جاننا ضروری ہے مگر یہ ایک اضافی خوبی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عام لوگوں کا ذکر کیا بہت سے اردو فارسی کے استاد اور شاعر اس فن سے نابلد ہیں۔ پاک وہند میں بہت کم لوگ ملیں گے جو اس مشکل فن پر دسترس رکھتے ہیں' انہیں مخصوص لوگوں میں عطا کاکوی کا

نام آتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ عطا کاکوی کو شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ رہا ہے اس لئے ان سے کسی حد تک متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں شاد کا رنگ جھلکتا ہے' مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا اور شاد عظیم آبادی کا رنگ ایک سا ہے۔ جس طرح ابتدا میں اقبال نے داغ کی شاگردی کے زیر اثر چند غزلیں داغ کے رنگ میں کہی ہیں جس کی مثال بانگ درا کی چند غزلیں ہیں۔ لیکن چونکہ اقبال ایک ذہین طبیعت کے مالک تھے اس لئے جلد ہی اپنا علیحدہ راستہ اور منفرد رنگ اختیار کر لیا اور اسی انفرادیت نے اقبال کو اقبال بنا دیا۔ یہی بات عطا کاکوی کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ عطا کاکوی اور شاد عظیم آبادی ہر دو شعراء دبستان عظیم آباد سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے بعض قدر مشترک کا پایا جانا ضروری ہے۔ جس طرح دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں چند باتیں ایسی ہیں جو وہاں کے شعراء کی خصوصیات بن کر رہ گئی ہیں اور وہ خصوصیات وہاں کے تقریباً تمام شعراء کے یہاں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں جو ان کو دبستانوں کے رنگ میں رنگ دیتی ہیں۔ یہ قدر مشترک عظیم آباد کے شعراء میں دیکھی جا سکتی ہے

عطا کاکوی نے یوں تو ہر صنف میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے لیکن صنفِ غزل ان کو بہت عزیز ہے اور انکی شاعری کا بیشتر سرمایہ اسی صنف میں موجود ہے۔ غزل ان کو پیاری ہے وہ غزل کو پیارے ہیں۔ اکثر وہ مشکل اور طویل بحروں میں غزلیں کہتے ہیں اور بڑی چابکدستی اور حسن کے ساتھ اسے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے غالب کی مشکل زمین میں تقریباً تیس غزلیں کہیں اور ان کی زمینوں میں بھی بڑی کامیابی کے ساتھ عہد برآ ہوئے طبیعت میں مشکل پسندی ایسی نہیں کہ قاری کو اشعار کے ابلاغ میں مشکل پیش آئے کیوں کہ عطا کاکوی شاعری میں ابلاغ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ غزل کو چیستاں بنا کر پیش نہیں کرنا چاہتے' وہ شاعری میں تکلف اور بناوٹ کے قائل نہیں' انہیں سادگی عزیز ہے جس طرح وہ سادہ زندگی

گزارتے ہیں وہی سادگی ان کے شعروں میں بھی جلوہ گر ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ سنگلاخ زمینوں اور طویل بحروں میں غزلیں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ان میں اتنی روانی اور ہمواری ہوتی ہے کہ غزل کے معیار اس کے حسن اور اس کے معنی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ مطالعے میں کہیں جھنجلاہٹ نہیں ہوتی بلکہ شعر دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

ترے دم سے فصل بہار ہے مجھے کچھ بھی خوفِ خزاں نہیں
جو چمن میں تھا تو بہار تھی جو قفس میں ہوں تو بہار ہے

☆

سنبھالو جوشِ جنوں کو اپنے چمن کا بھی رنگ ڈھنگ دیکھو
پکار کر کہہ دیا خزاں نے بہار اب کے برس نہیں ہے

☆

وہ بھی اس کی بستی واعظ یہ بھی اس کی بستی ہے
مسجد گر ویران ہوئی آباد ہوا مے خانہ تو

☆

شعاعِ خورشید سب نے دیکھی کوئی بھی خورشید تک نہ پہنچا
ہوس بنی دید کی مگر شوق لذتِ دید تک نہ پہنچا

☆

کہاں فیصلہ ہو سکا اس کا یارب ابھی بحث باقی ہے اس مسئلے میں
چھڑایا گیا اس سے گلزار جنت کہ خود باغِ جنت کو آدم نے چھوڑا

☆

عطا کاکوی نے غالب کی زمینوں میں بہت سی غزلیں کہی ہیں جس کا اظہار آگے کر چکا ہوں ان غزلوں میں سے بھی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:۔

دیکھیں کیا ہوتا ہے اب فیصلہ موت و حیات
وہ تو پہلو میں ہیں بالیں پہ قضا آئی ہے
☆
کس کا آشیاں جلتا ہے غنچے مسکراتے ہیں
چمن پرواز یہ تیرے چمن کی آزمائش ہے
☆
مزے خضر نے کہاں مرگ ناگہانی کے لئے
عذاب زیست ملا عمر جاوداں کے لئے
☆
کیوں شکوہ کر کے منت کا الزام سر پہ لیں
تھوڑی سی رہ گئی ہے بہت کچھ گزر گئی
☆
تم سا ہے حسیں کوئی ذرا تم ہی بتا دو
تم کو جو نہ چاہیں تو کسی اور کو چاہیں
اک ہاتھ سے کھلتی ہے گرہ جب کوئی پڑ جائے
ہم کیسے اکیلے ہی محبت کو نبھائیں
کس طرح عطاؔ سنگ حوادث سے بچیں گے
شیشے کے مکانوں میں جو ڈھونڈیں ہیں پناہیں
☆
ہر گل ہے ہمارے خون جگر کا رنگ
سارا چمن ہمیں سے بیزار کیا کریں
☆
تڑپ کر جان دی صحرا میں کس واماندہ وحشی نے
کہ چھالے پھوٹ کر رونے لگے خار بیاباں پر

☆

پریشاں خواب سے وہ چونک اٹھے
ارے وہ مرنے والا مرگیا کیا؟

طویل اور مشکل زمینوں میں عطا کاکوی نے جس خوبی سے شعر کہے ہیں اسی خوبی اور مہارت کے ساتھ چھوٹی بحروں سے بھی انہوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ان میں سہل ممتنع کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہیں کہیں پر تکرار لفظی سے حسن اور شعر میں اثر پیدا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تجربوں اور مشاہدوں کی کمی نہیں۔ ان کا مشاہدہ بڑا عمیق ہے۔ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو اشعار میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کہیں بھی شعریت مجروح نہیں ہوتی۔ شعریت اور تغزل کی شان اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔

ہم وفا کرتے ہیں اس پر بھی وفادار نہیں
آپ کرتے ہیں ستم اور ستم گار نہیں

☆

راز الفت نہ آشکارا ہو
غم میں بھی مسکرائے جاتے ہیں

☆

آگ اور پانی ایک نہیں ہے
آنسو آنسو ، شبنم شبنم

☆

وصل ہے لذت تصور سے
اے شب ہجر تری عمر دراز

☆

وہ بت مائل کرم پر ہوگیا
دل اپنا سوچتا ہے کیا کیا

☆

ہم وفا کیش ہیں مجبور وفا
بے وفائی تری عادت ہی سہی

☆

خدا جانے کہاں منزل ہے ارباب محبت کی
ازل سے چل رہا ہے کارواں کا کارواں اب تک

☆

حیران بنا رہا ہوں جو اپنی نظر کو میں
دکھلا رہا ہوں آئینہ آئینہ گر کو میں

☆

بدل گیا ہے جو اپنی حیات کا مقصد
بھٹک رہی ہے سر راہ زندگی کیسی

☆

آئے وہ عیادت کو بھرے آنکھوں میں آنسو
کیسے کہیں جینے کی تمنا نہ کریں گے

☆

کچھ تو ساغر میں ہے مئے رنگیں
کچھ تری چشم نیم باز میں ہے

☆

بھر جائے پھولوں سے سب کا دامن
کیا میرا دامن دامن نہیں ہے

سامنے کی باتیں ہوں یا عام واردات قلبی ان سب کو عطا کاکوی بڑے اچھوتے اور دل نشیں انداز میں پیش کرتے ہیں۔ خیالات اس طرح پیش کرتے ہیں کہ شعر میں لوچ اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے اشعار دل میں ایک ہلچل پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے

شعر نہیں بلکہ دل میں نشتر سا اترتا چلا جاتا ہے۔ آپ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ کے اشعار میں صفائی اور بے باکی پائی جاتی ہے اکثر تشبیہات اور استعارات سے بھی کلام میں دلچسپی اور دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔

بجلی غریب جا کے جلائے کہاں کہاں
گلشن ہے کون جس میں مرا آشیاں نہیں

☆

خوگر بنا ہے دل جو غم روزگار کا
رنگ خزاں میں بھی ہے تماشا بہار کا

☆

گھروندے آرزو کے روز ڈھاتے ہیں بناتے ہیں
گرا قصر یقین تو پھر سے بنیاد گماں رکھی

☆

جو رات روتے کٹی تری رائیگاں نہ گئی
تجھے خبر نہیں، تھی چشم حسن بھی نمناک

☆

گردشِ آسمان کو پھیر قاعدہ زماں کو توڑ
موت کو زندگی بنا برق کو آشیاں نہ کر

☆

راز الفت نہ آشکارا ہو
غم میں بھی مسکرائے جاتے ہیں

☆

ساکن ہے ترا دریائے عمل موجوں میں تلاطم پیدا کر
ذرے سے صحرا پیدا کر قطرے سے قلزم پیدا کر

☆

جہاں برق کوندی تھی وہیں آشیاں بنایا
یہ مرے جنوں کی ہمت یہ مری خطر پسندی

☆

فلک سے کہہ دو وہ دے کر گرہ اپنی سحر رکھے
جو یہ پلکوں پہ آنسو ہیں انہیں سے سحر ہوگی

☆

زندگی بھرا جام نہیں ہے کہ پئیں
بلکہ اک جام ہے خالی جسے پُر کرنا ہے

☆

وہ دل میں حوصلہ ہی کرے کیوں سفر کے لئے
جو ہر قدم پہ رکے سایۂ شجر کے لئے

☆

یہ تیلیاں تم جو دیکھتے ہو بنائیں گے آشیاں انہیں سے
اگر رہے بال و پر سلامت تو پھر قفس یہ قفس نہیں ہے

☆

بلا سے پھول چمن میں نہ بن سکے لیکن
کھٹکتے خار سے تو چشم باغباں میں رہے

☆

چمن سے چھوٹنے کا غم مجھے صیاد کیا ہوگا
کروں دو چار نالے اور قفس گلزار ہو جائے

☆.....☆

تازگیٔ فکر کے شاعر۔افسر ماہ پوری

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی
جب سنائی نئی سنائی بات

آتش لکھنوی نے جب یہ شعر اپنی شاعری سے متعلق کہا تھا اور درست کہا تھا مگر اس شعر کا بھرپور اطلاق افسر ماہ پوری کے کلام پر بھی ہوتا ہے۔ افسر ماہ پوری کی شاعری کی میعاد تقریباً پچاس سالوں پر محیط ہے۔ مرتے دم تک ان کی تازگی فکر قائم رہی۔ افسر ماہ پوری 'ماہ پور' کے ایسے روشن ماہتاب تھے جس کو مہ وسال کی گرد بھی گہنا نہیں سکی یوں تو گلشن شاعری میں بہت سے پھول کھلے اور وہ اپنی چند روزہ بہار دکھلا کر رخصت ہو گئے۔ یعنی وقت گزرنے کے بعد ان کے شعروں میں وہ کشش' تازگی اور ندرت باقی نہیں رہی' لوگ ان کی شاعری کو بھول گئے مگر افسر ماہ پوری کی شاعری میں کچھ ایسی جان' توانائی اور نیا پن ہے جو لوگوں کو متاثر کرتی رہی ہے اور آج بھی ان کی شاعری پر کشش اور پراثر ہے۔ بہت سے کہنہ مشق اور بزرگ شعراء شعر کہتے رہے مگر زمانے کا ساتھ نہ دے سکے مگر افسر ماہ پوری کی شاعری زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اور بھی نکھار اور تروتازگی آتی رہی۔ یہی بات میں نے احسان دانش کی شاعری کے متعلق بھی کہی تھی یعنی جن کی شاعری وقت کا ساتھ دیتی رہی خاص طور پر ان کے آخری دور کی غزلوں میں جو ندرت پائی جاتی ہے اور ان میں جو نیا پن نظر آتا ہے وہ ان کی جدت پسند فطرت اور مزاج کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ روایت پرست نہیں تھے اس لئے روایت

سے چمٹ کر رہنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ وہ جدت اور اختراع کے قائل تھے اس لئے ان کے آخری دور کے کلام میں نئے دور کا جواں فکر شاعر نغمہ سرا نظر آتا ہے اور یہی بات افسر ماہ پوری کی شاعری پر پوری اترتی ہے۔ ان کی شاعری ہر دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آگے بڑھتی رہی وہ کل بھی ایک معروف اور مقبول شاعر تھے اور آج بھی ان کی مقبولیت اور شہرت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے۔ (ان کے شعری مجموعے ''غبار ماہ'' اور ''نگار ماہ'' کافی تاخیر سے شائع ہوئے جن میں ان کا پرانا کلام بھی موجود ہے) ان کی اس شہرت اور مقبولیت کا راز ان کی تازگی فکر اور ندرت ادا میں پوشیدہ ہے۔ شاد عظیم آبادی کا ایک مشہور شعر ہے۔

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے

آ جاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

مگر افسر ماہ پوری نے شعر و سخن کا جو گلستان سجایا اور گلستان شاعری میں جو گل بوٹے کھلائے انکی رعنائی ذہن اور روح کو بہت فرحت بخشتی ہے اور ان کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے ان کے پرانے کلام کا بھی جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں بھی وہی شادابی شگفتگی اور رعنائی محسوس ہوتی ہے جو ان میں کل موجود تھی۔

یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ وہ ہر دور میں زندہ قدروں اور حقیقتوں کی ترجمانی کرتے رہے ہیں اور بدلتے ہوئے شعری رجحانات اور ادبی رویوں سے باخبری ان کے شعور کو جلا بخشتی رہی ہے۔ انہوں نے حقیقت کی ترجمانی کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا۔ وہ وہی لکھتے رہے جو وہ اپنے اردگرد دیکھتے اور محسوس کرتے رہے یا وہ جن حالات و واقعات سے متاثر ہوئے ان کی فکر و نظر کی تازگی نے انہیں شعر گوئی کے نئے انداز بھی بخشے اس طرح ان کے شعری اسالیب میں تازہ کاری کا احساس شدت سے ہوتا ہے اپنی تازہ فکر کو انہوں نے جس نئے انداز اور سلیقے سے پیش کیا ہے اس سے ان کے کلام میں ندرت اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔

افسر ماہ پوری نے جہاں نئے موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے وہاں انہوں نے روایت سے بھی اپنا رشتہ بالکل ختم نہیں کیا ہے یعنی معیار حسن وعشق کو بھی اپنی شاعری میں برتتے رہے ہیں۔ موضوعات نئے بھی ہو سکتے ہیں اور پرانے بھی۔ کچھ موضوعات ایسے ہیں جو ہمہ گیر ہیں ایسے موضوعات میں جذبۂ عشق اور معاملات حسن وعشق ایک آفاقی اور ہمہ گیر موضوع ہے۔ بعض شعراء پرانے اور فرسودہ موضوعات کو بھی اس نئے انداز سے پیش کرتے ہیں کہ وہ ان کی شاعری کا ایک اہم حصہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً مرزا غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:۔

غم اگر چہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

اس خیال کو اور خاص طور پر دوسرے مصرع کو فیض احمد فیض نے جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض کے اس شعر میں فکر کے لحاظ سے اچھوتا پن نہ سہی مگر تازگی فکر نے اس شعر میں جان پیدا کر دی ہے۔ اور یہ شعر اکثر مواقع پر بطور حوالہ پیش کیا جاتا ہے یعنی اس شعر نے بھی ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے اسی فکر اور اسی جذبے سے افسر ماہ پوری بھی دوچار ہوئے اور وہ اس حقیقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

اور بھی باتیں ہیں دنیا میں محبت کے سوا
ایک ہی قصہ ہمیشہ لوگ کیوں دہراتے ہیں

غالبؔ کی مجبوری فیض کے یہاں آتے آتے بے اعتنائی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر افسر ماہ پوری کے یہاں آ کر یہ جذبہ ایک سوال کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے اس طرح میر تقی میرؔ جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو لوگوں کے استعجاب واستفسار پر کہا:۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کر ہنس ہنس پکار کے
دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

اس طرح جب افسر ماہ پوری لٹے پٹے بنگلہ دیش سے دوبارہ ہجرت کی صعوبت اٹھا کر کراچی پہنچے تو وہ اپنی پہچان اس طرح بتاتے ہیں:۔

افسرؔ وہ اہلِ بزم سے پھر پوچھنے لگے
آئے ہیں یہ جناب یہاں کس دیار سے

☆

اپنی پہچان کوئی ہو تو بتائیں تم کو
کیا ہمارا بھی کہیں نام و نسب ہوتا ہے

ان اشعار میں بے چارگی اور احساس محرومی کے جس کرب کا جس طرح اظہار ہوا ہے انہیں بھی سیاق وسباق کے حوالے سے نئے اور عمدہ اشعار میں شمار کریں گے۔

شاعری کا سفر یونہی جاری رہتا ہے اور جادۂ شعر وسخن کا وہی مسافر کامیاب اور کامران کہلاتا ہے جو اپنا دامن بے جا تقلید اور پیروی سے بچاتا ہوا اس جادۂ سخن پر گامزن رہتا ہے۔ مولانا حالی کے سامنے بھی یہ مجبوری حائل تھی اور وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے اسی لئے تو انہوں نے یہ شعر کہا تھا:۔

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
انہیں باتوں کو دہرانا پڑے گا

شعراء صرف قدماء یا اپنے پیشروؤں کی تقلید میں نہ لگ جائیں بلکہ شعر وسخن کے سلسلے میں اپنے مشاہدے' تجربے اور فکر ونظر کے ذریعے نئی نئی راہیں نکالیں اور نئی بات انداز سے کہیں۔ اور یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ جس نے اس حقیقت کو اپنایا اس نے شعر وسخن کی دنیا میں اپنا مقام ضرور حاصل کیا۔ ورنہ ہر دور میں شعراء کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے مگر ان میں سب کو مقبولیت اور شہرت حاصل نہیں ہوسکی۔ صرف انہیں شعرا کا نام اور کلام باقی رہ گیا جنہوں نے شاعری میں اپنی نئی راہ نکالی ورنہ بقول شاد عظیم آبادی:۔

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک

اے اہل زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

''غبار ماہ'' اور ''نگار ماہ'' کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ افسر ماہ پوری نے بے شمار شعراء میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کرلیا تھا یا اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ میں انہیں گزشتہ تیس سال سے جانتا ہوں ان سے میری ملاقات ان کی موت سے چند دن پہلے تک جاری رہی۔ وہ جب ڈھاکے میں تھے تو وہاں بھی انکا شمار مشرقی پاکستان کے سربرآوردہ شعرا میں ہوتا تھا اس کے بعد ان کی شہرت مغربی پاکستان (حالیہ موجودہ پاکستان) میں پہنچی۔ اور جب وہ کراچی آئے تو یہاں بھی معتبر اور اہم شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا۔

افسر ماہ پوری کے یہاں فکر ونظر کے سرمائے ملتے ہیں' غبار ماہ' کی غزلیں اور نگار ماہ کی نظمیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔ ان کے اشعار میں نہ صرف یہ کہ فکر ونظر کی بوقلمونی ملتی ہے بلکہ ان کے کلام میں رنگ ونور ونکہت کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان کی شاعری میں فکر ونظر کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے مگر علامہ اقبال کی طرح ان کی شاعری میں کوئی مربوط فکر وفلسفہ نہیں ہے کیوں کہ وہ فلسفی شاعر یا شاعر فلسفی نہیں ہیں ہاں ان کی شاعری میں پیغام ضرور ہے اور وہ پیغام ہے انسانیت اور امن وآشتی کا پیغام۔ انکی شاعری محبت' خلوص اور انسان دوستی کی ترجمان ہے۔ افسر ماہ پوری نے انسانی جذبات واحساسات اور اخلاقی قدروں کی ترجمانی جس عمدگی اور

نفاست سے کی ہے اس کی داد دینی پڑتی ہے۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ عشق و محبت ایک انسانی اور لافانی جذبہ ہے جس کی ہر دور میں عکاسی اور ترجمانی شعرا اپنے اپنے طور سے کرتے رہے ہیں۔ افسر ماہ پوری بھی اس انسانی اور ہمہ گیر جذبے سے عاری نہیں تھے۔ ان کے یہاں بھی عشق و محبت کے جذبات سے مملو بے شمار اشعار مل جائیں گے مگر ان میں اظہار و بیان کی فرسودگی اور بوسیدگی نہیں ہے بلکہ ان پر تازگی کا ہی گمان گزرے گا کیوں کہ ان اشعار میں اظہار و بیان کی شگفتگی اور ندرت موجود ہے۔

میں بچھ گیا تیرے قدموں میں خاک کی صورت
تو چھا گیا مری دنیا میں آسماں کی طرح

☆

دل کی تسکین کے ہوتے ہیں بہانے کتنے
لوگ گھڑ گھڑ کے سناتے ہیں فسانے کتنے
دھجیاں اوروں کے دامن کی لئے پھرتے ہیں
اس زمانے کے ہیں عشاق سیانے کتنے

☆

عہد وفا سے آپ پریشاں ہیں عبث
ہم تو بہل ہی جاتے ہیں قول و قرار سے

☆

کہی جائے گی محفل میں ہماری داستاں کب تک
رہو گے تم حسیں کب تک رہیں گے ہم جواں کب تک
جو سچ پوچھو تو ہم مجبور ہو کر شعر کہتے ہیں
تمہاری بزم میں رہتے ہم آخر بے زباں کب تک

☆

تمہارا کیا گلہ شیوہ یہی ہے اہلِ دنیا کا
ادھر کچھ کہہ دیا تم سے ادھر کچھ کہہ دیا ہم سے

☆

وہ گھبراتے ہیں سن کر تذکرہ میری تباہی کا
حقیقت سے نہیں ڈرتے وہ افسانے سے ڈرتے ہیں

☆

ان کے لبوں کو اب بھی تکلف ہنسی میں ہے
خوشبو بہت دنوں سے مقید کلی میں ہے

☆

نہ اپنے دل سے بھلایا نہ دھیان میں رکھا
ہمیشہ تم نے ہمیں امتحان میں رکھا

☆

اشک آنکھوں میں نہ ہونٹوں پر کبھی نالے رہے
اپنے زخموں پر تبسم کی ردا ڈالے رہے

☆

جانے کب راہ میں پڑ جائے ضرورت افسرؔ
ان کی یادوں کو بھی اسبابِ سفر میں رکھنا

☆

ان کی یادوں سے سکون ملتا ہے دل کو کتنا
پیڑ اوجھل ہے مگر چھاؤں گھنی ہے کتنی

☆

حسن کی دھوپ نہ خیرہ کر دے
آنکھ پہ ہاتھ کا سایہ کرلو

☆

رات بھر چلتی ہے ان کی یاد کی ٹھنڈی ہوا
لمحہ لمحہ صبح تک دامن میں بھر جاتے ہیں پھول

ان مثالوں سے اس بات کا یقیناً اندازہ ہو جاتا ہے کہ افسر ماہ پوری واردات قلبی اور معاملات حسن وعشق کو ایک خاص انداز میں برتنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس انداز کو ان کا مخصوص انداز بھی کہا جا سکتا ہے جس میں ندرت بیان کے ساتھ تاثر بھی موجود ہے سوچنے کا انداز بھی نیا ہے' خیالات کی بوقلمونی بھی ہے اور طرز اظہار کی رنگینی بھی۔

تاریخ شعروادب کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اچھا ادب عام طور پر پر آشوب دور میں معرض وجود میں آتا ہے اور بالخصوص شعری ادب۔ اس ضمن میں میرؔ' دردؔ اور غالبؔ کے دور کا بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے اسی طرح وہ شعراء جو پریشان حال رہے یا کسی انقلاب سے گزرے ان کے یہاں بھی عام طور پر اچھے اشعار دیکھنے میں مل جاتے ہیں۔ افسر ماہ پوری نے بڑے پر آشوب دور دیکھے ہیں اور کئی انقلاب سے گزرے ہیں' کئی ہجرتیں کی ہیں اور آگ اور خون کے دریا عبور کئے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ سے پہلے اور بعد کا غم جھیلا ہے۔ زندگی جس طور سے انہوں نے گزاری بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ' کاٹی' ہے وہ ان کے دوست احباب اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے جس طرح مردانہ وار' صبر واستقلال اور ہمت سے ماضی کا بیشتر حصہ گزارا ہے وہ انہیں کا دل جانتا تھا۔ ان نامساعد حالات و واقعات کی پرچھائیاں ان کی شاعری میں جابجا نظر آتی ہیں مگر ان تلخ اور ناگوار واقعات کا اظہار انہوں نے اس سلیقے سے کیا ہے کہ کہیں بھی شعر کے معیار یا اس کے حسن پر حرف نہیں آنے پاتا۔ اپنے خیالات اور تجربات و مشاہدوں کو نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اس طرح ان کی آپ بیتی پر جگ

بیتی کا گمان گزرتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کو مشرقی پاکستان (سابق) کے المیے کی روشنی میں دیکھئے۔ افسر ماہ پوری نے المناک واقعات اپنی اور دیگر لوگوں کی بے کسی اور بے بسی کا اظہار کتنے دلنشیں، موثر اور پرسوز انداز میں کیا ہے:۔

اپنی پہچان کوئی ہو تو بتائیں تم کو
کیا ہمارا کہیں نام و نسب ہوتا ہے

☆

فکر کے آثار چہرے پر نمایاں تو نہیں
دیکھ کر اکثر ہمیں کچھ لوگ گھبراتے ہیں کیوں

☆

جہاں غربت میں کوئی یاد آیا
لپٹ کر رو لئے برگ و شجر سے

☆

یہ آنسو پونچھ لو آنکھوں سے افسرؔ
نکل کر اب کہاں جائیں یہ گھر سے

☆

سر سے ہمارے سینکڑوں طوفاں گزر گئے
لیکن چمن کا ایک بھی پتہ ہلا نہیں

☆

دفعتاً گھبرا کے ہر آہٹ پہ اٹھنا دوڑنا
کیا بتائیں کس طرح پل پل گزارا شام سے

اس آخری شعر کو وہی شخص ٹھیک سے سمجھ سکتا ہے جو اس حقیقت سے واقف ہو کہ سقوط

ڈھاکہ کے بعد اردو بولنے والے (پاکستانی) کسی طرح دن تو بسر کر لیتے تھے مگر شام نہایت بھیانک تصورات لے کر نمودار ہوتی تھی۔ مکتی باہنی والے شام ہوتے ہی اپنے شکار کی تلاش میں نکل جاتے تھے وہ جس گھر میں چاہتے گھس جاتے' زبردستی داخل ہوجاتے' لوٹتے' قتل وخون کرتے اور ان کو ہر طرح کے ظلم وتشدد کا نشانہ بناتے۔ ان حالات میں شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا

ہم کدھر نکلیں کہاں ٹھہریں کسے آواز دیں
گھات میں رہنے لگا ہے شہر سارا شام سے

اور جب گھروں سے کمین نکال دیئے جاتے ہیں تو وہ کھلے میدانوں میں پناہ لیتے ہیں انہیں خیموں (خیمہ بستیوں) میں پناہ دی جاتی ہے۔

ہم پھرتے ہیں کاندھوں پہ لئے اپنے گھروں کو
اے دیکھنے والے یہ تماشا بھی ذرا دیکھ

اور پھر طوفان حوادث کو دیکھ کر شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

طوفان کی رفتار سے چلتی ہے ہوا دیکھ
فانوس تمنا وہ بجھا دیکھ' بجھا دیکھ
ہم اپنے خرابے سے کہاں بھاگ کے جاتے
ہر موڑ پہ پتھر لئے تقدیر کھڑی تھی

کچھ لوگوں کو 'جیل' میں ڈالا گیا۔ شاعر ان کے احساسات کی ترجمانی ان اشعار میں کرتا ہے۔

آنکھوں میں گڑی جاتی ہیں زنداں کی سلاخیں
اشکوں سے امنڈتے ہوئے دریا کو رواں دیکھ
کچھ ہم سے بولتے رہو زنداں میں دوستو
یہ رات کچھ تو گزرے سوال و جواب میں

آخرکار زنداں سے رہائی پاکر یہ قافلہ پاکستان کے لئے روانہ ہوتا ہے مگر یہ لوگ کچھ اس طرح کی ذہنی کیفیت میں مبتلا ہیں۔

ہم اس طرح رواں ہیں کسی شہر کی طرف
جس طرح کوئی آدمی چلتا ہو خواب میں

مگر افسر ماہ پوری جو اس حرماں نصیب قافلے میں شامل ہیں اس عزم و حوصلہ کا سہارا لئے اس امید میں آگے بڑھتے رہے کہ

اس امید پہ گامزن ہیں راہ منزل میں
یہاں ظلمت سہی آگے کہیں تنویر بھی ہوگی

☆

ذرا فرصت تو مل جائے ہمیں آشوب دوراں سے
تصور بھی ترا ہوگا تری تصویر بھی ہوگی

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ افسر ماہ پوری کی شاعری زمانے کا ساتھ دیتی رہی ہے یعنی زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے اور انکی شاعری پر ہم فرسودگی یا روایتی ہونے کا الزام نہیں لگا سکتے۔ ان کی فکر ہمیشہ تازہ دم رہی ہے اور ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ نئی بات نئے انداز سے کہیں اوپر کی چند مثالوں سے بھی یہ بات کسی حد تک واضح ہوگئی اس قبیل کی چند اور مثالیں دیکھئے:۔

یہ دنیا ہے یہاں بے حوصلہ کچھ بھی نہیں ملتا
جسے مہتاب لینا ہو وہ دریا میں اتر جائے

☆

ڈوب کر بھی چاند کالی رات سے لڑتا رہا
دیر تک روشن افق پر نور کے ہالے رہے

☆

گل ہوگئے ہیں خود ترے دامن کے فیض سے
ایسے بھی کچھ چراغ تری انجمن میں ہیں

☆

دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبت کے دیئے
کتنے انساں نے بجھائے ہیں ہوا نے کتنے

☆

ہمیں کبھی تو نظر آئے گا ترا چہرہ
اسی خیال سے پتھر کو صاف کرتے ہیں

☆

دھوپ میں تپتا ہے آنگن تو خیال آتا ہے
بیج بوتا تو کوئی اب تک شجر ہوجاتا

☆

جو دل پہ نقش ہونا تھا اسے لکھتے ہیں کاغذ پہ
کہاں تحریر کرنا تھا کہاں تحریر کرتے ہیں

☆

راکبِ دوش ہو سب کھوگئے آفاق میں
کارزار زیست میں تنہا پیادہ رہ گیا

☆

سڑک پر گاڑیوں سے بچ نکلنا کتنا مشکل ہے
کہیں ٹکرا کے ان سے تیرا سودائی نہ مر جائے

☆

بستگی ہے خاک سے وابستگی جوشِ نمو
دیر تک رکھنے سے گلدانوں میں مر جاتے ہیں پھول

☆

یوں سراسیمہ ہیں ہم ان کے نمک خواروں کے بیچ
کوئی بچہ گھر گیا ہو جیسے خرکاروں کے بیچ

☆

دار و رسن کو چوم کے آگے نکل گئی
یہ حوصلہ اگر ہے تو دیوانگی میں ہے

☆

ہم نے تو سر جھکا دیا خود ان کے پاؤں پر
مجبور ہو ہی جاتا ہے انساں کبھی کبھی

☆

اس دور میں ہر شخص کے چہرے پہ ہے چہرہ
اک چہرہ کھلا دیکھ تو اک چہرہ چھپا دیکھ

☆

یکساں بیاں ہوتی نہیں داستانِ عمر
کچھ لگ گئے ہیں الٹے ورق اس کتاب میں

☆

گو کنجِ خرابات میں ہم دو ہی تھے لیکن
وہ چھوٹی سی دنیا کبھی دنیا سے بڑی تھی

افسر ماہ پوری غزل و نظم ہر دو اصناف سخن پر قدرت رکھتے ہیں۔ عمر کے آخری حصے میں

غزلوں کا رجحان زیادہ تھا۔ گزشتہ ۱۰' ۱۵ سالوں میں انہوں نے نعت اور حمد بھی کثرت سے کہی ہیں۔ مجلس احباب ملت کے نعتیہ اور حمد یہ طرحی مشاعروں کے وہ مستقل صدر تھے۔ اس طرح ان کی بیشتر نعتیں اور حمد یہ کلام طرحی ہیں۔ اور ان کے پاس نعت وحمد کا اتنا سرمایہ ہے کہ ایک مجموعہ آسانی سے شائع ہوسکتا ہے۔ افسر ماہ پوری کی شاعری کی ابتدا ایک نظم سے ہوئی جو انہوں نے ۱۹۴۷ء سے پہلے اپنے مرشد آباد کے قیام کے دوران کہی۔ یہ نظم جس کا عنوان ''ایک لڑکی'' تھا اپنے دوست کی بچی جس کی عمر سات' آٹھ سال تھی کے متعلق کہی تھی۔ یہ نظم ایک معصوم بچی سے متعلق ہے مگر بعض لوگوں نے اسے ایک رومانی نظم سے تعبیر کیا ہے جو غلط ہے اس غلطی کے مرتکب ان کے عزیز دوست پروفیسر نظیر صدیقی بھی ہوئے ہیں اور اس کتاب کی اجرائی کی تقریب کے سلسلے میں جو مجلہ شائع ہوا تھا اس میں اسے ایک رومانی نظم قرار دیا ہے اگر وہ اس نظم کو بغور پڑھ لیتے تو اتنی فاش غلطی نہ کرتے۔ بہر حال یہ نظم افسر صاحب کی اولین شعری تخلیق ہے۔

''نگار ماہ'' جو افسر ماہ پوری کی نظموں کا مجموعہ ہے اس میں بہت سی خوبصورت نظمیں ملتی ہیں۔ افسر ماہ پوری نے طبع زاد نظموں کے علاوہ بنگلہ نظموں کے ترجمے بھی کئے ہیں 'جام کوثر' کے نام سے جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں قاضی نذر الاسلام کی اسلامی نظموں کا ایک بڑا کامیاب منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان نظموں میں قومی' ملی' رومانی' موضوعاتی اور استعاراتی نظمیں شامل ہیں۔ 'نگار ماہ' میں شامل نظموں میں مکڑی' زرد پتے' شاعر' فنکار' گلاب زخموں کے' طیور آوارہ' کومل' زندگی' ارتقا' کشاکش' وغیرہ ایسی عمدہ نظمیں ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چند ملی اور قومی نظمیں ہیں جو انہوں نے 'ریڈیو' کے لئے لکھی تھیں۔ یہ نظمیں شاعر کے ملی اور قومی جذبات کی بھر پور ترجمانی کرتی ہیں۔ ایسی نظموں میں 'پاکستان کی باتیں' قائد اعظم' احساس خودی (جشن آزادی کے دن) آج کے دن' نغمہ ملی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں شامل آخری نظم ''ایمان وحرمت'' کے زیر عنوان ہے جو ایک مختصر نظم ہے جس کے مکالمے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی نظر عصری مسائل پر بھی تھی جس میں کشمیر اور بوسنیا کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ اس

طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نظم کا میدان ہو یا غزل کا میدان افسر ماہ پوری دونوں اصناف سخن میں شعر کہنے پر قدرت رکھتے تھے اور موضوعات کے لحاظ سے بھی نئے اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کرتے تھے مختصر طور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انکی غزلوں اور نظموں یعنی ہر دو مجموعوں میں اچھے اشعار اور اچھی نظمیں موجود ہیں جو ان کی شاعری کو اعتبار بخشتی ہیں اور جن کی روشنی میں ہم اس دور کے چند اہم اور مقبول شاعروں میں ان کا شمار یقینی طور پر کر سکتے ہیں۔

☆......☆

ڈاکٹر حنیف فوقؔ۔ دیدہ وشنیدہ

یادش بخیر ۱۹۶۲ء کا کوئی ابتدائی مہینہ تھا۔ پروفیسر ارشد کاکوی جو ڈاکٹر حنیف فوق کے شاگرد رہے تھے وہ ڈھاکہ سے پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ ان سے ڈھاکہ کی ادبی وشعری فضا سے متعلق باتیں ہوتی رہیں پھر بات جامعہ ڈھاکہ کے شعبۂ اردو کی چل نکلی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جامعہ کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے علاوہ کون سے ایسے استاد ہیں جو طلبا میں مقبول ہیں اور جن کا شمار اردو کے ادیبوں' شاعروں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا یوں تو کئی اچھے استاد اس شعبے میں ہیں مگر طلبا میں جو سب سے زیادہ مقبول ہیں وہ پروفیسر حنیف فوق ہیں۔ ان کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ ایک لائق' باصلاحیت اور مشفق استاد ہیں بلکہ ایک اچھے نقاد' محقق' شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور طلبا کو بہت محنت اور لگن سے پڑھاتے ہیں۔ پرانے اور نئے ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ شعری ادب اور فکشن کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایک اچھے استاد ہیں جو طلبا کے اندر ادبی ذوق بھی پیدا کر دیتے ہیں اور وہ ایسے طلبا کو خاص طور پر بہت پسند کرتے ہیں جن کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے اور جن کے اندر تخلیقی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

میں جب ترک وطن کر کے مشرقی پاکستان آیا تو شعبۂ اردو میں داخلہ لے لیا۔ میں نے پٹنہ سے ایم اے فارسی میں کیا تھا جو مشرقی پاکستان کے صرف دو تین کالجوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ اردو کی تدریس ہر کالج میں ہوتی تھی اور اردو کے اساتذہ کی تقرری بھی ہوتی رہتی تھی۔ جامعہ ڈھاکہ میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے علاوہ مجھے ڈاکٹر حنیف فوق صاحب سے بھی پڑھنے کا

موقع ملا۔ چند کلاسوں کے بعد ہی مجھ پر واضح ہوگیا کہ وہ ایک اچھے استاد ہیں۔ میں نے ان کو ویسا ہی پایا جو خاکہ میرے ذہن میں ارشد کاکوی کی باتیں سن کر مرتب ہوا تھا۔ ان کے پڑھانے کا انداز بہت دلنشیں تھا۔ یعنی وہ کہیں اور سنا کرے کوئی؟

وہ شاعری کا حصہ پڑھاتے تھے مگر ہم ان سے تنقید بھی پڑھتے تھے۔ فوق صاحب ایک اچھے شاعر بھی تھے اور ہیں مگر ان کی وجہ شہرت ان کی تنقید نگاری ہے اور ان کا سب سے زیادہ کام اسی موضوع پر ہے مگر ان کے اشعار بھی ملک اور بیرون ملک کے معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ ان رسالوں میں 'نگار'۔ 'ہمایوں'۔ 'افکار'۔ 'فنون'۔ 'ادب لطیف' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہنامہ ''افکار'' سے ان کا بڑا گہرا اور دیرینہ تعلق رہا ہے اس کے اداریے مہمان مدیر کی حیثیت سے لکھے رہے۔ صہبا لکھنوی کے بعد اس کے مدیر بھی مقرر ہوئے مگر افسوس کہ یہ رسالہ اب بند ہو گیا ہے۔

گزشتہ سال جمیل یوسف کراچی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فوق صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں ان کو لے کر ان کے یہاں گیا' راستے میں انہوں نے فوق صاحب کا ایک شعر سنایا جو انہوں نے ڈھاکہ کے ایک مشاعرے میں ۱۹۶۸ء میں سنا تھا۔ شعر یہ تھا:۔

کبھی اپنی جوانی من چلی تھی
کبھی دنیا بھی سانچے میں ڈھلی تھی

میں نے جمیل یوسف سے پوچھا کہ اتنا پرانا شعر آپ کو کیسے یاد رہ گیا تو انہوں نے کہا کہ ایک اچھے شعر کی یہ خوبی ہے کہ وہ یاد رہ جاتا ہے اور مجھے اب تک یاد ہے۔

اسی طرح کچھ دنوں کے بعد گروپ کیپٹن اعجاز الحق اعجاؔز سے جب میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی فوؔق صاحب کا ایک شعر سنایا جو انہوں نے ان سے ڈھاکہ میں سنا تھا۔

بادلوں کو تکتا ہوں جانے کتنی مدت سے
ایک بوند پانی کو یہ زباں ترستی ہے

فوق صاحب نے میری گزارش پر اس غزل کے چند اور اشعار بھی سنائے۔

کیا نظر کی ہشیاری خود اسیر مستی ہے
جو نگاہ اٹھتی ہے محو خود پرستی ہے
رات غم کی آئی ہے ہوشیار دل والو
دیکھنا ہے یہ ناگن آج کس کو ڈستی ہے

اب بتابشِ اختر تیرگی ہے افزوں تر
روشنی بھی بک جائے یہ کمال پستی ہے

ڈاکٹر حنیف فوق کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں تاکہ ان کی شعر گوئی کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔

آہ و فریاد سے معمور چمن ہے کہ جو تھا
مائل جور وہی چرخ کہن ہے کہ جو تھا
حسن پابندئ آداب جفا پر مجبور
عشق آوارۂ کوہ و دمن ہے کہ جو تھا
لاکھ بدلا سہی منصور کا آئین حیات
آج بھی سلسلہ دار و رسن ہے کہ جو تھا

نسیم صبح بہار آئے دل حزیں کو قرار آئے
کلی کلی لے کے منہ اندھیرے صباحت روئے یار آئے

جا بجا کوچہ و بازار میں ہیں برف کے پھول
دل جو سلگا تو ابھی اور تماشہ ہوگا

وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی ایک نظم ''شام غربت'' ادب لطیف میں شائع ہوئی جو بہت مشہور ہوئی۔ فوق صاحب نے اپنا مجموعۂ کلام ''سایۂ شب'' کے نام سے مرتب بھی کیا تھا مگر اب تک یہ مجموعہ شائع نہیں ہوسکا۔

فوق صاحب اپنے شاگردوں کا ہر طرح خیال رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی صاحب کے مکان پر ہر سال طرحی مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک بار اس محفل میں ایک جونیئر شاعر کو جو جامعہ ڈھاکہ کا طالب علم تھا میرے بعد پڑھوایا گیا۔ فوق صاحب نے مشاعرے کے بعد کہا کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ اس طرح جب ان کی تنقیدی کتاب 'متوازی نقوش' پر میں نے 'جنگ' میں تبصرہ لکھا اور اس بات کا ذکر کیا تھا کہ اس کے کئی مضامین میں فوق صاحب نے ایک نیا تنقیدی نظریہ یا انداز فکر پیش کیا ہے اور اس کی روشنی میں شخصیتوں اور فن پاروں کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اس انداز نظر کو ہم 'متوازی نقوش' کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کے دو ہفتے بعد ممتاز ادیب میرزا ادیب کا تبصرہ اس کتاب پر شائع ہوا۔ اس میں بھی انہوں نے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ میں نے فوق صاحب سے کہا کہ دیکھئے سر! ان کی تحریر سے بھی میری بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ فوق صاحب نے کہا مگر اولیت آپ کو حاصل ہے کہ آپ نے اس بات کا ذکر پہلے کیا تھا۔

فوق صاحب ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ آئے اور شعبۂ اردو میں استاد مقرر ہوئے پھر جامعہ کراچی سے ۱۹۶۴ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے اس مقالے کا موضوع "The Social Analysis of Urdu During & After 1857" تھا۔ ان کے مقالے کے ممتحن ڈاکٹر سید عبداللہ' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان تھے۔ ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری پاکستان میں ملی' مگر نہ جانے کیوں میرے استاد بھائی احمد زین الدین نے اپنی کتاب ''رنگ شناسائی'' میں یہ لکھا ہے کہ

''......اور غیر ملکی یونیورسٹی سے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے''

یہ بات میں صرف ریکارڈ کی درستگی کے لئے لکھ رہا ہوں۔

فوق صاحب کا پہلا تنقیدی مجموعہ ''مثبت قدریں'' ڈھاکہ سے شائع ہوا۔اس کتاب کی علمی وادبی حلقوں میں بڑی پزیرائی ہوئی۔اس کتاب میں بائیس تنقیدی مضامین ہیں جو بیس سال کے اندر لکھے گئے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ فوق صاحب ۱۹۷۱ء میں کراچی آ گئے۔جامعہ کراچی میں استاد مقرر ہوئے پھر حکومت پاکستان کی طرف سے ترکی چلے گئے۔اس دوران انہوں نے ترکی زبان سیکھی اور ترقی کے لئے مشہور شاعر فواد بائیرام اوغلو کی رباعیات کا منظوم ترجمہ کیا جسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ترکی زبان میں ''اتاترک اردو تحریروں میں'' اور ایک دوسری کتاب ''اقبال اور مغربی افکار کا ورثہ'' انقرہ یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔

فوق صاحب کی ایک اہم تنقیدی کتاب ''متوازی نقوش'' ہے۔اس کتاب میں بھی مختلف موضوعات پر اکتیس مضامین شامل ہیں۔اس کتاب کو نفیس اکیڈمی نے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا تھا مگر یہ کتاب بھی 'مثبت قدریں' کی طرح نایاب ہو چکی ہے چونکہ یہ کتاب کراچی میں شائع ہوئی تھی اس لئے کچھ لوگوں کے پاس موجود ہے۔یہ کتاب بھی علمی وادبی حلقوں میں مقبول ہوئی۔

فوق صاحب کی ایک اور قابل ذکر کتاب مرزا غالب پر ہے جو 'غالب۔نظر اور نظارہ' کے نام سے شائع ہوئی ہے اور جسے ادارۂ یادگار غالب نے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔فوق صاحب نے علامہ اقبال پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا مسودہ مرحوم مشفق خواجہ کے پاس تھا اور وہ اکثر اس کی تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کتاب بہت جلد منظر عام پر آ رہی ہے۔مگر آں قدح شکست واں ساقی نماند' مسودہ کہیں گم ہے۔تلاش جاری ہے۔ان کے علاوہ ڈاکٹر حنیف فوق نے بیشمار مضامین لکھے ہیں جو مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں' ان کی اشاعت کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔یہ کام اگر علمی وادبی ادارہ کرے تو مناسب ہوگا۔

ماہنامہ افکار جو نہایت کامیابی کے ساتھ فوق صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اس کے شائع ہونے کی کچھ امید ہوئی تھی مگر اے بسا آرزو کہ خاک شد۔اب یہ باب بھی ایسا لگتا ہے کہ

جیسے بند ہو گیا ہے۔فوق صاحب طلبا کو نہایت شوق سے پڑھاتے اور ان کو پڑھا کر خوش ہوتے تھے۔ایک بار ڈاکٹر حنیف فوق صاحب سے چند طلبا نے کہا کہ آپ اکبرالہٗ آبادی پر ایک لیکچر دیں کیوں کہ ان پر سوال آ سکتا ہے اور کسی نے بھی تفصیل سے اکبرالہٗ آبادی کو نہیں پڑھا ہے چنانچہ ایک دن اس کے لئے مقرر ہو گیا۔ میں غلام خواجہ اور محترمہ اقبال سعید ان کے مکان پر ساڑھے بارہ بجے پہنچ گئے۔ایک بجے لیکچر کا سلسلہ شروع ہوا تقریباً ۳۰-۴ بجے تک چلتا رہا۔ ہاں درمیان میں کھانے کے لئے ۲۵ منٹ کا وقفہ ضرور ہوا۔فوق صاحب نے ہم لوگوں کو پر تکلف کھانا بھی کھلایا۔ ساڑھے چار بجے چائے سے ہماری تواضع کی اور اس طرح ہم لوگ کامیاب اور شاد کام گھر واپس آئے۔

میرے استاد بھائی احمد زین الدین نے اپنی کتاب ''رنگ شناسائی'' میں لکھا ہے کہ فوق صاحب جب ترکی گئے تو چند سال میں ترکی زبان پر مہارت حاصل کر لی مگر مشرقی پاکستان میں بیس سال رہنے کے باوجود بنگلہ نہ سیکھ سکے۔انہوں نے بنگلہ سیکھنے کا آغاز ضرور کیا تھا مگر وہ بنگلہ نہ سیکھ سکے۔اس سلسلے میں جب وہ بنگلہ کے حروف تہجی پڑھ رہے تھے تو بنگلہ کا ایک حرف ''جھ'' پڑھایا گیا اور لکھنے کو کہا گیا۔ بنگلہ کا حرف ''جھ'' ہندی 'جھ' سے بھی مشکل اور مختلف ہے۔یہ حرف چینی یا جاپانی حرف سے ملتا جلتا ہے۔اس کی شکل ایسی ہوتی ہے کہ اوپر اور نیچے سے جھالر کی شکل نظر آتی ہے۔یا زلف ، پیچاں کی شکل بنتی ہے۔فوق صاحب نے کہا کہ اب معلوم ہوا کہ زلف بنگالہ کیوں مشہور ہے۔آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ ان کے اس جملے سے محظوظ ہوئے۔ایک بار نوشاد نوری ان کے پاس آئے۔ہم بھی ان کے پاس بیٹھے تھے۔انہوں نے کہا کہ پروفیسر اقبال عظیم کی بصارت ان کی بصیرت میں تبدیل ہو گئی ہے۔فوق صاحب نے کہا کہ کہیے آپ کے یہ الفاظ ان تک پہنچا دیئے جائیں۔حاضرین محفل زیر لب مسکرائے۔فوق صاحب کے اندر حس مزاح بھی ہے مگر اس کا اظہار اپنے خاص دوستوں اور ان کی محفل میں کیا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف فوق کے کئی درجن شاگرد پاکستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کچھ بنگلہ دیش میں بھی ہیں اور تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ ان کے سب سے زیادہ شاگرد کراچی میں ہیں۔ ان میں سے بیشتر مختلف کالجوں میں اردو کے استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں یا مدت ملازمت پوری کر کے ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ جامعہ کراچی میں ان سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کا شمار کیا جائے تو یہ فہرست کافی طویل ہو سکتی ہے۔ فوق صاحب کی نگرانی میں کئی لوگوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا جن میں پروفیسر سید سعید احمد، پروفیسر مریم حسین، پروفیسر شوکت اللہ جوہر اور پروفیسر عطا اللہ خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان میں پروفیسر سید سعید احمد کا مقالہ ''اردو زبان و ادب کی ترقی میں کانپور کا حصہ'' (شہر ادب کانپور کے نام سے) شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر مریم حسین کا مقالہ ''اردو ناول اور افسانے کے تناظر میں'' شوکت صدیقی کے فکر و فن کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ' اور پروفیسر عطا اللہ خاں کا مقالہ 'فارسی اور اردو کے روابط' کا بھی شمار اچھے مقالوں میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں مقالے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مریم حسین کا مقالہ جو شوکت صدیقی کے فن پر ہے مگر یہ اردو فکشن کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ یہ مقالہ یا کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ شوکت صدیقی پر اتنا اہم اور بسیط کام کسی اور نے نہیں کیا ہے۔ اس مقالے میں مریم حسین نے شوکت صدیقی کو بحیثیت ڈراما نگار بھی دریافت کیا ہے۔ ان کی کتاب ایسی جامع اور مفید کتاب ہے کہ جو بھی شخص اردو فکشن کے حوالے سے کچھ لکھنا چاہے گا وہ اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پروفیسر ڈاکٹر سعید صاحب کا کام اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں کانپور کی ادبی اور علمی تاریخ کا بہت اچھا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہاں ان سے ایک غلطی ضرور ہوئی کہ مولانا محمد علی مونگیری کا تعلق انہوں نے کانپور سے دکھایا ہے جو درست نہیں ہے۔ فوق صاحب کے شاگردوں میں سے دو بنگالی شاگردوں نے بھی اردو میں مقالہ لکھا ہے۔ یہ دونوں حضرات بنگالی نژاد تھے۔ ایک ڈاکٹر نور الدین (جو واپڈا میں ملازم تھے) اور دوسرے ڈاکٹر عبدالحق جو چاٹگام میں اردو کے پروفیسر تھے۔

اپنے مضامین کی کتاب ''رنگ شناسائی'' میں احمد زین الدین نے فوق صاحب کے بارے میں جس خوف کا اظہار کیا ہے وہ دراصل احترام کا ایک درجہ ہے۔ ہماری مشرقی روایت

میں بزرگوں سے لوگ ڈرتے ہیں اوران کا احترام کرتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ایک شعر میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے

تھا بزرگوں کا رعب کچھ ایسا
بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے

اس دور کے ایک ہندوستانی شاعر اشوک ساحلؔ نے اس بات کو اس طرح اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے:۔

ہے مجھ پر مشرقی تہذیب کا ایسا اثر اب تک
میں دادا بن گیا ہوں پر بڑے بھائی سے ڈرتا ہوں

مرزا فرحت اللہ بیگؔ نے بھی ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی'' کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' میں لکھا ہے کہ مولوی صاحب کے پاس مولویوں کی ایک جماعت پڑھنے آتی تھی۔ اس جماعت میں بخارا' کابل اور سرحد کے لوگ تھے۔ خوش مذاقی ان کو چھو کر نہیں گئی تھی۔ متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوئے ادب سمجھتے تھے۔ یہ بھی ادب واحترام کا ایک انداز تھا مگر اس طرح کے خوف کا اطلاق فوقؔ صاحب کے طلبا پر نہیں ہوتا تھا۔ طلبا ان کو عزیز تھے اور طلبا ان کو عزیز رکھتے تھے۔

ڈاکٹر حنیف فوقؔ کے کام اور ان کی علمی وادبی خدمات کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اردو زبان وادب کے لئے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان کے نزدیک علمی وادبی کام ایک عبادت کی حیثیت رکھتا تھا اور رکھتا ہے ان کا شمار اردو کے ان بے لوث خادموں میں ہوتا ہے جن پر شادؔ عظیم آبادی کے اس شعر کا اطلاق ہوتا ہے:۔

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہل زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

☆......☆

مشفق خواجہ:۔ ابیات کے آئینے میں

مشفق خواجہ بڑی پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ اگر چہ ان کی وجۂ شہرت ایک محقق کی حیثیت سے ہوئی مگر وہ ایک ممتاز طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے بھی بلند مقام پر فائز تھے۔ انہوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں مقدمہ نگار، جائزہ نگار اور تبصرہ نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں ان سب کے علاوہ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے جس کا ثبوت ان کا مجموعہ کلام ہے جو 'ابیات' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی شاعری کو (بالخصوص لوگوں کے سامنے) کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اس کے برعکس وہ اپنی تحقیق نگاری اور مزاح نگاری کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ اس دور کے محققوں اور طنز و مزاح نگاروں میں مشفق خواجہ ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مگر جب ہم ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے اگر چہ وہ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے اور نہ عام طور پر وہ اپنا کلام کسی کو سناتے تھے۔ صرف ایک مخصوص نشست میں جو منظر علی خان منظر نے وضاحت نسیم کے گھر پر کی تھی اس کی صدارت بھی کی تھی اور اپنا کلام بھی سنایا تھا ورنہ وہ نہ تو کسی ادبی تقریب میں شرکت کرتے تھے نہ صدارت کرتے تھے نہ مہمان خصوصی ہوتے اور نہ اپنا کلام سناتے۔ اگر وہ چاہتے تو شہر کی بہت سی اہم محفلوں میں کی صدارت کر سکتے تھے مگر وہ کہا کرتے تھے کہ اس طرح سے وقت ضائع ہوتا ہے اور وہ اپنے دیگر ادبی کام نہیں کر سکتے۔

آمدم برسر مطلب:۔ خواجہ صاحب ایک اچھے شاعر تھے بلکہ ایک عمدہ غزل گو تھے ان کا مجموعہ کلام ''ابیات'' جو غزلیات پر مشتمل ہے اس کے مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

وہ ایک اچھے غزل گو تھے مگر خواجہ صاحب کسرنفسی سے کام لیتے ہوئے اپنی شاعری کو اہمیت نہیں دیتے تھے جبکہ ان کے اور میرے دوست پروفیسر نظیر صدیقی کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ لوگ ان کی شاعری کو اہمیت نہیں دیتے اور ان کی شاعری پر نہیں لکھتے۔ خواجہ صاحب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ عام طور پر اردو کے اہم نقادوں اور محققوں کی شاعری اچھی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی مثلاً پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ مگر ڈاکٹر عندلیب شادانی اور چند لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ خواجہ صاحب کے مجموعہ کلام ''ابیات'' میں غزلوں کے علاوہ کچھ مفرد اشعار بھی اور دو دو اشعار بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں جو مجموعے کے آخری حصے میں درج ہیں مگر یہ بھی ان کی غزل گوئی کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یعنی غزل خواجہ صاحب کی محبوب صنف سخن رہی ہے اور اس طرح وہ صرف غزل گو شاعر تھے۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مشفقؔ خواجہ صاحب کی کئی ادبی حیثیتیں تھیں مگر وہ نام ونمود کی خواہش نہیں رکھتے تھے کوئی اگر ان کی شاعری یا ان کے فن پر لکھنا چاہتا تو وہ اسے منع کر دیتے تھے۔ خواجہ صاحب کا تخلص مشفقؔ تھا مگر انہوں نے اپنی غزلوں میں تخلص کا بہت کم استعمال کیا ہے بعض جگہ تو تخلص درمیان میں آ گیا ہے۔ ''ابیات'' کے مطالعے کے بعد میں یہ کہوں گا (بلکہ ہر شخص یہ کہے گا) کہ خواجہ صاحب کی غزل گوئی کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے اور انہوں نے اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ''ابیات'' میں جو پہلا شعر ملتا ہے وہ یہ ہے:۔

کمال بے ہنری بھی ہنر سے کم تو نہیں
مرا شمار کہیں ہو مجھے یہ غم تو نہیں

اس شعر سے ان کے مزاج کا پتہ چلتا ہے ورنہ بیشتر تو تعلّی سے کام لیتے ہیں اگرچہ اردو شاعری میں اس کا رواج عام ملتا ہے۔ خواجہ صاحب نے نہ تو کسی سے اپنی کتاب پر لکھوایا ہے اور نہ خود اپنے بارے میں لکھا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ان کے دو اشعار پر مشتمل ہے۔

یہی غزل مری محرومیوں کا نوحہ غم
یہی غزل ترا آئینۂ جمال بھی ہے
جو پا سکا نہ تجھے میں تو کھو دیا خود کو
یہ میرا عجز بھی ہے یہ مرا کمال بھی ہے

یہ اشعار اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ غمِ زمانہ اور غمِ محبوب ان کی شاعری کا محور اور مرکز ہے۔ مگر یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ غم ایام اور غم عشق کے سلسلے میں خواجہ صاحب کا رویہ دوسروں سے جدا تھا۔ خواجہ صاحب کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی اسے غالباً گلوکاروں نے بھی گایا ہے۔ اس غزل کے دو اشعار دیکھئے:۔

قدم اٹھے تو عجب دلگداز منظر تھا
میں آپ اپنے لئے راستے کا پتھر تھا
ہر اک عذاب کو میں سہ گیا مگر نہ ملا
وہ ایک غم جو مرے حوصلے سے بڑھ کر تھا

اسی غزل میں ایک شعر ہے جو انسان کی مخصوص کیفیت یعنی نفسیاتی حالت کا مظہر ہے۔ اس شعر میں جدت بھی ہے اور اس دور کے انسان کی بے نفسی کی تصویر بھی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک عمدہ اور جدید شعر ہے۔

ہزار بار خود اپنے مکاں پہ دستک دی
اس احتمال میں جیسے کہ میں ہی اندر تھا

ہزار حالات بدل جاتے ہیں انسان اپنے ماضی سے بالکل کٹ کر نہیں رہ پاتا ہے۔ ماضی کی خوشگوار یا ناخوشگوار یادیں اور باتیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ اس حقیقت کو کس قدر دلنشیں اور موثر انداز میں شاعر نے پیش کیا ہے۔

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے جس کا موضوع تو فرسودہ ہے مگر اظہار بیان نیا ہے۔ موضوعات سے متعلق میں یہ کہنا چاہوں گا کہ بیشتر موضوعات اور مضامین بالکل نئے نہیں ہوتے' دوسرے شعرا نے بھی ایسے ہی موضوعات پر اشعار کہے ہیں مگر انہوں نے ان کو اپنے حسن بیان سے اور اسلوب کی تازہ کاری سے ان اشعار کو نیا بنا دیا ہے۔ مشفق خواجہ کے یہ اشعار دیکھئے اس میں بھی یہی خوبی ملتی ہے:۔

وقت کتنا رہا مے خانوں کی راتوں کی طرح
رہے گردش میں یہ دن رات کے ساغر کیا کیا
رہ گزر دل کی نہ پل بھر کو سنسان ہوئی
قافلے غم کے گزرتے رہے اکثر کیا کیا
آ ذرا نہ تجھے مری وحشت دل کے سب رنگ
شام سے صبح تلک ڈھلتے تھے پیکر کیا کیا

☆

تو مرے دل میں مثالِ چمن مہکتا رہا
میں سانس لوں تری خوشبو بکھر بکھر جائے

☆

میں آئینہ ہی نہیں عکس بھی ہوں لیکن تو
وہ روشنی ہے جو دامن کشاں گزر جائے

اپنے ایک شعر میں وقت کا تصور کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے

یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا
وقت اک خواب رواں ہے سو گزر جائے گا

شاعر گزرتے ہوئے لمحوں سے بھی خوفزدہ ہے کیوں کہ یہ گزرتے لمحات اس کے دامن کو خوشیوں سے نہیں بھرتے بلکہ یہ لمحے اسے دکھ اور درد کی سوغات سے ہی نوازتے ہیں۔

ہر گزرتے ہوئے لمحے سے بھی یہ خوف رہا

حسرتوں سے مرے دامن کو یہ بھر جائے گا

اور پھر جب رات آتی ہے تو اس کے دکھ میں اور اضافہ ہو جاتا ہے' حسرتوں کا خون ہو جاتا ہے اور اس کے خواب بکھر جاتے ہیں

دل شفق رنگ ہوا ڈوبتے سورج کی طرح

رات آئے گی تو ہر خواب بکھر جائے گا

یادِ ماضی شاعر کے لیے بھی عذاب بن جاتی ہے۔ وہ تلخ یادوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے کیوں کہ یہ دکھ اور درد سے بھری ہوئی یادیں اسے ہر روز پریشانیوں سے دوچار کرتی ہیں' اس سے زندہ رہنے کی امید بھی چھین لیتی ہیں اور اس کے اندر خواہش مرگ پیدا کر دیتی ہیں' اسی لئے شاعر کہتا ہے کہ گزرے ہوئے دن کو یاد کرنا اس کے حق میں نہیں ہے یعنی بقول غالبؔ '' مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا''

گزر گئے ہیں جو دن ان کو یاد کرنا کیا

یہ زندگی کے لئے روز روز مرنا کیا

شاعر اپنے تجربات کی روشنی میں یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ:۔

مری نظر میں گئے موسموں کے رنگ بھی ہیں

جو آنے والے ہیں ان موسموں سے ڈرنا کیا

اس شعر میں شاعر کے عزم و حوصلے کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ مگر شاعر زندگی میں کسی تبدیلی کا خواہاں بھی ہے۔ وہ ایک انداز سے زندگی گزارنا نہیں چاہتا ہے۔

گزر رہی ہے' غنیمت ہے زندگی' مانا
مگر یہ ایک ہی انداز سے گزرنا کیا

تعلقات کے زہر اور زمانے کے نارو سلوک کو خواجہ صاحب اس انداز سے اپنے شعروں میں پیش کرتے ہیں:۔

یہی نہیں کہ وہ بے تاب و بے قرار گیا
مری رگوں میں بھی اک زہر سا اتار گیا
ہوائے سرد کا جھونکا بھی کتنا ظالم تھا
خیال وخواب کے سب پیراہن اتار گیا

اس زمانے میں ہر شخص تنہائی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ تنہائیاں بیشتر لوگوں کی زندگی کا مقدر بن گئی ہیں۔ خاص طور پر یہ بڑے شہروں میں مثلاً کراچی میں اس کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ وہ عصری مسائل سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ عصر حاضر کے مسائل پر بھی شعر کہے ہیں اور خوب کہے ہیں چند اشعار دیکھئے:۔

تنہائی نے دیواروں پر وہ نقش گری کی
لگتا ہے کسی اور کا گھر' اب تو گھر اپنا
میں آپ ہی دروازہ ہوں اور آپ ہی دستک
اور آپ ہی بیٹھا ہوں یہاں منتظر اپنا

☆

ساتھ کچھ دور چلا دولت دنیا کی طرح
پھر مجھے چھوڑ گیا نقش کف پا کی طرح

☆

یہ حال ہے مرے دیوار و در کی وحشت کا
کہ میرے ہوتے ہوئے بھی مکان خالی ہے

دمِ نظارہ مری حیرتوں پہ غور نہ کر
کہ میری آنکھ ازل سے یونہی سوالی ہے
☆
غم ہی لے دے کے مری دولت بیدار نہیں
یہ خوشی بھی ہے میسر، کوئی غم خوار نہیں
خود سے بھی توڑ چکا ہوں میں تعلق اپنا
اب مری راہ میں حائل کوئی دیوار نہیں
☆
اک ایسا شخص بھی دائم سفر میں رہتا ہے
جو قید اپنے ہی دیوار و در میں رہتا ہے

مندرجہ بالا اشعار میں جدید حسیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔عصری اور جدید مسائل پر شاعر کی گہری نظر ہے۔ان اشعار کی روشنی میں ہم ان کو ایک معتبر جدید شاعر کہہ سکتے ہیں۔
مشفق خواجہ کے یہاں معاملات حسن و عشق اور محبوب کے رویوں کا بھی بہت خوب صورت اظہار ملتا ہے مگر ان کا اظہار روایتی ہرگز نہیں بلکہ ان کے اظہار و بیان میں ایک نیا انداز ملتا ہے۔مثلاً یہ اشعار دیکھیے:۔

مری غزل سے نہ سمجھا وہ میرے غم کو تو کیا
یہی بہت ہے وہ اپنا سراغ پالے گا
☆
نہ یاد رکھتا تھا مجھ کو نہ بھول جاتا تھا
کبھی کبھی وہ مجھے یوں بھی آزماتا تھا
☆
نہ جانے کس کے لیے میرے گھر کا دروازہ
کھلا ہے اور مری تنہائیوں پہ ہنستا ہے

☆

دل کا لہو آنکھ سے بہا ہے
کاغذ پہ جو حرف بولتا ہے

☆

ہجوم غم سے قائم دلوں کی تنہائی
یہ بستیاں ہوئیں آباد خاک اُڑانے کو

مرزا غالب نے تو اس کے برعکس کہا تھا:۔

یونہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

ایک غزل میں، جسے ہم مسلسل غزل بھی کہہ سکتے ہیں، مشفقؔ خواجہ خود سے مخاطب ہیں۔ اس غزل میں گفتگو کا سا انداز ہے شاعر خود سے سوالات کر رہا ہے اور اس سے اس کی پریشانیوں کا سبب دریافت کر رہا ہے۔ یہ بھی اپنے غم اور اپنی پریشانی کے اظہار کا ایک اچھا اور پر اثر ذریعہ ہے جو مشفقؔ خواجہ کی اس غزل میں ملتا ہے۔

کیا بات ہے پھرتے ہو پریشاں کئی دن سے
اے مشفقؔ من سلمہٗ اللہ تعالیٰ
افسردہ و پژمردہ نظر آتے ہو ہر دم
چہرے پہ وہ رونق ہے نہ آنکھوں میں اجالا
رہتے ہو سدا شعلہ بجاں گوشے میں اپنے
پیتے ہوئے زہر غم ہستی کا پیالا
غم ہائے دروں سے ترا احوال ہے ایسا
صدموں سے عمارت کوئی جیسے تہہ وبالا

کیا ماہ وشوں سے تجھے پہنچا کوئی صدمہ
یا زہرہ جبینوں نے تجھے دل سے نکالا
کیا چھین لیا دل کا سکوں تجھ سے کسی نے
یا روٹھ گیا کوئی ترا چاہنے والا
کچھ منہ سے کہو تو کھلے احوالِ مصیبت
دکھ ایسا بھی کیا جو ہو زمانے سے نرالا

مطلع سے آخر شعر تک ایک عجیب دلگداز کیفیت اس غزل میں جاری و ساری ہے۔ کوئی مشفق، مشفق خواجہ سے مطلع میں ان سے بڑی اپنائیت اور شفقت سے مخاطب ہے اور ان سے ان کی پریشانی کا سبب دریافت کر رہا ہے۔ اپنے طور پر اس پریشانی کے اسباب کا ذکر کر کے اس کی Confirmation چاہتا ہے مگر آخری شعر میں یہ کہہ کر ایک طرح سے تسلی اور تسکین کا پہلو بھی فراہم کرنا چاہتا ہے کہ دکھ چاہے جو بھی ہو وہ زمانے سے نرالا تو نہیں ہوگا مگر دکھ اور رنج کے سلسلے میں خود مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ:۔

ہر شخص سزا وار نہیں دولت غم کا
ہر شخص کو ملتا نہیں یہ منصب عالی

☆

راہ کے مصائب سے تھک کے بیٹھنے والے
زندگی سفر میں تھی، زندگی سفر میں ہے

☆

جلوہ جلوہ رعنائی، چہرہ چہرہ شادابی
یا مری نظر سے ہے یا مری نظر میں ہے

غم و آلام کی شکایت کون نہیں کرتا۔ دکھ درد سے کون بیزار نہیں ہوتا ہے مگر کچھ لوگ آلام روزگار کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ غم عشق اور غم روزگار کو ایک عارضی حقیقت سمجھتے ہیں

اور نہایت عزم و حوصلے کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ غم کے بعد خوشی بھی آئے گی۔ اس لیے ان کی شاعری میں قنوطیت کی جگہ رجائیت کا پہلو نظر آتا ہے وہ کسی بھی حالت میں آس اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے' وہ عزم و حوصلے کے ساتھ زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔ وہ خواب دیکھنے اور دکھانے کے قائل نظر آتے ہیں۔

دل آئینہ ہے تو اس آئینے کو رونق دے
جو آنکھ دی ہے تو پھر خواب بھی دکھا کوئی

☆

بس اک کرن ہی بہت ہے ترے تبسم کی
مسافرانِ شب تار کی سحر کے لئے

☆

وقت کی آندھیاں لاکھ سرکش سہی
سرکشی کچھ انہیں کا تو حصہ نہیں

☆

جن چراغوں کو جلنا تھا جلتے رہے
رہ گزر رہ گزر جگمگاتے رہے

☆

تلخیِ زیست گوارا ہے اس احساس کے ساتھ
کہ اسی زیست سے وابستہ رہا ہے کوئی

☆

جب دل میں کوئی تازہ گلِ زخم کھلا ہے
آئندہ بہاروں کا سراغ ان سے ملا ہے

مشفق خواجہ کو شعر گوئی پر قدرت حاصل ہے مگر نہ معلوم کیوں انہوں نے جدید شعر گوئی کا

سلسلہ ترک کر دیا اس کی ایک بڑی وجہ جو مجھے نظر آتی ہے وہ ان کی دیگر ادبی مصروفیات تھیں بالخصوص تحقیقی کام۔

مشفق خواجہ کا اصل نام تو خواجہ عبدالحئی تھا مگر مشفق ان کا تخلص تھا اور وہ مشفق خواجہ کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ اگرچہ مشفق ان کا تخلص ہے مگر انہوں نے علامہ اقبال کی طرح تخلص کا استعمال شاذ و نادر ہی کیا ہے صرف ایک غزل میں انہوں نے تخلص کا استعمال کیا ہے

ہم تو مشفق کو سمجھتے تھے سمجھ دار بہت

اب تو یہ شخص بھی رہنے لگا غمگیں غمگیں

مشفق خواجہ نے مختصر بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور طویل بحروں یا زمینوں میں بھی اگرچہ طویل بحروں میں بہت کم غزلیں کہی ہیں مگر دونوں طرح کی غزلوں میں یہ خصوصیت مشترک ہے یعنی سادگی اور روانی۔ بلکہ بعض طویل بحروں میں موسیقیت یعنی غنائیت کا بھی بھرپور عنصر ملتا ہے' بعض اشعار میں لفظوں کی تکرار سے بھی حسن اور اثر پیدا کیا ہے۔ مثال کے طور پر مذکورہ بالا شعر دیکھئے اب چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جو ان کی طویل بحروں والی غزلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن میں بھرپور غنائیت اور روانی پائی جاتی ہے۔

قربتوں کی تمنا میں یہ بھی ہوا فاصلے خود بہ خود ختم ہوتے رہے

تیری یادوں سے ایسا تعلق رہا اصل کا ہو گماں جیسے تصویر پر

☆

کہیں نہ اپنی نگاہ ٹھہری کسی کو دیکھا نہ آنکھ بھر کے

نہ جانے کن منزلوں کی دھن میں گزر گئے قافلے نظر کے

☆

یوں تو کسی سے تخاطب کا موقع ملا ہم پہ خود اپنا مفہوم واضح نہ تھا

جانے کیا راز تھا جو عیاں کر گئے جانے کیا بات تھی جو چھپاتے رہے

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مشفق خواجہ نے عمدہ شاعری کی ہے اور ان کا

شار موجودہ دور کے اچھے غزل گو شعرا میں ہونا چاہیئے'' ابیات' جوان کا پہلا اور آخری شعری مجموعہ ہے وہ تمام تر ان کی غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ صنف غزل ان کی محبوب اور مرغوب صنف سخن تھی اور اس صنف میں انہوں نے شاعرانہ فن اور شاعرانہ صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن:۔ میر شناسی کے آئینے میں

اردو کے تین ممتاز اور مقتدر شعرا پر خاص طور پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ ان شعرا میں بالترتیب میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غالبؔ اور اقبال کے مقابلے میں میرؔ پر کم لکھا گیا ہے اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ میرؔ کا کلام ان دونوں شعرا کے مقابلہ میں سہل ہے مگر میرؔ کی شاعرانہ عظمت اپنی جگہ مسلّم ہے جن کا شمار اردو کے چند منفرد اور اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ ایک بار چند سال پیشتر علامہ اقبال کے سلسلے میں منعقدہ سیمینار میں شرکت کے لئے لیڈی منکاف امریکہ سے تشریف لائی تھیں۔ ٹی وی پر انٹرویو میں جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ غالبؔ اور میرؔ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتی ہیں تو انہوں نے میرؔ کا نام لیا تھا اور اس کی توجیہ بھی اس طرح کی تھی کہ میرؔ غالبؔ کے مقابلے میں آسان فہم شاعر ہیں۔ ان کا کلام جلد اور آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ میرؔ بھی ان معدودے چند شعرا میں ہیں جو مشہور ہی نہیں بلکہ لوگوں میں مقبول بھی ہیں۔ مذکورہ بالا شعراء سے متعلق جو کچھ بھی لکھا گیا ہے یا لکھا جا رہا ہے ان کو باقاعدہ میریات، غالبیات اور اقبالیات کا نام دیا گیا ہے یعنی ان سے متعلق لکھی گئی تحریریں اب ایک مکمل شعبہ کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔

میرؔ شناسی سے متعلق پہلی اہم کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ہے۔ انہوں نے انتخاب کلام میرؔ کے نام سے ایک بڑا عمدہ انتخاب پیش کیا تھا اور اس پر ایک بسیط مقدمہ تحریر کیا تھا جس میں میرؔ کی جملہ خصوصیات کا بطور احسن جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس سلسلے

میں لکھتے ہیں کہ تقریباً ساٹھ سال پہلے (اب اسے اسّی سال سمجھ لیا جائے کیوں کہ جالبی صاحب کی کتاب محمد تقی میرؔ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی) بابائے اردو نے ۱۹۲۱ء میں اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ انتخاب میرؔ کے نام سے کلیات میرؔ کا انتخاب شائع کیا جو اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ انتخاب میرؔ برِ عظیم کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔

میرؔ کے سلسلے میں بابائے اردو نے اور بھی دو اہم اور گراں قدر کام کئے ہیں یعنی ''نکات الشعراء'' شائع کیا پھر ''ذکر میرؔ'' تلاش کر کے ۱۹۲۸ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا اور بقول ڈاکٹر جمیل جالبی 'ان دونوں تصانیف کی اشاعت نے میرؔ کی شاعری کے مطالعہ کا نہ صرف رخ بدل دیا بلکہ ادب کے مورخوں کو اردو ادب کی تاریخ نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

میرؔ شناسی کے سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا کام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی کتاب ''میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری'' دراصل ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ میرؔ کے سلسلے میں یہ ایک اہم مقالہ ہے جو میرؔ شناسی میں ہمیں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دلی کالج میگزین کا ''میرؔ نمبر'' بھی اس سلسلے کی ایک قابلِ ذکر کڑی ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ مجھے تو اس کتاب پر کچھ کہنا ہے جس میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے میرؔ اور ان کی شاعری سے متعلق اپنے خیالات اور اپنی آراء کا اظہار ایک نئے انداز سے اور بڑی عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔ اس کتاب پر جابر حسین نے مختصر مگر جامع مقدمہ لکھا ہے اور میرؔ سے متعلق چند اہم اور سچی باتیں نہایت اختصار کے ساتھ کہہ دی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''میرؔ کی شاعری مجھے خاموش لمحوں کی حکایت محسوس ہوتی ہے۔ مکالمے کی زبان میں وہ ہمارے وجود کی داخلی سطحوں پر سرگوشیاں کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں'' اس کے بعد میرؔ کے چند اہم متعلقہ اشعار مثال کے طور پر پیش کئے ہیں اور پھر شکیل الرحمٰن سے متعلق کہا ہے 'شکیل الرحمٰن کی تنقید میں

حکایت گوئی کا لطف ملتا ہے۔ شائستہ مکالموں کی دھنیں اور مہذب سرگوشیاں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ "ان کی تنقید پڑھنے والوں کی تعداد میں ادھر خاصا اضافہ ہوا ہے۔" مجھے ان کی اس بات سے اتفاق ہے کہ ادھر یعنی گزشتہ چند برسوں میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی تنقید اور بالخصوص ان کی جمالیاتی تنقید کی طرف لوگوں نے توجہ دی ہے۔

مجھے اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یا اس کی اہم خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اس کتاب میں میرؔ کا ایک خاص زاویئے سے جائزہ لیا ہے۔ یعنی شرینگار رس کے حوالے سے میرؔ کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اپنی اس کتاب 'میرؔ شناسی' میں میرؔ تقی میرؔ کی جمالیات پر گفتگو کی ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ جمالیات شکیل الرحمٰن کا مخصوص شعبہ ہے انہوں نے جمالیاتی نکتۂ نظر سے اردو کے مختلف شعراء وادباء کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے اس حوالے سے ان کی مندرجہ ذیل کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

(۱) مرزا غالبؔ اور ہند مغل جمالیات (۲) اقبال روشنی کی جمالیات
(۳) ہندوستانی جمالیات (تین حصوں میں) (۴) امیر خسرو کی جمالیات
(۵) فیض احمد فیض: المیہ کی جمالیات (۶) کبیر (کبیر داس)
(۷) قرآن حکیم جمالیات کا سرچشمہ (۸) مولانا رومی کی جمالیات
(۹) تصوف کی جمالیات (۱۰) محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات
(۱۱) جمالیات حافظ شیرازی (۱۲) چند اسلامی جمالیات
(۱۳) ہندوستان کا نظام جمال: بدھ جمالیات سے جمالیات غالبؔ تک (تین حصوں میں)

ان کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں میں بھی جمالیاتی تصورات ہیں یعنی انکی اساس جمالیاتی فکر وفن پر ہے مثلاً محمد اقبال' منٹو شناسی' اختر الایمان' جمالیاتی لیجنڈ' لندن کی آخری رات' وغیرہ۔ "میرؔ شناسی" بھی جمالیاتی تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اس کتاب کے آغاز میں ہندوستانی جمالیات ''شرینگاررس'' کا ذکر کرتے ہیں اور اسی نقطہ نظر سے میؔر کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اس جمالیاتی فلسفے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔'' ہندوستانی جمالیات میں شرینگارس تمام رسوں کا سرچشمہ تصور کیا گیا ہے۔ یہ رس محبت اورغم کے جذبوں سے پیدا ہوتا ہے۔''

اس کے بعد اس فلسفے کا میر کی شاعری پر اطلاق کرتے ہوئے کہتے ہیں

''میؔر شرینگارس کے ایک ممتاز شاعر ہیں' عشق کی کارفرمائی میؔر کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ عشق میؔر کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے۔ عشق ہی محبت کے جذبے کا جمالیاتی تجزیہ ہے۔ عشق ہی شرینگار کا مرکز ہے اسی کے تحرک سے یہ رس اُبلتا ہے' اپنی شیرینی اور مٹھاس عطا کرتا ہے' غمنا کی لئے ہوئے یہ رس قاری کے جذبے کو صرف متاثر ہی نہیں کرتا بلکہ قاری کے باطن میں 'کتھارسس' کی کیفیت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ شعور' احساس' تخیل سب متاثر ہوتے ہیں''

شرینگارس کی مزید تعریف کرتے ہوئے شکیل الرحمٰن کہتے ہیں :۔

''اس اصطلاح کے متعلق ایک خیال یہ ہے کہ اس کا تعلق شر (SR) سے ہے جس کے لغوی معنی ہیں مارنا' ماردینا (Srhim Sabam) کا مفہوم ہے' اس شخصیت کا خاتمہ کہ جسے عشق کا تجربہ حاصل ہو اور وہ ختم ہو گیا یعنی عشق ختم کر دیتا ہے' مارڈالتا ہے''

اس سلسلے میں وؔلی کا یہ شعر بھی نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں

جسے عشق کا زخم کاری لگے ☆ اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

اسی سلسلے کا ایک اور شعر میر درد کا ہے۔

آتش عشق جی جلاتی ہے ☆ یہ بلا جان پر ہی آتی ہے

مگر اس عشق اور اس عشق کے جذبے کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے بھی برتا ہے مثلاً

مولانا روم کہتے ہیں:۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ☆ اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اور علامہ اقبال نے تو عشق کا مفہوم ہی بدل دیا اگر میر کے حوالے سے جو باتیں شکیل الرحمن نے کہی ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ الگ ہے۔ اس لئے شرینگار س کے حوالے سے جو بات کہی ہے اس میں وزن ہے اور اس طرح انہوں نے میر کی شاعری کا جائزہ ایک نئے انداز سے لیا ہے مگر شرینگار س کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس کا ایک مفہوم جنس یا سیکس کے اثر کو بھی ظاہر کرتا ہے وہ کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

''معروف عالم جمالیات 'ابھینو گپت' کہتے ہیں کہ لفظ شرینگار س دراصل سرنگ (Srnga) سے نکلا ہے جس کا مفہوم ہے' جس کا گہرا اثر سیکس کی جبلت پر ہو وہ تجربہ جو عشق سے حاصل ہو اور سیکس کی جبلت کو متاثر کرے وہی شرینگار س ہے''

ان دونوں مفاہیم سے متعلق شکیل الرحمن کا کہنا ہے کہ اس میں تضاد نہیں ہے اور یہ دونوں مفاہیم شرینگار کی اصطلاح کی معنویت میں کشادگی پیدا کرتے ہیں مگر میری ناقص رائے میں ان دونوں کے مفاہیم میں تضاد موجود ہے اور خاص طور پر میر کی شاعری کے حوالے سے دوسرا مفہوم درست نہیں ہے' کیوں کہ میر کی شاعری میں جنس Sex کا اثر یا اس کا اظہار اس طرح نہیں ہوا ہے جیسا کہ بعض شعرا، یا ادبا کے یہاں موجود ہے۔ چند اشعار ایسے ضرور مل جائیں گے مگر بحثیت مجموعی میر کے یہاں جنس کا اثر یا اس کا غلبہ موجود نہیں ہے' ویسے چند اشعار تو غالب' ذوق اور داغ کے یہاں بھی مل جائیں گے ہاں شرینگار کے پہلے مفہوم کا اطلاق میر کی شاعری پر ہوتا ہے اور بھرپور انداز میں ہوتا ہے اس طرح شکیل الرحمن کا اس نقطہ نظر سے میر کی شاعری کا مطالعہ بہت اہم ہے

شکیل الرحمن کہتے ہیں کہ میر کی شاعری عشق کے جذبے کی ایک ایسی شاعری ہے کہ جسے ٹھٹھک کر دیکھتے رہنے کی خواہش ہوتی رہتی ہے۔ میر کا تجربہ بھی یہی ہے کہ ''عشق ختم کر دیتا ہے جو محبت میں گرفتار ہوا وہ گیا'' یہ کہہ کر مصنف نے میر کے چند اشعار بطور مثال پیش کئے ہیں

پہلے دیوانے ہوئے پھر میر آخر ہو گئے ☆ ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

......

رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا ☆ جا چکا ہوں جہاں سے میں کب کا

......

گو بے کسی سے عشق کی آتش میں جل بجھا ☆ میں جوں چراغ گور اکیلا جلا کیا

قتل کئے پر غصہ کیا ہے لاش مری اٹھوانے دو

جان سے ہم بھی جاتے ہیں تم بھی آؤ جانے دو

اس کے بعد میر کے دو اشعار رقم کئے ہیں جو شرینگار رس کے دوسرے مفہوم کے تحت آتے ہیں اور اس سلسلے میں تقریباً ۳۴ راشعار نقل کر دیے ہیں، گو اس سے کم اشعار میں بھی ان کا مطلب نکل سکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اپنے موقف کی وضاحت میں پندرہ سے زیادہ اشعار قلمبند کئے ہیں مگر دوسرے مفہوم کے سلسلے میں جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں سے بیشتر اشعار پہلے مفہوم کے ذیل میں آتے ہیں۔ میر کے یہاں بہت کم اشعار ایسے ہیں جن کو شرینگار رس کے دوسرے مفہوم کے تحت پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں ان کی اس بات سے تو ضرور اتفاق کرتا ہوں:

''عورت اور مرد کی محبت کی شدت اور ان کی جذباتی کیفیتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ سب جو مالیاتی تجربے حاصل کرتے ہیں انہیں محسوس بھی کرتے ہیں مگر ان کا فن کارانہ اظہار تو نہیں کر سکتے، تخلیقی فن کار ہی ان جمالیاتی تجربوں کو ایسے ڈرامائی اور تمثیلی انداز میں پیش کرتا ہے کہ ان کی سطح بلند ہو جاتی ہے فن کار کے ذہن کی شادابی انہیں زندگی بخش دیتی ہے۔ شرینگار رس لیے ہوئے ایسے تمام تجربوں میں میر کے تخیل کی شادابی متاثر کرتی ہے۔''

اس حقیقت کا میر کی عشقیہ شاعری پر اطلاق ہوتا ہے مگر میر کے یہاں جنس کا اظہار اس طرح ہرگز نہیں ہوا جیسا کہ شرینگار رس کے دوسرے مفہوم کا تقاضہ ہے۔ بہرحال شکیل الرحمٰن نے شرینگار رس کے پہلے مفہوم کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں وزن ہے اور اس سے

شاید ہی کسی کو اختلاف ہو' اس حوالے سے ان کا میر کا مطالعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان کی جمالیات کا یہ حوالہ ان کے وسیع مطالعے اور جمالیات سے متعلق ان کی دلچسپی کا واضح اور بین ثبوت ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی میر کو دنیا کے عظیم تنا کے شاعروں میں شمار کرتے ہیں' وہ میر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میر کا اصل میدان غزل ہے۔ یہی وصف سخن ہے جہاں ان کو جوہر کھلتے ہیں...... غزل داخلی اور غنائی صنفِ سخن ہے اور عشق اس کا خاص موضوع ہے۔''

اردو غزل سے متعلق حالی نے بھی یہی کہا تھا کہ غزل دراصل عشق کا اظہار ہی ہے اور یہی اس کی اصل خوبصورتی ہے۔ تقریباً تمام شعرائے غزل کے اندر عشق کے مضامین کا اظہار ہوا ہے اور یہ ضروری ہے کہ غزل کی بنیاد عشق ومحبت کے مضامین پر ہی رکھی جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو غزل کی خوبصورتی باقی نہیں رہے گی' بالکل ایسا ہوگا گلاب کی رنگت تو باقی رہے گی لیکن اس میں خوشبو نہ ہو۔ (میں نے حالی کی یہ رائے ان کے الفاظ میں بیان نہیں کی ہے بلکہ ان کا مفہوم بڑی حد تک انہیں کے انداز میں بیان کر دیا ہے) ان کی اس رائے سے اب اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اب ایسی غزلیں بھی لکھی جا رہی ہیں جن میں روایتی عشق موجود نہیں ہے بلکہ اب تو غزل میں ہر طرح کے مضامین پیش کئے جا رہے ہیں مگر جہاں تک میر کی شاعری کا تعلق ہے وہ انہیں معنوں اور مفہوم میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ عشق غزل کا بنیادی اور اساسی موضوع رہا ہے۔ غزل کی پہلے تعریف بھی اس طرح کی جاتی تھی ''حرف زدن باز ناں'' پھر رفتہ رفتہ اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی یعنی جس میں عورتوں سے متعلق بات کی جائے' پھر اس کی تعریف میں تبدیلی آئی کیوں کہ اب تو ہر طرح کے موضوعات غزل کے پیرائے میں پیش کیے جا رہے ہیں مگر عشق اور معاملاتِ حسن وعشق کو آج بھی غزل کے شعرا اپنے طور پر برت رہے ہیں۔

میر کی شاعری میں عشق کا اظہار جا بجا ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''میر کی شاعری کا

محور بھی عشق ہے"۔

خالی نہیں بغل کوئی دیوان سے مرے ☆ افسانہ عشق کا ہے یہ مشہور کیوں نہ ہو

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو ☆ سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

عشق معشوق، عشق عاشق ہے ☆ یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

اور اسی عشق کے سلسلے میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کہتے ہیں۔

''دل عشق کا مرکز اور سرچشمہ ہے۔ محض یک قطرۂ خون ہے لیکن سرچشمہ توانائی ہے۔ دل کا ذکر کرتے ہوئے میرؔ نے عشق اور اس کی توانائی کا احساس بالیدہ کیا ہے''

ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرۂ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن مزید کہتے ہیں

''انسان کے وجود اور اس کے باطن کی توانائی کا احساس میرؔ کے احساس حسن کا ایک اہم پہلو ہے۔ چونکہ انسان کا دل حسن و عشق کا مرکز ہے اس لئے انسان سب سے زیادہ قیمتی ہے''

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی تنقید چونکہ جمالیاتی تنقید ہوتی ہے اس لئے وہ میرؔ کے حوالے سے ان کی شاعری میں جمالیات ہی کی جلوہ گری محسوس کرتے ہیں اس سلسلے میں ان کا یہ کہنا درست ہے

''فن کار کی سائیکی کو جو روحانی جمالیاتی انبساط اور درد کی روحانی اور جمالیاتی لذت حاصل ہوتی ہے انہوں نے اسے بڑی سادگی سے قاری کی سائیکی کو عطا کر دیا ہے''

اس سلسلے میں مجھے ان کا شعر یاد آ رہا ہے۔

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کہتے ہیں کہ میؔر کے عاشق کا جمالیاتی شعور بالیدہ ہے یہی وجہ ہے کہ حسن کا احساس مجسم ہو جاتا ہے مگر اس کے بعد میؔر کے جو دو اشعار نقل کئے ہیں ان میں سے ایک شعر کا مفہوم ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں وہ سمجھتے ہیں' وہ شعر ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری کا

اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ آفاق کی شیشہ گری کہہ کر (میؔر نے) زندگی کے حسن و جمال کو جس طرح سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہ بہت بڑی بات ہے۔ نازک' شفاف اور رنگ برنگے شیشوں کی یہ دنیا انتہائی خوبصورت اور حسین ہے۔ یہاں زور سے سانس لئے جائیں تو شیشے چٹک جائیں گے' مگر میؔر کے اس شعر میں شیشے سے مراد' شیشۂ دل'' ہے۔ میؔر نے دنیا کو شیشے کے کارخانے سے تشبیہ دی ہے۔ مشابہت کی وجہ دونوں معاملات کی نزاکت ہے' شیشے کے کارخانے میں ذرا سی غفلت برتی جائے تو کوئی نہ کوئی شیشہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح دنیا میں ذرا سی لاپروائی سے کسی نہ کسی کے دل کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ یہاں کے معاملات اتنے نازک ہیں کہ ذرا سی غفلت سے کسی کی دل شکنی ہو سکتی ہے۔

میر انیسؔ نے بھی اسی بات کو اس انداز سے کہا ہے۔

خیالِ خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بہر حال ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے جو دوسرا شعر اس سلسلے میں نقل کیا ہے وہ درست اور مناسب ہے۔

کیا صورت ہے کیا قامت ہے دست و پا کیا نازک ہیں
ایسے پتلے منہ دیکھو جو کوئی گلال بنا دے گا

عاشق کے حوالے سے شکیل الرحمٰن نے جو حسن پسندی کے اشعار پیش کئے ہیں ان شعروں میں محبوب کا سراپا جھانکتا ہوا نظر آتا ہے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

کیا چہرہ تجھ سا ہوتا اے آفتاب طلعت — منہ چاند کا جو ہم نے دیکھا تو چھائیاں ہیں
(چہرہ)

میر کیا بات اس کے ہونٹوں کی — جینا دوبھر ہوا مسیحا کا
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
(لب و ہونٹ)

گزرا میں اس سلوک سے دیکھا نہ کر مجھے — برچھی سی لاگ جا ہے جگر میں تری نگاہ
(نگاہ)

اس سے یوں گل نے رنگ پکڑا ہے — شمع سے جیسے لیں چراغ لگا
(بدن کا رنگ)

ہلتی ہے یوں پلک کہ گڑی دل میں جائے ہے — انداز دیدنی ہے مرے دل نواز کا
(انداز دیدنی)

اس لطف سے نہ غنچۂ نرگس کھلا کبھو — کھلنا تو دیکھ اس مژۂ نیم باز کا
(مژہ)

ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشک یاسمن — کم گوشۂ چمن سے تری رہ گزر نہیں
(نقش پا)

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے — کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اسکے بدن کے ساتھ
(لباس)

ان حوالوں سے بقول شکیل الرحمٰن ''گوشت پوست کا ایک دلنواز اور دلکش اور انتہائی پرکشش پیکر خلق ہو جاتا ہے''

وہ میرؔ کو ایک مسرت آمیز احساسات کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ شرینگارس کے حوالے سے کہتے ہیں:۔

''میرؔ کے عاشق کے حسن اور جمالیاتی تجربے شرینگارس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ احساس حسن' رومانیت' غمناکی' عشقیہ تجربے یہ سب عاشق کے حسی اور جمالیاتی تجربوں میں شامل ہیں۔ میرؔ مسرت آمیز احساسات یا Pleasuranie Sensations کے ایک منفرد شاعر ہیں''

میرؔ کے بعض اشعار کی تشریح وہ تمثیل کے حوالوں سے بھی کرتے ہیں اور بعض اشعار کی تشریح کرتے ہوئے مختلف روایت' تاریخی حوالوں اور فکر و فلسفہ سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح جہاں ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں وہ شعر کی تفہیم اور اس کی معنویت میں حسن و دلکشی پیدا کرتے ہیں مثلاً وہ میرؔ کے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے کیسے کیسے حوالے دیتے ہیں اور کس موثر اور دلنشیں انداز میں اپنی بات قاری تک پہنچاتے ہیں

ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میرؔ ☆ زمیں و زماں ہر زماں اور ہے

اس سلسلے میں شکیل الرحمٰن کہتے ہیں

''گوتم بدھ نے کہا تھا تم ایک ہی ندی میں دوسری بار قدم نہیں رکھ سکتے اس لیے کہ تم بدلتے رہتے ہو۔ ہر دوسرے لمحے انسان خود ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ جین ازم کے مطابق چراغ کی لو ہر لمحہ تبدیل ہوتی ہے' یکساں نہیں رہتی' روشنی کا تسلسل تو قائم رہتا ہے لیکن لو میں تبدیلی بھی مسلسل ہوتی رہتی ہے ہر لمحہ کی صورت بدل جاتی ہے...... گوتم بدھ کی بات اس بات سے مختلف ہے کہ ندی یکساں نہیں رہتی ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے' ایک ہی ندی میں دوسری بار قدم نہیں رکھ سکتے اس لیے کہ ندی

بدل جاتی ہے۔ان باتوں کی روشنی میں میرؔ صاحب کے پہلے شعر (یعنی اس شعر) کو پڑھیے تو احساسِ جمال کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ ہوگا' ہر لمحہ بدلتے ہوئے رنگ کا یہ انتہائی خوبصورت احساس ہے۔''

میرؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ کہتے ہیں

''میرؔ کی شاعری میں غم ایک گہرا جذبہ ہے جس کا ایک خوبصورت جمالیاتی استعارہ لہو ہے''

اور پھر وہ میرؔ کے غم کا غالبؔ کے غم سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''غالبؔ کی شاعری میں غم ہمہ گیر ہے اور لہو ایک آرچ ٹائپ۔ غالبؔ کی شاعری میں لہو کے آرچ ٹائپ کے ابھرتے ہی تجربوں کا رنگ مختلف ہو جاتا ہے''

اس کے بعد وہ غالبؔ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرنے لگتے ہیں اور غالبؔ کے کلام پر گفتگو کا سلسلہ اچھا خاصا طویل ہو جاتا ہے یعنی انہوں نے بیس سے زیادہ صفحات پر غالبؔ کے کلام کا جائزہ پیش کیا ہے' وہ اگر اس سلسلے میں اختصار سے کام لیتے تو بہتر تھا کیوں ان کا اصل موضوع میرؔ ہیں غالبؔ نہیں۔اس کتاب (مختصر کتاب) میں ایک تہائی حصے پر غالبؔ کا ذکر مختلف حوالوں سے آتا ہے نیز ان کے اشعار کے حوالے بھی کثرت سے دیئے ہیں۔میرؔ و غالبؔ کی شاعری کا تقابل کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں

''غالبؔ کا جمالیاتی شعری تجربہ کتنا قیمتی' کتنا اہم اور کس قدر بلند ہے۔ المیہ تجربوں میں بھی غالبؔ وہاں ہیں کہ جہاں اردو کا کوئی شاعر پہنچ نہ سکا' وہ میرؔ ہی کیوں نہ ہوں۔اس طرح میرؔ کی بڑائی اور عظمت کم نہیں ہو جاتی۔میرؔ غالبؔ کے پیشرو ہیں غالبؔ نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے''

اس کے بعد میرؔ کے تغزل کے حوالے سے تعریف کرتے ہوئے ان کے اس نقص یا عیب کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنے مضامین کو دہراتے رہتے ہیں بلکہ ایک مضمون کو کئی بار مختلف

انداز سے دہرایا ہے۔ یہ اگر نقص ہے تو یہ نقص دیگر شعرا کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ نقص غالبؔ کے یہاں کم ہے مگر میرؔ کے یہاں زیادہ ہے۔ غالبؔ جب کسی مضمون کو دہراتے ہیں تو اس میں نئی بات پیدا کر دیتے ہیں جسے ہم ان کی شاعرانہ فن کاری کی عمدہ مثال کہہ سکتے ہیں جبکہ میرؔ کے یہاں وہ ہمیں محض تکرار نظر آتی ہے جو بعض اوقات شعری حسن سے بھی خالی ہوتا ہے شکیل الرحمٰن اس سلسلے میں کہتے ہیں۔

''میرؔ نے تغزل کی آبیاری میں زبردست حصہ لیا ہے۔ شرینگار رس کے تجربوں کے ایک ممتاز شاعر ہیں لیکن اور بھی کچھ سچائیاں ہیں مثلاً یہ کہ وہ اپنے تجربوں کو بار بار مختلف انداز سے دہراتے رہتے ہیں۔ ایک ہی خیال کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری جہت دار اور پہلو دار نہیں ہے''

شکیل الرحمٰن بڑی شاعری کی پہچان کراتے ہوئے کہتے ہیں

''میرؔ کے کلام میں ڈرامائی کیفیتیں تو موجود ہیں مگر وہ ڈراما نہیں ہے جو غالبؔ کے فن میں ہے۔ غالبؔ کے یہاں تو شاعری پہلے ڈراما بنتی ہے اور پھر فکشن بن جاتی ہے یہ بڑی شاعری کی پہچان ہے۔''

شکیل الرحمٰن فکشن کے باب میں بھی الیہ انداز اور ڈرامائی انداز کو بہت اہمیت دیتے ہیں سعادت حسن منٹو کے افسانہ ''کھول دو'' کے سلسلے میں لکھتے ہیں

''میرے خیال میں تقریباً ہر اچھی کہانی کی اپنی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کا اختتام ایسے ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے کہ قاری حیران و ششدر رہ جاتا ہے''

اسی طرح وہ منٹو کے افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ قصہ تمثیل کا اثر لیے ہوئے ہے۔ تمثیل کے جوہر نے اس کہانی کو ڈراما بنا دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑا تخلیقی فن ڈراما ہی ہوتا ہے۔ اس طرح شاعری ہو یا افسانہ وہ کامیاب اور عمدہ تخلیق کو ڈراما اور فکشن کی سطح پر لے جاتے ہیں۔''

آخر میں شکیل الرحمٰن نے غزل کے فارم اور ہیئت کی بھی بات کی ہے اور اس سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے وہ کہتے ہیں:

''جو لوگ غزل کی مخالفت کرتے ہیں وہ فارم اور ہیئت کے چکر میں زیادہ رہتے ہیں۔ان کے لیے غالبؔ کی غزلیں ایک جواب کی صورت بھی ہیں اور ایک چیلنج کی صورت بھی۔ جو لوگ اپنی نظم نگاروں کی فہرست بناتے رہتے ہیں یہ دعویٰ کر ہی نہیں کر سکتے کہ ان کا کوئی بھی نظم نگار عمدہ اور جمالیاتی تجربوں کے پیش نظر غالبؔ کے پاس کھڑا ہے یا ان کے کلام کا تاثر غالبؔ کے کلام سے بہتر ہوتا ہے۔ اردو نظم میں اقبال کے علاوہ تو ابھی تک کسی قد آور فن کار نے جنم ہی نہیں لیا ہے۔''

شکیل الرحمٰن کی اس رائے سے اختلاف کی بہت کم گنجائش ملتی ہے۔اپنی بات بلکہ اپنی کھری کھری بات کا اظہار نہایت جرأت کے ساتھ کر گئے ہیں نیز یہ پیش بندی اور آئندہ کی صورت حال کی طرف بھی واضح اور مثبت اشارہ کر گئے ہیں یعنی ادبی تنقید کے حوالے سے وہ کہہ گئے ہیں:

''ادبی تنقید میں جب تجربوں کے پیش نظر آہنگ اور لفظوں کی شعاعوں کی کیفیتوں کا مطالعہ شروع ہوگا تب ہی سچائی کا زیادہ بہتر علم ہوگا۔''

الغرض یہ مختصر کتاب میرؔ کے سلسلے میں بڑی مفید اور معلوماتی کتاب ہے۔اس میں میرؔ کا مطالعہ ایک نئے انداز میں کیا گیا ہے جس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔نیز شاعری اور بالخصوص میرؔ اور غالبؔ کے سلسلے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اپنا الگ وزن رکھتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرؔ ہی نہیں بلکہ غالبؔ کے کلام شائقین اس کتاب کو ایک مفید، معلوماتی اور کارآمد تصنیف قرار دیں گے۔

☆......

پروفیسر طرزی کا طرزِ خاص

طرزیؔ صاحب کا نیا طرز مجھے خاص طور پر بہت پسند آیا۔ ان کا یہ طرز خاص یعنی منظوم تجزیے یا جائزے لکھنا اگرچہ کوئی نئی بات نہیں مگر انہوں نے جس خصوصیت اور منفرد انداز میں اس فن کو اپنایا ہے اور جس کثرت سے اپنی تخلیقات اس طرز اور اس رنگ میں پیش کی ہیں وہ اسلوب ان کے لئے وجہ شہرت بن گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزیؔ نے جس انہماک اور اختصاص کے ساتھ منظوم تبصرے، جائزے اور تنقید نگاری کو اشعار کے پیراہن میں پیش کیا ہے وہ قابل توجہ بھی ہے اور قابل داد بھی۔

ان کی ایک منظوم کتاب ''رفتگاں و قائماں'' میری نظر سے گزری تھی (میں نے اس پر تبصرہ بھی لکھا تھا) اس کتاب میں انہوں نے شہر دربھنگہ کی ادبی و علمی تاریخ لکھ ڈالی ہے۔ دربھنگہ کے شعرا و ادبا، اور مشاہیر کا جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ انہوں نے منظوم تذکرہ لکھا ہے نہ صرف اہل دربھنگہ کے لئے بلکہ اردو ادب کی تاریخ میں یہ کتاب اپنا مقام حاصل کر گئی ہے۔ اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ان کا یہ کام ایک قابل قدر کارنامہ سمجھا گیا۔ اس سے پہلے ایک مختصر منظوم تذکرہ (مسدس کی شکل میں) حرمت الاکرام کی کتاب ''کلکتہ اک رباب'' میری نظر سے گزری تھی مگر اس کتاب اور طرزی صاحب کی کتاب میں جو فرق ہے وہ صرف ضخامت ہی کا نہیں بلکہ موضوع کا فرق بھی ہے۔ کلکتہ اک رباب میں کلکتہ کی ثقافتی، ادبی، سماجی، تہذیبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے یعنی اسے ہم صرف ادبی تاریخ یا تذکرہ نہیں کہہ سکتے بقول ڈاکٹر اختر اورینوی شہروں پر نظمیں لکھنے کی روایت اب مستحکم ہو گئی ہے۔ اردو میں نہ صرف دہلی، لکھنؤ، بمبئی، عظیم آباد، دکن پر بلکہ ماسکو، لندن اور پیرس پر بھی اچھی اور قابل توجہ نظمیں لکھی گئی

ہیں۔ مگر بات پھر وہیں آتی ہے کہ ان کو ہم منظوم ادبی تبصرہ نہیں کہہ سکتے۔ چند سال پہلے سہیل غازی پوری نے بھی اس طرح کا سلسلہ شروع کیا تھا اور ان کی اس موضوع پر ایک کتاب ''باتیں سخن وروں کی'' منظر عام پر آئی تھی۔ اس طرح منظوم تبصرے سہیل غازی پوری اب بھی لکھ رہے ہیں مگر انہوں نے منظوم تذکرہ نہیں لکھا ہے جبکہ طرزی صاحب کو اس سلسلے میں یہ اختصاص حاصل ہے کہ انہوں نے کئی منظوم ادبی تبصرے اور تذکرے لکھے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ادب پاروں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ ان کے تبصرے جائزے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور کہیں کہیں منظوم تنقید کی شکل بھی۔

منظوم تبصرے اور جائزے لکھنا کوئی آسان کام نہیں مگر کچھ لوگوں کو یہ فن آتا ہے اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ منظوم تبصرے لکھے ہیں بلکہ ادیبوں اور ادب پاروں کا تنقیدی جائزہ بھی نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ایسے ہی خال خال اور قابل ذکر لوگوں میں پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالمنان طرزی کا شمار ہوتا ہے۔

ان کے ایک اہم منظوم تذکرے ''رفتگاں و قائماں'' کا ذکر کر چکا ہوں جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے دربھنگہ کے شعراء و ادباء کا ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب میں ان شعرا اور ادبا کا بھی ذکر ہے جو ابھی بقید حیات ہیں اور شعر و ادب کی تخلیق میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد مجھے ان کے چند منظوم تبصرے اور جائزے مختلف ادبی جرائد میں پڑھنے کو ملے اور ان منظوم تبصروں میں نہ صرف دربھنگہ اور اس کے گرد و نواح کے شعراء اور ادبا ان کے مدنظر رہے بلکہ دربھنگہ سے باہر کے شاعروں اور ادیبوں اور ان کی تخلیقی کاوشوں پر لکھا ہے جن میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے بھی کچھ شعراء اور ادباء شامل ہیں۔ پروفیسر طرزی صاحب اب منظوم تبصرے لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بڑی مہارت اور پر گوئی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

اگر میں ان کی منظوم کاوشوں کا ذکر کروں اور ان کے صرف نام گنواؤں تو یہ مضمون خاصا طویل ہو جائے گا اور سر دست یہ مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا مگر ایسی چند نظموں کا ذکر بلکہ

حوالے بھی دوں گا تا کہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اس فن میں کتنی مہارت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ان کی منظوم تبصرہ نگاری اور جائزہ نگاری کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو اس میں چار طرح کی نظمیں نظر آتی ہیں۔ایک وہ نظمیں ہیں جن کو ہم تبصرہ نگاری میں شمار کریں گے دوسری قسم ان نظموں کی ہے جن میں جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ادبی تخلیق کا تجزیہ کیا گیا ہے تیسری قسم ان نظموں کی ہے جن میں جائزہ کے ساتھ ساتھ تنقید کی سرحد بھی ملتی ہے۔اس طرح کی نظموں کی ایک چوتھی قسم وہ ہے جن میں شخصیت کے حوالے سے بات کی گئی ہے مثلاً ان کی نظم ''خامہ گوش'' کو ہم اس ضمن میں رکھ سکتے ہیں۔یہ نظم مشفق خواجہ کے انتقال پر لکھی گئی ہے۔اس میں مشفق خواجہ کی شخصیت' ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا ذکر کیا گیا ہے اس نظم کے چند اشعار دیکھئے۔

حق شعار وحق نگار وحق زباں خامہ بگوش — خوش نوا و خوش خیال و خوش بیاں خامہ بگوش

افتخار دیدۂ دیدہ وراں خامہ بگوش — طرۂ دستار فرق شاعراں خامہ بگوش

جلوہ ' اقدار ہستی کے کلیم باخبر — واقف رمز حیات جاوداں خامہ بگوش

☆

معبد تحقیق کے سجدہ گزار وضع دار — کعبۂ تنقید میں صوت اذاں خامہ بگوش

آپ سے طنز وظرافت کو ملا معیار اک — دشت بے پایاں میں شاخ آشیاں خامہ بگوش

☆

ہو 'سخن' پر 'در سخن' کہ ہو 'سخن ناگفتنی' — تابش احساس کی رعنائیاں خامہ بگوش

آپ سے کالم نویسی کو ہے عظمت وہ ملی — مستند ہیں ساری محشر خیزیاں خامہ بگوش

کیفیت ایسی غزل میں ہے جمال فکر کی — کر گئے لفظوں سے تعبیر جناں خامہ بگوش

آپ سے ترتیب اور تدوین بھی ہے معتبر — یعنی تحقیق مدلل کا جہاں خامہ بگوش

آپ نے اپنے قلم سے کام ایسا بھی لیا — کھنچ گئیں کچھ ابروؤں کی ہیں کماں خامہ بگوش

وہ ادارت کی ہے 'تخلیقی ادب' کی آپ نے — پتھروں کی ہے رگوں میں خوں رواں خامہ بگوش

میں نے ۱۲۸ اشعار میں سے صرف گیارہ شعر نقل کئے ہیں مگر ان منتخب اشعار میں بھی ان کی ایک جامع تصویر نظر آ جاتی ہے۔ اور ان کی بیشتر اہم خوبیوں اور اوصاف پر یہ اشعار روشنی ڈالتے ہیں۔

اس طرح اپنی نظم' سجاد ظہیر پنی تصنیفات اور تالیفات کی روشنی میں'' ان کی تحریک کے حوالے سے ان کی مصروفیات' ان کی تصنیفات مثلاً لندن کی ایک رات؛ (ناولٹ) روشنائی' ذکر حافظ اور پگھلا نیلم' کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ایک مختصر نظم وہاب اشرفی کے حوالے سے بھی لکھی ہے اور یہ نظم فنی اعتبار سے صنعت حرفیہ میں لکھی گئی ہے اس نظم میں ڈاکٹر وہاب اشرفی کی علمی و ادبی خصوصیات کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

ایک نظم شاعر غزالاں۔ حفیظ بنارسی سے متعلق ہے جس میں ان کی غزل گوئی کی تعریف دل نشیں انداز اور پر اثر انداز میں کی گئی ہے اس صنف میں غزل کی تعریف کا بھی پہلو نکلتا ہے یعنی غزل کی خوبی اور اس کی خصوصیات کا ذکر دلنشیں انداز میں ملتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے جن میں غزل اور حفیظ بنارسی کی تعریف میں یہ اشعار شامل ہیں۔

پاتی ہے جس سے روشنی تاریکیٔ حیات — پوشیدہ ہیں غزل ہی میں ایسی تجلیات
قطرات اشک بنتے گہرہائے آبدار — صنف غزل کو ایک یہ حاصل ہے افتخار
اک کیف اشتیاق غزل ہے حفیظ کی — تسکین دل فگار' غزل ہے حفیظ کی
اک موج انبساط' غزل ہے حفیظ کی — اک شرح ارتباط غزل ہے حفیظ کی
آئینہ آگہی کا غزل ہے حفیظ کی — دستور شاعری کا غزل ہے حفیظ کی
تہذیب علم و فن ہی' غزل ہے حفیظ کی — آرائش چمن ہی' غزل ہے حفیظ کی

پروفیسر عبدالمنان طرزی نے ایک منظوم مقالہ بھی لکھا ہے جس کا عنوان ہے'' پریم چند کل' آج اور کل بھی'' جوان سے متعلق ہونے والے سیمینار میں پڑھا تھا۔ اس منظوم مقالے میں پریم چند سے متعلق تمام اہم باتوں کا اس طرح تذکرہ کیا گیا ہے کہ یہ منظوم مقالہ بہت ہی مفید اور

معلوماتی بن گیا ہے۔ اس ایک تنقیدی منظوم مقالہ بھی کہا جا سکتا ہے جہاں انہوں نے پریم چند کے مختلف کرداروں کا ذکر کیا ہے اور اچھے کردار کی تعریف کی ہے وہاں اگر ان کو کوئی نقص یا خامی نظر آئی ہے تو اس کا بھی ذکر کر دیا ہے مثلاً یہ اشعار دیکھئے:۔

خیر اور صلاح کے جذبوں سے وہ خالی نہ تھا — گا ہے کچھ کمزور اور کچھ ڈھیلے جملے لکھ گیا

ہوتی ہے فن کار سے کمزوری یہ سرزد بھی کب — فن سے زیادہ اپنے مقصد پر نظر آتا ہے جب

اسکے افسانوں میں بے شک مقصدی تعمیر ہے — ایسی کوتاہی کی حامل اس لئے تحریر ہے

ڈالتے ہیں اس کے میدان عمل پر جب نظر — پاتے اصلاحی نظریئے کی اساس معتبر

اس نے ہر کردار کو اپنے مثالی کر دیا — اس عمل نے لطف سے ناول کو خالی کر دیا

اسی طرح ان کے ناول ''چوگان ہستی'' کے بارے میں کہتے ہیں:۔

بعض موقعوں پر گزرتی ہے گراں تفصیل بھی — ماجرا سازی میں یہ خامی رکاوٹ ہے بنی

ایسی ہے تبلیغ اس میں نفسیات' اخلاق کی — اچھا ناول بننے سے محروم یہ کاوش رہی

اس منظوم مقالے کی ابتدا خوبصورت انداز میں ہوتی ہے۔ اس ابتدائیہ کو آپ ایک اچھی تشبیب کہہ سکتے ہیں:۔

پاتا ہے فنکار جس سے وہ زندگی دائمی — ہے وہ دولت' دیدۂ بینا دل حساس ہی

ان سے فہم و فکر ہوتی ہے بصیرت آشنا — ان ہی سے تخلیق ہوتی ہے حقیقت آشنا

ان سے علم و آگہی کا فن میں جلتا ہے چراغ — اور صحرا کی زمیں کو یہ بنا دیتے ہیں باغ

ان سے ہی فنکار پہ کھلتے ہیں اسرار حیات — ان سے ہی تاریک شب پا جائیں انوار حیات

روئے فردا جس کو دکھلا دیں یہ چشم حال سے — ''عندلیب گلشن ناآفریدہ'' وہ بنے

دشت امکاں بھی نظر آئے جسے اک نقش پا — وہ تمنا کا قدم ڈھونڈے نہ کیسے دوسرا

اس کے بعد یعنی دو اشعار کے بعد گریز سے کام لیا گیا ہے:۔

ذات ایسی ہی پریم چند کی تھی بے گماں — وہ رموز ہستی کا تھا ایک مخلص رازداں

تھا ترقی ادب کا دل میں جذبہ موجزن　　　کچھ مصنف کی بنی اردو کے تب اک انجمن

☆

ہے قلم میں اس کے حرکت نبض ہستی کی طرح　　　راستی فن میں ہے اس کے حق پرستی کی طرح

بارہ ناول اور کہانی تین سو کے قریب　　　اس نے لکھے ہیں ڈرامے بچوں کا بھی تھا ادیب

بارہ میں اک نامکمل' اس کا منگل سوتر بھی　　　زندگی ہے اس کا فن اور فن ہے اسکی زندگی

اور آخری اشعار میں طرزی صاحب نے ان حقائق کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس کی تخلیقات اسکے عہد کی تصویر ہیں　　　اس کے مرقومات کیا ہیں تابش تقدیر ہیں

منظر مستور کو لے آیا وہ پیش نظر　　　اک جہان نور کی مجبوروں کو دی ہے اس نے خبر

خواب سے بیدار محکوموں کو اس نے کر دیا　　　ہاں وطن آزاد کا قصہ نہیں وہ لکھ سکا

طرزی صاحب نے بے شمار منظوم تبصرے کتابوں پر ان کے مصنفین کے حوالے سے لکھے ہیں جو ہندوستان (اور پاکستان کے بعض مقتدر) رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں' جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں۔ ہر تبصرے پر تبصرہ کرنا یا ان پر کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ چند تبصروں کا ذکر بطور خاص کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے جو تبصرے ڈاکٹر حنیف ترین' کمال جعفری' ترنم ریاض' اچاریہ شوکت خلیل' عبدالرحمٰن' نسیم احمد نسیم' مبینہ امام' سید احمد شمیم' منظر شہاب' ڈاکٹر ہمایوں اشرف' محمد سالم' جمال اویسی' حقانی القاسمی' فراغ روہوی' مغیث الدین فریدی' ڈاکٹر شیخ عقیل احمد' ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی' نذیر فتح پوری' حامدی کاشمیری' ظہیر غازی پوری' ڈاکٹر قمر رئیس اور دیگر مشاہیر شعر و ادب پر لکھے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان تبصروں کے مطالعے سے ان مصنفین کے بارے میں بہت سی اہم باتیں اور ان کی نثر نگاری یا شاعری کی خصوصیات کا علم قاری کو ہو جاتا ہے۔ تبصرے آسان اور رواں زبان میں لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے میرے مجموعہ ''عقیدت کا سفر'' پر بھی منظوم تبصرہ کیا ہے (ا۔ا۔ش)

جیسا کہ میں ابتدا میں لکھ چکا ہوں کہ ان کے تبصرے کے موضوعات میں بھی تنوع ہے۔

ان کی تبصرہ نگاری عام تبصرہ نگاری سے علیحدہ ہے۔ ان تبصروں کا انداز اور رنگ جدا ہے۔ طرزی صاحب نے نہ صرف کتابوں پر تبصرے کئے ہیں بلکہ بعض رسائل اور جرائد پر بھی تبصرے کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو خاص نمبر ہیں اور کچھ عام شمارے۔ انہوں نے جن رسالوں پر تبصرے کئے ہیں ان میں سے وقت 'تمثیل نو (سہ ماہی)' انشا کا نارنگ نمبر اور چند دیگر رسائل شامل ہیں۔ ملت کالج دربھنگہ' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام سہ روزہ سیمینار بہ عنوان 'فروغ اردو کے لئے نئی حکمت عملی' پر ایک منظوم مقالہ لکھا تھا' اس میں اردو کی ابتدا نیز اردو کے اہم شعراء کا بطور خاص ذکر کیا ہے مگر اردو کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے اور جس سست رفتاری سے اس کا شکوہ بھی کیا ہے مگر اس کے باوجود انہوں نے نا امیدی کا اظہار نہیں کیا۔

اعلی منصوبے تو کاغذوں پہ بنے   فائلوں میں رہے خواب کتنے دبے
تازہ منصوبے بن جائیں گے آج بھی   اردو پھر مرثیہ پڑھتی رہ جائے گی
ہے حقیقت مگر آج تک کی یہی   اردو نکھری مزاحم سے کچھ اور بھی

انہوں نے ایک منظوم مقالہ ''ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصنیفات پر ایک نظر'' کے عنوان سے لکھا جو انہوں نے ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی کے زیر اہتمام ہونے والے سیمینار میں جسکا عنوان تھا ''اردو کی نئی بستیاں'' پڑھا بھی۔ طرزی صاحب اردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبان پر بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس مقالے کی ابتدا میں فارسی کا ایک قطعہ بھی اس کی مناسبت سے کہا ہے جو یہ ہے:۔

حشر خیزی را تقی داند تماشہ معتبر   از متاع سوختہ پیدا کند تازہ سحر
او کہ صد رقص جنوں بیند تہہ داماں خویش   جستجویش خود بجوید جادہ و منزل دگر

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاک و ہند کے بہت سے ادیب اور شاعر بیرون ملک آباد ہیں اور اپنی اپنی بساط کے موافق زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے بھی بیرون ملک ادیبوں پر لکھنے کا ارادہ کیا ہے جس کا عنوان رکھا ہے ''روشن ہے بزم غیر ہمارے چراغ سے''

اس منظوم مقالے میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف اس طرح کرایا ہے:۔

بستیاں آباد اردو کی ہوئیں جن سے نئی ایسے خوش بختوں میں ہیں سید تقی عابدی
پیشہ ہے گرچہ طبابت ہیں وہ ایم ایس ڈاکٹر درد سے زیادہ ہے ان کی لفظ و معنی پر نظر
غالب و سودا کی دہلی آپ کا مولد بھی حیدرآبادی ہے ڈگری ایم بی بی اس آپ کی
ڈگری ایم ایس کی لی برطانیہ سے آپ نے ایف سی اے پی آپکو حاصل ہوئی امریکہ سے
اب تو وہ ٹورنٹو یعنی کناڈا کے ہوئے اور اردو کی نئی بستی کے محور بن گئے
لائبریری ذاتی ہے ٹورنٹو میں آپ کی جس میں مخطوطے ہیں چودہ سو بیاسی

انہوں نے نظم ''متھلا میں اردو نثر کا ارتقاء'' کے نام سے بھی لکھی ہے۔ دراصل اس طویل نظم میں متھلا میں اردو نثر نگاری کا ارتقائی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے متھلا میں اردو کی مختصر تاریخ اور وہاں کی نثر نگاری کے ارتقاء کی کہانی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور افادیت کی بھی حامل ہے۔ یہ نظم سات فل اسکیپ کاغذوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اختصار سے وہاں کی اردو نثر نگاری کا منظوم جائزہ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ......

جائزہ لیتا ہوں آفاقی ادب کا میں اگر بیشتر کا پاتا ہوں شعروں سے آغاز سفر
لازمی ہے بھی نہیں ایسا کوئی کلیہ کچھ زبانوں میں تو پہلے نقش نثری ہے بنا

☆

جودھیا پرشاد جن کا ہے تخلص بھی بہار نقش اوّل ہے ''ریاض تربیت'' ان کا افتخار
گر کی انیس سو میں رہتی ہے بنیس کی ہے گماں سال طباعت جانئے اس کا یہی
اور وہ '' آئینہ تربت'' بہاری لال کی معتبر تاریخ کی تصنیف ہے دوسری

ان کے ان اشعار سے متھلا میں اردو نثر کے آغاز ہی کا صرف پتہ نہیں چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو نثر کے اوّلین خادمین میں سے دونوں ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اس طرح یہ منظوم تاریخ اردو نثر (متھلا میں) اپنی نوعیت اور تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت

کی حامل ہے۔اس تاریخ کو اگر کوئی نثر میں لکھنا چاہے تو اسے کم از کم چالیس، پینتالیس صفحات درکار ہوں گے یا ہوسکتا ہے اس سے بھی زیادہ صفحات کی ضرورت پیش آ جائے۔ نظم میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور یہی کام طرزی صاحب نے کیا ہے مگر ان کے اختصار میں اجمال کی خوبی موجود ہے۔

مختصر طور پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ طرزی صاحب کے یہ تمام منظوم تبصرے اور جائزے اگر کتابی صورت میں چھپ جائیں تو اردو کے قارئین اس کو بہت دلچسپ پائیں گے اور اس سے ادب کے شائقین اور طلبا فیض یاب ہوں گے۔

☆......☆

مناظر عاشق ہر گانوی اور بچوں کا ادب

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو میں بچوں کے ادب کا سرمایہ بہت قلیل اور مختصر ہے دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ادیبوں نے بچوں کے ادب پر بہت کم توجہ دی ہے۔ مگر اس کے باوجود اردو زبان میں ایسے شاعر و ادیب مل جاتے ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے بلکہ بعض ادیبوں اور شاعروں نے تو اپنی تمام تر صلاحیت اور قوت بچوں کے ادب ہی تخلیق کرنے میں صرف کر دی۔ اس سلسلے میں اسمٰعیل میرٹھی کا نام سرفہرست ہے۔ شفیع الدین نیر نے بھی بچوں ہی کے لئے لکھنا پسند کیا چناں چہ وہ بچوں کے ہی شاعر سے موسوم ہوئے۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال نے بھی بچوں کے لیے اور بچوں سے متعلق بڑی عمدہ اور پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنے والوں کی تعداد کم ضرور ہے مگر ہر دور میں بچوں کے لیے شاعروں اور ادیبوں نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔ خاص طور پر جب بچوں کے رسالے نکلنے لگے تو بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اس طرف توجہ دی۔ اس سلسلے میں غنچہ، کھلونا، پیام تعلیم، پھلواری اور پھول وغیرہ رسالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے کا سلسلہ کئی دہائیوں سے چل رہا ہے۔ چند بڑے افسانہ نگار جن میں کرشن چندر کا نام خاص طور پر نمایاں ہے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ اور اب تو پاک و ہند میں بے شمار کہانیاں بچوں کے لیے لکھی جا رہی ہیں۔ اس لیے اب یہ شکایت جائز نہیں ہے کہ بچوں کے لیے بہت کم لکھا جا رہا ہے مگر پھر بھی بعض افسانہ نگار یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کے لیے لکھنے سے ان کا ادبی قد و قامت کم ہو جائے گا اس لیے وہ اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر افسانہ نگار بچوں کے

لیے کہانیاں نہیں لکھ سکتا۔ جس طرح سے ہر ناول نگار ڈرامہ نگار نہیں ہو سکتا' یا ہر افسانہ نگار ناول نہیں لکھ سکتا۔ مگر کوئی شخص اگر بچوں کے لیے کہانیاں لکھ سکتا ہے اور وہ یہ سمجھ کر نہ لکھے کہ یہ افسانہ کے مقابلے میں کمتر چیز ہے تو میرے خیال میں اس کا یہ موقف درست نہیں ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ اردو میں بہت سے ادیب اور شاعر ایسے مل جاتے ہیں جنہوں نے بڑوں کے لیے بھی لکھا ہے اور بچوں کے لیے بھی۔ اس دور میں بھی بہت سے ایسے ادیب و شاعر ہیں جو بچوں کے لیے بھی لکھ رہے ہیں اور بڑوں کے لیے اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ ایسے ہی ادیبوں اور شاعروں میں مناظر عاشق ہرگانوی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے جہاں بڑوں کے لیے افسانے لکھے ہیں وہاں انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی پیاری کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھی ہیں ان پر مشتمل ایک مجموعہ "دوستی" کے نام سے ابھی حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے مگر جیسا کہ انہوں نے خود اس کے دیباچے میں "آپس کی باتیں" کے عنوان سے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۶۴ء سے بچوں کے لیے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ گویا یہ مجموعہ ان کی ۲۳ سالہ کوششوں پر محیط ہے۔ انہوں نے ۳۰ سے زائد کہانیاں لکھی ہیں اور ان میں سے صرف ۳۰ کہانیوں کا انتخاب کر کے شائع کرایا ہے

مناظر عاشق کی ان کہانیوں کو پڑھ کر یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی کہانیاں لکھتے وقت واقعی بچے بن جاتے ہیں اور یہ ایک فنکار کے لیے ضروری بھی ہے کہ وہ جس عمر کے لوگوں کے لیے کہانی لکھ رہا ہے اسے اسی سطح پر آ کر کہانی تخلیق کرنی چاہیے۔ اگر بچوں کے لیے کہانیاں لکھ رہا ہے تو اسے بچوں کی صحیح ترجمانی کرنی چاہیے یعنی وقتی طور پر اسے بچہ ہی بن جانا چاہیے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے اس کا اظہار اپنے دیباچے میں اس طرح کیا ہے:

"یہ کہانیاں اس لیے بھی پسند آئیں گی کہ لکھتے وقت میں اسی عمر کا بچہ بن جاتا ہوں جس عمر کے لیے یہ کہانیاں ہیں۔"

یہ ایک ادیب کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہ جس عمر' جس صنف' جس طبقے سے متعلق

کہانی لکھ رہا ہے‘ اسے اس عمر کے تقاضے‘ ان کی زبان‘ ان کی نفسیات اور ان سے متعلق دیگر امور اور حقائق سے کماحقہٗ واقف ہو۔ خاص طور پر بچوں کے ادیب کے لیے بچوں کی نفسیات‘ اس کے رجحانات‘ اس کی پسند اور ناپسند کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ اس طرح بچوں کا ادب وہی بہتر طور پر تخلیق کر سکتا ہے جو ان حقائق پر اپنی نظر رکھتا ہے۔ بچوں کی کہانیوں کے سلسلے میں ایک اہم عنصر کہانی کی زبان بھی ہے۔ بچوں کا ذخیرۂ الفاظ (Diction) کم ہوتا ہے۔ وہ مشکل زبان نہیں سمجھ سکتے۔ اگر کہانی کی زبان مشکل ہے اس میں ثقیل الفاظ کا استعمال ہوا ہے تو بچے ایسی تحریر پڑھنا ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ اس لیے بچوں کے لیے کہانیاں لکھتے وقت زبان کی سادگی اور سلاست کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ انداز بیان بھی سیدھا سادا ہو۔ مناظر عاشق کی کہانیاں پڑھ کر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے سلاست اور سادگی زبان کا خاص طور پر خیال رکھا ہے‘ نیز ان کے کہانی بیان کرنے کا انداز بھی دلنشین اور پراثر ہے۔

بچوں کی کہانی میں کسی فکر اور فلسفے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی باتیں یا دلچسپ حقائق سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ کہانی کا مرکز کہانی پن اور اس کی دلچسپی ہوتی ہے۔ کوئی نئی بات یا اچھی بات اسے بتانی بھی ہوتی ہے تو کہانی کو کوئی گزند پہنچائے بغیر دلچسپ انداز میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کہانی لکھتے وقت ایک خاص عمر کے بچوں کی نفسیات‘ ان کے جذبات و احساسات اور ان کی دلچسپیوں کا لحاظ بطور خاص رکھا جاتا ہے۔ زبان بھی سادہ شگفتہ ہو اور انداز بیان بھی دلنشیں ہو۔ کہانی کا دلچسپ ہونا اور ان میں نیا پن ہونا شرط اول ہے۔ ’’شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی۔‘‘ بچوں کی عمر سیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔ ویسے تو انسان ساری عمر کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے‘ مگر بچپن میں جو بات ان کے ذہن و دماغ پر بٹھا دی جاتی ہے اس کا اثر زندگی بھر رہتا ہے۔ بچپن میں جیسی ان کی ذہنی تربیت کی جائے گی ان کی سوچ اور ان کی فکر کا انداز اسی سانچے میں ڈھلے گا۔ اس لیے بچوں کے لیے کچھ لکھتے وقت اس کی علمی افادیت اور اخلاقی پہلو کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے مصنف پر یہ

فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کہانیوں کے ذریعے بچوں کو نئی اور دلچسپ معلومات بہم پہنچائے۔ اور ان کے اخلاق و کردار کو مثالی بنانے کی کوشش کرے۔ مگر یہ باتیں اسی انداز اور اسی قدر پیش کی جائیں جتنا وہ کہانی برداشت کرے۔ مناظر عاشق کی کہانی لکھتے وقت ان باتوں کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔

کہانی میں اخلاقی اور معلوماتی پہلو صرف اسی صورت میں برداشت کیے جاتے ہیں جب کہانی میں دلچسپی ہو یعنی اس میں دلچسپی کے عنصر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہو۔ اگر علمی، معلوماتی یا اخلاقی باتیں ناصحانہ انداز میں غیر دلچسپ انداز میں یا تقریر یا لیکچر کے پیرایہ میں پیش کی گئیں تو کہانی سے کہانی پن اور دلچسپی ختم ہو جائے گی اور بچے ایسی کہانی پڑھنا پسند نہیں کریں گے بلکہ ایسی کہانیوں کو ریجیکٹ کر دیں گے۔ اچھے کہانی کار اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اپنی کہانی میں اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کہانی میں دلچسپی کا عنصر باقی رہے تاکہ بچے انہیں پسند کریں۔ مناظر عاشق بھی اپنی کہانیوں میں بچے کی دلچسپی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں جنہیں بچے بڑے ذوق سے پڑھتے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی کہانی کی تکنیک سے بھی واقف ہیں اور پرانے اور روایتی انداز کی جہاں ضرورت ہوتی ہے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی ضرورت اور اہمیت سے واقف ہیں کہ آج بھی پرندوں اور جانوروں کی کہانی کے کردار کے طور پر پیش کیا جانا چاہیے، کیوں کہ بچے ان میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

بچے ایسی ہی کہانیاں پسند کرتے ہیں جن میں جانوروں اور پرندوں کا ذکر ہو اور انہیں کے ذریعے کہانی پیش کی جائے۔ مناظر عاشق کی کہانیوں کے مجموعے میں ایسی بہت سی کہانیاں ہیں

جن میں جانوروں اور پرندوں کو کہانی کا کردار بنایا گیا ہے۔ ان میں بوڑھا شیر' بندر اور شیر' مغرور گیدڑ' دوستی' بھیڑیا اور گیدڑ' چڑی مار اور توتا' زخمی چیتا' قابل ذکر کہانیاں ہیں مگر اس کے ساتھ کہانی میں جدید موضوعات اور جدید تکنیک کو بھی اپنایا گیا ہے۔ ایسی کہانیوں میں 'اسمبلی' اور 'قرض' ہیں۔ 'قرض' میں شماریات کا سہارا لے کر کہانی تیار کی گئی ہے مگر کہانی اس قدر دلچسپ اور نئے انداز سے لکھی گئی ہے کہ اعداد و شمار سے کہانی میں دلچسپی اور بھی زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایک دو کہانیوں کا انداز جاسوسی کہانیوں جیسا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کل کے بچے جرائم کی کہانیاں بھی پسند کرتے ہیں غرضیکہ مناظر عاشق نے ہر طرح کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیوں کا رشتہ روایت سے استوار اور مربوط ہے مگر ان تمام کہانیوں میں جو باتیں مشترک ہیں وہ ان کی دلچسپی اور ان کا دلکش اور دلنشیں انداز ہے جو ہر کہانی کا دل بن کر اس میں دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔

☆......☆

اصغر ویلوری ایک ممتاز رباعی نگار

اردو کی بہت سی اصناف سخن مثلاً قصیدہ، مثنوی اور غزل کی طرح رباعی بھی فارسی کے وسیلے سے اردو میں آئی ہے۔ فارسی رباعی نگاروں میں عمر خیام کا نام سرفہرست ہے۔ رباعی کو نہ صرف پاک و ہند بلکہ ساری دنیا میں مقبول اور مشہور کرنے میں عمر خیام کی رباعیات کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ فٹز جیرالڈ کے ترجموں نے عمر خیام کو ساری دنیا میں مشہور کر دیا۔ قصیدہ نگاری کا دور بادشاہت کے زوال کے بعد ختم ہو گیا۔ مگر رباعی کا فن ایسا فن ہے جو تقریباً ہر دور میں مشہور و مقبول رہا ہے۔ اردو کے تقریباً تمام ممتاز شعرا نے رباعی کہی ہے۔ رباعی گویوں میں قلی قطب شاہ کو پہلا رباعی گو شاعر کہا جاتا ہے۔ قلی قطب شاہ اور سراج اورنگ آبادی کے بعد ولی دکنی نے بھی رباعیاں کہیں۔ دردؔ، سوداؔ اور میرؔ نے اگرچہ کم رباعیاں کہی ہیں مگر ان کے یہاں بھی عمدہ رباعیاں ملتی ہیں۔ ان کے بعد حالؔی اور اکبرؔ نے بھی اچھی رباعیاں کہیں۔ ان کی رباعیاں اسکول اور کالجوں کی بعض نصابی کتب میں بھی شامل کی گئیں۔ اس صنف میں امجدؔ حیدرآبادی، فانیؔ، سیمابؔ، یگانہؔ، فراقؔ، جوشؔ اور محرومؔ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ فراقؔ نے "روپ" کی شکل میں منفرد انداز کی رباعیاں لکھ کر اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کیا مگر اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ فراق کی رباعیات پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

رباعی گوئی کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ کبھی اس کی رفتار کم بھی ہوئی مگر ہر دور میں اس صنف سخن میں بہت سے شعرا اپنے فن کا کمال دکھاتے رہے۔ عصر حاضر میں تو یہ صنف پھر مقبول ہو رہی ہے۔ اس دور میں بہت سے معروف شعرا نے رباعی گوئی کی طرف خاص طور پر توجہ

دی اور بہت اچھی رباعیاں کہہ رہے ہیں۔میرے پاس گذشتہ دس سالوں میں کئی مجموعے آئے ہیں جن میں کئی مجموعے تو تمام تر رباعیات پر مشتمل ہیں اور بعض رباعیات چند دیگر اصناف سخن کے ساتھ شامل ہیں۔میں ان میں سے چند مجموعوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔''زادسفر'' علقمہ شبلی کا مجموعہ ہے جو تمام تر حمد اور نعتیہ رباعیات پر مشتمل ہیں۔''رتیں'' ڈاکٹر محمد طاہر رزاقی کا شعری مجموعہ ہے جس میں رباعیات کے علاوہ کچھ قطعات اور ماہیے شامل ہیں۔''شہاب سخن'' پروفیسر طلحہ رضوی برق کی رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں حمدیہ' نعتیہ اور اخلاقی و اصلاحی رباعیات شامل ہیں۔فراغ روہوی کے اپنے مجموعہ کلام ''جب ہم بھی بڑے ہو جائیں گے'' میں بچوں کے لئے رباعیات ملتی ہیں۔بچوں کے سب سے بڑے شاعر اسمٰعیل میرٹھی ہیں مگر انہوں نے کوئی رباعی نہیں لکھی۔موجودہ رباعی گویوں میں ایک نمایاں نام اصغر ویلوری کا ہے۔

اصغر ویلوری نے اپنی رباعیات میں مختلف موضوعات کو نہایت ہنرمندی اور خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ان کے موضوعات میں عصری مسائل اور تقاضے بھی ہیں اور اخلاقی و اصلاحی مضامین بھی۔عام طور پر رباعی کو پند و نصیحت اور اخلاقی تعلیمات کے لیے ایک بہتر شعری ذریعہ سمجھا گیا ہے اور اب تک کی کہی گئی رباعیات میں ان ہی مضامین کی کثرت ملتی ہے اور یہ رنگ اصغر ویلوری کے ہاں بھی کثرت سے موجود ہے۔ان کے ہاں بھی قناعت' صبر و توکل کی تلقین ملتی ہے نیز بے ثباتی عالم اور فنا و بقا کا بھی درس ملتا ہے۔مثلاً ان کی یہ رباعیات دیکھئے:

ہے تجھ کو عبث ڈھلتی جوانی کا ملال
ہے عارضی دنیا میں ہر اک حسن و جمال
کوئی نہ رہا حال پہ اپنے قائم
ہر ایک کو لازم ہے عروج اور زوال

☆

تم درد کو ہی دل کا مداوا سمجھو
جو دل کے قریں ہے اسے اپنا سمجھو

کرتا ہے کوئی خوشامد کوئی محتاط رہو
ہر ٹوکنے والے کو مسیحا سمجھو

☆

میں شاہ تھا کل سچ ہے مگر آج نہیں
یہ غم نہیں اب کوئی مرا راج نہیں
مالک یہ شرف مجھ کو بتا کیا کم ہے
تیرے سوا میں اور کا محتاج نہیں

☆

جب رکھ نہیں سکتے ہو زباں قابو میں
پھر عقل بھی رہتی ہے کہاں قابو میں
تم آگ کو چاہو تو بجھا سکتے ہو
کر پاؤ گے پھر کیسے دھواں قابو میں

☆

قائم نہ رہا دہر میں کوئی زنہار
اک پھول جو مرجھائے تو کھلتے ہیں ہزار
پت جھڑ سہی یہ زور خزاں کا کب تک
اک روز تو آئے گی گلستاں میں بہار

مذکورہ بالا آخری رباعی میں نہ صرف وہ صبر کی تلقین کرتے ہیں' بلکہ جینے کا انداز بھی سکھاتے ہیں۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غم کے بعد خوشی بھی آئے گی۔ اس لیے فکرمند اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کا انداز رجائی ہے' شاعر پرامید رہنے کی تلقین کرتا ہے' یعنی یہ کہ ''در ناامیدی بسے امید است''۔

اصغر ویلوری کی رباعیوں میں اللہ کی عظمت' اس کی وحدت' اس کی عطاو بخشش' نیز اس کے باوجود اس کی معرفت اور اس کے تا ابد قائم رہنے اور اس طرح کی دیگر حقیقتوں کا اعتراف و اظہار بکثرت ملتا ہے' اظہار بیان دل نشیں اور مؤثر ہے:

تو کون ہے تو کیا ہے تجھے کیا معلوم
تو کس لئے آیا ہے تجھے کیا معلوم
رہتا ہے کوئی تیری رگِ جاں کے قریب
کیوں تجھ سے یہ پردہ ہے تجھے کیا معلوم

☆

مالک مجھے شیطان کی قربت سے بچا
میں تجھ سے رہوں دور' یہ ذلت سے بچا
اتنی نہ دے آجائے تکبر مجھ میں
کردے مجھے گمراہ وہ دولت سے بچا

☆

کوئی بھی در سے ترے خالی نہ گیا
ہوکر کوئی مایوس سوالی نہ گیا
لایا ہوں میں آواز اذاں سے بھر کر
کانوں سے ابھی لحنِ بلالی نہ گیا

☆

کچھ پاس ترے آکے مکر جاتے ہیں
کچھ تیرا غضب جان کر ڈر جاتے ہیں
ایسے بھی ہیں کچھ چاہنے والے تیرے
سر پھوڑ کر در پہ ترے مر جاتے ہیں

دیکھو کوئی دروازے پہ دیتا ہے صدا
خیرات کی خاطر کوئی آیا ہو گدا
تم دو نہ دو دھتکار کے آواز نہ دو
ممکن ہے کسی بھیس میں آ جائے خدا

☆

مندر میں پجاری کا بھرم دیکھ لیا
کیا چیز ہے ملا کا حرم دیکھ لیا
اب دے نہیں سکتا کوئی دھوکا مجھ کو
جلوہ ہے کہاں تیرا صنم دیکھ لیا

☆

پنہاں ہے گل و خار میں قدرت تیری
وحدت تیری حکمت تیری عظمت تیری
دیدار سے قاصر ہیں یہ آنکھیں ورنہ
ہر شکل میں موجود ہے صورت تیری

☆

غم دیتا ہے غم دے کر خوشی دیتا ہے
دولت کبھی افلاس کبھی دیتا ہے
شاکی ہو کوئی کس لیے رب سے اصغر
لیتا ہے وہی اور وہی دیتا ہے

ان رباعیات میں صرف اللہ کے وجود کا اقرار اس کی عبادت کا ذکر اور اس کی اہمیت کا ہی
اظہار نہیں بلکہ فیضانِ رحمت کا بھی ذکر ہے نیکی کرنے اور عبادت گزاری کی تلقین بھی ہے بلکہ

شاعر کا بیان مولویانہ نہیں ہے اور نہ ان کی رباعیات پر زاہدِ خشک کی نصیحت کا سا انداز ہے۔ بلکہ ایسے واعظوں کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ:

اللہ دے واعظ کی نصیحت سے پناہ
اپنی طرح مجھ کو بھی نہ کردے گمراہ
دعویٰ بھی ہے جنت کا وہی ہے حق دار
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

(اس آخری رباعی میں اپنی رباعیات کا وزن بھی شاعر نے ظاہر کر دیا ہے یعنی مفعول' مفاعیل' مفاعلین' فع اسی وزن میں بیشتر شعرا رباعیاں کہتے ہیں)

شاعر رب کی عبادت کے سلسلہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بندہ جتنی بھی عبادت کرے اس کا حق ادا نہیں کر سکتا' اپنی جان کی قربانی دے کر بھی اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا' بقول شاعر:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہاں بندے سے جس قدر ممکن ہو وہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور اللہ کی عبادت میں اپنا وقت گزارے

جتنی بھی کرو رب کی عبادت کم ہے
رہ جاؤ نہ کہتے ہوئے فرصت کم ہے
ہر لمحہ یہی سوچ کر جیتے رہنا
دن بیت چکے جینے کی مہلت کم ہے

ان کی ایک رباعی دیکھیے جو اس قول کی تفسیر نظر آتی ہے کہ:

A man lives in deed not in years

یعنی اس شعر کے مصداق کہ:

ایقان تھا عمل پر ایام پر نہیں
حسنِ عمل سے زندۂ جاوید ہوگیا

مگر اس رباعی میں سچ کی حقیقت اور اس کی اہمیت کو بھی آشکار کیا گیا ہے:

جھوٹا ہے تو سچائی کی تلقین نہ کر
خود اپنے عمل کی کبھی تحسین نہ کر
کردار ہی انساں کا ہے اس کی پہچان
تو اپنی انا کی کبھی توہین نہ کر

آج کل مشاعروں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ شعر پڑھنے سے پہلے شاعر اپنے شعر کی تعریف کرتا ہے'اس کا پس منظر پیش کرتا ہے'یعنی شعر خوانی سے پہلے تمہید ضروری سمجھتا ہے'یہ بھی کہتا ہے کہ اس پر اس کو ہر مشاعرے میں داد ملی ہے'اور اسے بھی یہ شعر بہت پسند ہے۔ ایسا وہ شاید اس لیے کرتا ہے کہ سامعین پہلے ہی اس کے رعب میں آ جائیں اور اس کی تعریف کریں

اس رباعی میں ناشناسانِ ہنر کی طرف بھی اشارہ ہے اور طنز لطیف بھی:

ہر ایک سے تو داد کی امید نہ کر
خاموش جو سامع ہے تو تنقید نہ کر
کر لے گا گر اچھا ہے وضاحت اپنی
تو شعر سے پہلے کبھی تمہید نہ کر

اصغر ویلوری کی رباعیات میں قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت کا عنصر غالب ہے۔ یہ ہر حال میں پرامید رہنے اور حوصلہ بلند رکھنے کی تلقین کرتے ہیں:

قائم نہ رہا دہر میں کوئی زنہار
اک پھول جو مرجھائے تو کھلتے ہیں ہزار

پت جھڑ سہی یہ زورِ خزاں کا کب تک
اک روز تو آئے گی گلستاں میں بہار

☆

لاغر سہی ہمت ہے جواں تیری اگر
بھٹکے گا نہیں پاس تیرے خوف و خطر
سر سامنے دشمن کے جھکا دیتا ہے
کیا فائدہ رکھتا ہے تو لوہے کا جگر

☆

ہے عزم و یقیں دل میں تو تقدیر نہ دیکھ
کتنی ہے دعا میں تری تاثیر نہ دیکھ
منزل پہ پہنچنا ہی ہے مقصد تیرا
تو جھک کے کبھی پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

☆

کاہل کو بنالیتا ہے یہ وقت غلام
کہتے ہیں بڑے لوگ ہے آرام حرام
تم سوچ کے اس کام آغاز کرو
جس کام کا ہے سامنے اچھا انجام

میں نے بھی اس مضمون کوایک شعر میں اس طرح پیش کیا ہے:

ایک منصوبہ بنالے سوچ کر
پھر نہیں کچھ سوچنا بس کر گزر

ان کی ایک رباعی ہے جو" درفوائد خموشی" کی مثال رکھتی ہے زیادہ بولنا اور بغیر سوچے سمجھے بولنا حماقت کی دلیل ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ:

ہرتا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اس قول کے مطابق پہلے تولو پھر بولو اس کی ترجمانی ان کی اس رباعی میں ملتی ہے:

ہر لفظ کے معنی کو تم اول تولو
بولو جو تو پھر سوچ سمجھ کر بولو
انسان کی توقیر ہے خاموشی میں
کچھ کہنی نہیں بات تو منہ مت کھولو

سچ بولنے والے کو عام طور پر لوگ پسند نہیں کرتے۔ سچی بات تلخ ہوتی ہے' اس لیے بہت سے لوگ اسے برداشت نہیں کرتے۔لوگ سچ بولنے کی پاداش میں سزائیں بھگت چکے ہیں۔ دیکھئے اس حقیقت کو ایک رباعی میں انہوں نے کس سادگی مگر پر اثر انداز میں پیش کیا ہے اس میں طنز کا بھی عمدہ انداز پوشیدہ ہے:

سچائی جو آتی ہے آنکھوں کو نظر
شاید یہ بزرگوں کی دعا کا ہے اثر
ہم آج بھی احباب میں مقبول نہیں
ہم نے کبھی سیکھا نہیں جھوٹوں سے ہنر

ان کی ایک رباعی میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگرچہ ہم آزاد ہو گئے ہیں' مگر غلامی کا طوق اب تک ذہنی طور پر ہم اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہیں۔ہم نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرلی ہے' مگر آج بھی ہم پر غلامی کے کچھ اثرات نظر آتے ہیں' اس رباعی میں پست خیالات اور غلامانہ ذہن رکھنے والوں پر بھرپور طنز کیا ہے:

رفعت میں بھی کیوں پست خیالی نہ گئی
عادت تری صدیوں کی پرانی نہ گئی

دست بستہ ہر اک فرد کو کرتا ہے سلام
انگریز گئے خوئے غلامی نہ گئی

شعر گوئی کے سلسلے میں اصغر ویلوری بھی اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ غزل گوئی کے حوالے سے انہوں نے اپنی شعر گوئی کے مقصد کی وضاحت کی ہے اور شعر گوئی کو تقاضائے فطرت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ نیز شعر گوئی کا ایک مقصد اردو سے محبت بھی بتائی ہے' پھر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندا

اس سلسلے میں ان کی یہ رباعی دیکھیے:

انداز طبیعت ہے غزل کہتے ہیں
اردو سے محبت ہے غزل کہتے ہیں
ہم کو کوئی دعویٰ نہیں اپنے فن پر
بس رب کی عنایت ہے غزل کہتے ہیں

اصغر ویلوری اپنی طبیعت کے زور پر اور خداداد صلاحیت کے نتیجے میں رباعی کے میدان میں اپنے کمال کا جوہر دکھانے میں کامیاب ہیں اور یہ کہ اس دور کے ممتاز رباعی نگاروں کی صف میں ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں۔

☆.....☆

ابراہیم اشکؔ کے گیت میں مختلف النوع موضوعات

گیت کا تعلق عوامی ادب سے ہے اور یہ صنف دوہے کی طرح خالص برصغیر پاک و ہند کی پیداوار ہے۔ اس صنف سخن کی خدمت کرنے اور سے آگے بڑھانے میں ہندو اور مسلمان شعراء برابر کے شریک رہے ہیں۔ مگر جاوید وشسٹ بنکل اتساہی کے گیت پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں" اردو والوں نے عوامی ادب کو در خور اعتنا نہیں سمجھا جس کی وجہ سے ادبیات اردو کا یہ پہلو تشنہ رہ گیا"۔ (بنکل اتساہی 'منفرد گیت نگار۔ مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی) اس سلسلے میں انہوں نے سہیل عظیم آبادی کے ایک مراسلے کا حوالہ بھی دیا ہے جو ان کے نام لکھا گیا تھا" اردو والوں کو احساس نہیں وہ لوگ ساہتیہ سے بہت دور ہیں اور یہ بات کسی ادب کے لئے اچھی نہیں۔ ہندی میں لوک ساہتیہ کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔" یہ باتیں سہیل عظیم آبادی نے ۱۹۷۸ء میں لکھی تھی مگر اب صورت حال کافی تبدیل ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے بھی اردو کے شعرا نے لوک ادب پر توجہ دی تھی۔ امیر خسرو سے لے کر اب تک نہ جانے کتنے مسلمان شعرا نے لوک ادب بالخصوص گیت نگاری پر توجہ دی ہے۔ لوک ادب کے حوالے سے (گیت کے حوالے سے نہیں) ایک بڑا نام نظیر اکبر آبادی کا ہے' گو انہیں اس وقت وہ پذیرائی نہیں ملی جو آج انہیں حاصل ہے بلکہ اس دور میں تو ان کو میلوں ٹھیلوں کا معمولی شاعر سمجھا جاتا رہا۔ اردو والے تو گزشتہ کئی دہائیوں سے گیت پر خاص توجہ دے رہے ہیں اور مسلسل گیت کی روایت کو آگے بڑھاتے رہے ہیں اس کی ایک روشن مثال فلم کے لئے لکھے جانے والے گیت بھی ہیں۔

اردو کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ صورت حال نہیں تھی۔ سنسکرت اور ہندی کے شعراء کے ساتھ ساتھ اردو کے شعراء نے بھی اس میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں اور امیر خسرو سے لے

کر سید میراں ہاشمی تک مسلم گیت نگاروں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ ان کے بعد گیت نگاری کا دوسرا دور آتا ہے جس میں امانت لکھنوی' آغا حشر کاشمیری' اختر شیرانی' حسرت موہانی' مقبول احمد پوری' حفیظ جالندھری' مخدوم محی الدین' سلام مچھلی شہری' کیفی اعظمی' جاں نثار اختر' ساحر لدھیانوی' قتیل شفائی' مجروح سلطان پوری' خلیل الرحمن اعظمی' انجم اعظمی' عمیق حنفی اور باقی وغیرہ نے عمدہ گیت لکھ کر گیت کی تاریخ میں اپنا نام رقم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنی گراں قدر کتاب ''گیت اردو کے'' میں گیت نگاری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور گیت کے ادوار بھی متعین کئے ہیں اور مختلف ادوار کے گیت نگاروں کے گیت بالترتیب پیش کیے ہیں اس کتاب کی ابتدا میں 'حرف سخن' کے زیر عنوان وہ لکھتے ہیں۔

> ''ہندی صنف سخن گیت کی روایت بہت پرانی ہے لیکن گیت کی روایت سنسکرت سے نسبت رکھتے ہوئے بھی ایک جداگانہ انداز کی ہے۔ ابتدا میں گیت دو الگ الگ لیکن باربط روایت سے منسلک رہا۔ ان میں سے ایک روایت کو ہندوستانی اور دوسری کو بھارتیہ کہہ سکتے ہیں ان دونوں روایتوں نے گیت کے گیسو سنوارے۔''

آگے چل کر مناظر عاشق کہتے ہیں کہ ''ہندوستانی روایت کی بنیاد امیر خسرو نے رکھی' ان کی زبان سنسکرت نہیں''

ابراہیم اشک بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں' امیر خسرو سے لے کر اب تک بہت سے مسلمان شعرا یا ان شعرا نے جن کی زبان سنسکرت نہیں تھی' اس عوامی ادب یا لوک گیت کے خزانے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

گیت کا شمار ہم لوک گیتوں میں کرتے ہیں کیوں کہ یہ گایا جاتا ہے اور اس کی بازگشت ہمیں کھیتوں' کھلیانوں' باغوں' دیہات کے کچے مکانوں سے لے کر اب پکے مکانوں اور شاندار حویلیوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ آج امیر خسرو کا گیت ''اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا'' برصغیر پاک و ہند کے کوچے کوچے میں گونج رہا ہے۔ گیتوں کے کیسیٹ اور ویڈیو کیسیٹ تیار کئے جا رہے ہیں اور فروخت ہو رہے ہیں۔

گیت کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک فلمی گیت اور دوسرے عام مروجہ گیت۔ مگر بعض جگہ دونوں کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ لوک گیتوں کو بھی بعض فلم سازوں نے نہایت خوبی کے ساتھ فلموں میں شامل کیا ہے اور فلمی گیت گاتے اور گنگناتے ہوئے لوگ شہروں اور گاؤں میں دکھائی دیتے ہیں، گیت کے موضوعات میں بھی اب غزل کی طرح وسعت پیدا ہوگئی ہے یعنی اس صنف میں بھی ہر طرح کے مضامین اور موضوعات کو پیش کیا جارہا ہے جس کی ایک مثال ابراہیم اشک کے گیت بھی ہیں۔ یوں تو اس میدان میں بڑا اور قابل ذکر کام ہیکل انساہی نے کیا ہے جو اس دور میں گیت نگاری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ مگر اردو کے دیگر شعراء نے بھی گیت نگاری کے فن کو آگے بڑھایا ہے جس طرح دوہے میں آج کل دوہا رنگ مختلف موضوعات کو پیش کر رہے ہیں یعنی اس صنف میں حمد، نعت بھی لکھی جارہی ہیں اور سیاسی، سماجی، ثقافتی اور دیگر موضوعات اور مسائل کو کامیابی کے ساتھ لکھا جارہا ہے۔ اس طرح آج کل گیت میں بھی ان موضوعات کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

ابراہیم اشک نے بھی اپنے گیتوں میں مختلف النوع موضوعات کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انہوں نے گیت کی شکل میں حمد بھی لکھی ہے جس کا نام 'حمد گیت' رکھا ہے۔ اس حمد گیت کا ایک بند دیکھئے:۔

دھرتی کو کاغذ میں بناؤں، سات سمندر سیاہی
سارے جنگل قلم بناؤں، دوں میں تیری گواہی
تیرا روپ لکھا نہیں جائے، سجنا روپ لکھا نہیں جائے

اس گیت کے آخری بند میں بھی ابراہیم اشک نے نہایت خوبی اور ہنر مندی سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر کیا ہے۔ کیا اسے ہم سورۃ الحمد کے اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر نہیں کہہ سکتے۔

بس وہ راہ بچھانا مجھ کو تیری اور جو لائے
ایسی راہ نہ دکھلانا تو دور جو تجھ سے جائے

تیرے روپ کی دھوپ جہاں ہو میں اس پتھ کا راہی

دوں میں تیری گواہی

تیرا روپ لکھا نہ جائے

انہوں نے اس گیت میں اللہ تعالٰی کی حمد نہایت دلکش اور خوبصورت پیرائے میں سادگی کے ساتھ پیش کر دی ہے۔

ابراہیم اشک اخوت اور بھائی چارگی کے پرچارک ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر جھگڑے بند ہوں۔ انسان شیطان کے بہکاوے میں آ کر دنگا فساد نہ کرے۔ وہ محبت کی حکمرانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

انسانوں کے بیچ میں بھیا

پیار ہوا جب کم

دیس میں پھوٹے بم

مندر مسجد کے جھگڑے میں

ہندو مسلم کے اکھڑے میں

ایسی وحشت ملک میں پھیلی

ہو گئیں آنکھیں نم

دیش میں پھوٹے بم

(دیش میں پھوٹے بم)

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ جب آپس میں محبت کم ہو جائے اور دلوں میں نفرتیں اور کدورتیں اپنی جگہ بنالیں تو بس یہی ہوتا ہے یعنی دیش میں تخریب کاری شروع ہو جاتی ہے اور بم دھماکے ہونے لگتے ہیں۔

محبت اور خلوص کی کمی نے آج انسان کو تنہا کر دیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ تنہائیاں بہت سے

انسانوں کا مقدر بن گئی ہیں۔ آج کا انسان خود کو تنہا اور اکیلا سمجھنے لگا ہے۔ ایسا اس لئے ہوا ہے کہ انسانوں نے انسانی اقدار کو چھوڑ دیا ہے۔

سنسان سڑک / اور میں تنہا / آہٹ نہ کوئی پتا کھڑکے
آندھی نہ کوئی بجلی کڑکے / اپنی ہی جھلک / اور میں تنہا

(گیت تنہائی کے نام پر)

اپنے گیت ' کچھ تو بولو یار ' میں خاموش رہنے اور ظلم سہنے کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ظلم سہنے اور اس کے خلاف آواز نہ اٹھانے کو وہ ایک طرح سے بزدلی سمجھتے ہیں مگر اس بات کا اظہار وہ نہایت نرم اور شائستہ لہجے میں کرتے ہیں۔

یوں خاموش رہو گے کب تک ؟ بولو کچھ تو بولو یار
سب کچھ سہنا / ظلم نہ سہنا / بات جو من میں آئے کہنا
سب کی بات سنو گے کب تک / اپنی زباں بھی کھولو یار / کچھ تو بولو یار

اور اپنے گیت '' تلسی آنگن کی کمھلائے '' میں تلسی کو شاعر امید اور آس کا پودا قرار دیتا ہے مگر بادل بغیر برسے گزر جاتا ہے۔ پیار کا سندیسہ نہ آنے سے آنگن میں تلسی کا پودا کمھلا رہا ہے یہاں تلسی کو ایک خاص پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً اشک کا یہ گیت تو بہتوں نے سنا ہوگا '' میں تلسی تورے آنگن کی '' گیت کا آخری بند دیکھئے :۔

اڑ جائے نینوں کا کجرا / رچے نہ مہندی رنگ
رنگ تو آئے تب جیون میں / پریتم ہو جو سنگ
پیاسا جیون بر ہا گائے / تلسی آنگن کی کمھلائے

جب دل کے وینا کا تار ٹوٹ جائے تو پھر کوئی کیسے گیت سنا سکتا ہے۔ جب دل بجھ جائے ' گاؤں کا پیار اجڑ جائے تو پھر لبوں سے نغمے نہیں پھوٹتے۔ اس کا خوبصورت اظہار انکے گیت '' میں کیسے گیت گاؤں '' میں ہوا ہے۔

میں کیسے گیت سناؤں

شہروں میں جنگل کی وحشت حال ہوا بے حال

ایسا پیارا تھا گاؤں سے اجڑ گئی چوپال

اب کیسے اسے سناؤں/ میں کیسے گیت سناؤں

''ہر زخم سیئے جا'' میں گیت نگار دکھ میں ہنس کے جینے کو عظمت کا نشان قرار دیتا ہے۔ وہ نامساعد حالت میں جینے اور بیداری کا پیغام دینے کو کہتا ہے۔ اشک نے اپنے گیت 'ایسا کروں سنگھار' میں پریتم کی آمد پر اور محبوب کے سواگت میں سنگھار اور اپنی شوبھا بڑھانے کی خواہش کا اظہار جس خوبی سے کیا ہے اس سے اس گیت کی شوبھا بھی بڑھ گئی ہے۔ گیت ''خوب جمے رنگ'' میں پیپل کی چھیاں میں ساجن کے ساتھ بیٹھنے کی خواہش اس کے ساتھ ہی ساتھ 'امواکی ڈالی' پھر کوئل کے بول' سرسوں کے کھیت کی بھینی سگندھ' کا سہارا لے کر ناری جس طرح اپنی محبت اور چاہت کا اظہار کرنا چاہتی ہے اسے بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ شاعر نے اس گیت میں پیش کیا ہے۔ مگر 'دھواں دھار ماحول' میں شاعر اس دکھ کا اظہار کرتا ہے کہ کس طرح ایک خوشگوار ماحول المناک صورت حال سے دوچار ہے' عصمتیں لٹ رہی ہیں' آنگن میں لاش پڑی ہے' ملک میں خونریزیاں ہو رہی ہیں اور آج سارا ملک گھائل ہو گیا ہے۔ ان تلخ حقائق کا اظہار شاعر نے موثر انداز میں کیا ہے۔

شاعر کو گاؤں کا پرسکون ماحول چھوٹ جانے کا بھی غم ہے۔ وہ گاؤں سے زمینی وابستگی اور وہاں کے بیتے دنوں کو شدت سے یاد کرتا ہے۔ گاؤں سے وابستہ یادوں کو اس نے اپنے گیت ''چھوٹ گیا میرا گاؤں'' میں پیش کیا ہے اس کا ایک بند پیش کرتا ہوں۔

یہ برگد' پیپل' ہمجولی' وہ آموں کی چھاؤں

چھوٹ گیا میرا گاؤں

گاؤں کی یاد اختر شیرانی کو بھی آئی تھی اور اس طرح انہوں نے ایک خوبصورت نظم کی تخلیق

کی تھی'' او دیس سے آنے والے بتا''

اشک نے اپنے گیت '' کیسا جلم بھیا'' میں بارش کے نہ ہونے سے جو مسائل پیدا ہوتے رہے ہیں یا ہوتے ہیں انکا موثر اظہار اپنے اس گیت میں کیا ہے:۔

تین سال سے نہیں ہے بارش/ کنویں کا پانی بیٹھ گیا

بھیا کیسا جلم بھیا؟

کھیت پڑے ہی سوکھے اپنے/ کیا بوئیں کیا کھائیں

کیا میگھوں کا ہم نے بگاڑا/ جو ہم کو ترسائیں

ساون آ کر گیا تو/ خوشیاں ساری سمیٹ گیا

بھیا کیسا جلم بھیا؟

مختصر طور پر یہ کہوں گا کہ ابراہیم اشکؔ نے اپنے گیتوں میں زمین سے اپنی محبت اور اس سے اپنی وابستگی کا اظہار نہایت خوبصورتی اور فنکارانہ طریقے سے کیا ہے۔ نیز اپنے عصری اور مقامی مسائل کو بھی مہارت اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ان کے گیتوں میں حسن' عشق' برہ' بیوگ اور سنجوگ کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے حب الوطنی' فرقہ پرستی' خودغرضی' لوٹ کھسوٹ' مہنگائی' غربت اور منافرت کا پردہ چاک کیا ہے۔ ان کے علاوہ ہاریوں کی بے بسی اور ان کی بے کسی کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی ہے۔ اس لیے ان کے بہت سے گیت اپنے عصر کی آواز بن گئے ہیں۔ گیت نگاری پر ان کو دسترس حاصل ہے۔ اشک گیت لکھنے کا فن جانتے ہیں نیز انہوں نے گیت کے موضوعات میں اضافے اور تجربے کیے ہیں جو قابل تحسین ہیں۔ امید ہے کہ ان کے گیتوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

مختصر کوائف:۔

نام: افتخار اجمل

تخلص: شاہین

والد کا نام: مولوی عبدالحنان

جائے پیدائش: شیخ پورہ

تاریخ پیدائش: ۱۰ فروری ۱۹۴۱ء

تعلیم:۔ بی۔اے آنرز (فارسی)' ایم۔اے (فارسی)' ایم۔اے (اردو)

سی۔ٹی' بی۔ایڈ' ڈی۔ایچ۔ایم۔ایس

ملازمت:۔ محکمہ تعلیم

سبکدوش:۔ صدر شعبہ اردو۔ڈی۔جے گورنمنٹ سائنس کالج کراچی

حال: صدر شعبہ اردو۔سینٹ پیٹرک کالج۔کراچی

☆

مطبوعہ کتب:۔

۱۔عقیدت کا سفر (حمد' نعت' منقبت) ۲۰۰۴ء

۲۔شاعری کا سفر (غزلیں) ۲۰۰۵ء

۳۔رنگ و بو کا سفر (نظمیں) ۲۰۰۶ء

۴۔آ گہی کا سفر (تنقیدی مضامین و جائزے)

زیر ترتیب کتب:۔

۱۔اردو افسانہ اور چند افسانہ نگار

۲۔تذکرۂ دبستان خاور دو (۲) جلدوں میں مشرقی پاکستان کے شعراء و ادباء کا تعارف)

۳۔یادداشتیں (پردۂ ذہن پر ابھرتے ہیں)

پروفیسر افتخار اجمل شاہینؔ